محبت، راز اور آزادی کی ایک دلکش داستان

وہ آزاد دکھائی دیتی ہے،
مگر قید ہے ان دیکھے پنجروں میں۔
کیا محبت اسیرانِ قفس
کو آزاد کر پائے گی؟

اسیرانِ قفس

ASEERAN E QAFAS



از قلم:
ماہ نور شاہد

ناول: اسیرانِ قفس

از قلم: ماہ نور شاہد

انتساب

(اپنے والد اور والدہ کے نام، جن کی دعاؤں نے ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا)

پیش لفظ

ہر قفس لوہے کی سلاخوں سے نہیں بنتا۔

کچھ قفس خواہشوں کے ہوتے ہیں، کچھ ذمہ داریوں کے، کچھ یادوں کے، اور کچھ ان زخموں کے جو وقت کے گزرنے کے باوجود روح کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

یہ ان لوگوں کی کہانی ہے جو آزاد دکھائی دیتے ہیں، مگر اپنی اپنی زندگیوں کے ان دیکھے قفسوں میں قید ہوتے ہیں۔

کیونکہ بعض اوقات انسان کے پاؤں نہیں، بلکہ اس کا دل قید ہوتا ہے۔

اس ناول کے تمام کردار خیالی ہیں۔ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے اسے صرف ایک فکشن کے طور پر پڑھا جائے۔اگر اس کہانی کا کوئی پہلو آپ کے دل کو چھو جائے، تو یہی میری محنت کا حاصل ہو گا۔

امید ہے آپ اس ناول کو پسند کریں گے۔

خدا حافظ



{حصہ اول مکمل}

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع، جو نہایت مہربان، بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

(باب:1)

ہم سب اپنے اپنے قفسوں کے اسیر تھے...
کسی کو محبت نے قید کر رکھا تھا،
کسی کو نفرت نے،
کسی کو ماضی نے،
اور کسی کو اپنے ہی خوابوں نے۔

"تمہارا کیا خیال ہے آج کا ٹیسٹ آسان ہو گا یا مشکل؟"مسفیرا نے فلیمنگ ہارٹ چٹوز کا آخری پیکٹ کھولتے ہوئے اس سے پوچھا۔
"تمہیں کیا لگتا ہے؟"اور عنادل نے اپنے ہاتھ میں موجود نوٹس کے صفوں کو پلٹتے ہوئے کہا۔
"مجھے تو یہی لگتا ہے کہ ہمیشہ کی طرح اج کا ٹیسٹ بھی بہت مشکل ہو گا۔"مسفیرا نے چیٹوز کا ایک پیس منہ میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔
"تو پھر جب تم جانتی ہو کہ اج کا ٹیسٹ بھی مشکل ہو گا تو تمہیں چاہیے کہ تم ان چیزوں پر فوکس کرنے کی بجائے اپنے ٹیسٹ کی تیاری پر فوکس کرو۔"عنادل نے اس کے ہاتھ میں موجود چیٹوز کے پانچویں پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"تمہیں پتہ تو ہے کہ مجھے میتھ جیسے بورنگ سبجیکٹ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ویسے بھی میں جتنی بھی کوشش کر لوں میں اس سبجیکٹ میں کبھی اچھے مارکس گین نہیں کر سکتی۔"مسفیرا نے چیٹوز کا ایک اور پیس منہ میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔
"تمہارے اچھے مارکس اس لیے نہیں اتے کیونکہ تم اچھے مارکس لینے کی کوشش ہی نہیں کرتی!"عنادل نے اپنے پینسل باکس کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اس وقت لائبریری سے کچھ دور کوریڈور میں ماربل کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ بریک ہونے کی وجہ سے باہر گراؤنڈ میں بہت شور تھا۔ لیکن کوریڈور کے اس حصے میں جہاں لائبریری موجود تھی وہاں پر شور کی آواز باہر گراؤنڈ کی نسبت بہت کم محسوس ہو رہی تھی۔

"اور تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں اچھے مارکس لینے کی کوشش نہیں کرتی ہوں؟" مسفیرا کا پورا دھیان اس وقت عنادل پر تھا، جواب اپنے پینسل باکس میں سے ایک بال پوائنٹ نکال رہی تھی۔

"مجھے ایسا اس لیے لگتا ہے کیوں کہ میتھ کے علاوہ تم ہر سبجیکٹ پر فوکس کرتی ہو اور سوائے میتھ کے تم ہر سبجیکٹ میں اچھے مارکس لیتی ہو"۔ عنادل نے ایک بار پھر اپنے نوٹس پر جھکتے ہوئے جواب دیا۔

"ہمم۔۔۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن عنادل تمہیں پتہ تو ہے میتھ کرنے کے لیے بہت دماغ یوز کرنا پڑتا ہے اور اس وجہ سے ہماری باڈی کی بہت انرجی بھی ویسٹ ہوتی ہے اور اگر میں اپنی ساری انرجی ان سائن، کوز، ٹین کے نہایت ہی فضول قسم کے سوالوں پر ویسٹ کر دوں گی تو میں اپنے باقی کام کیسے کر سکوں گی؟ مسفیرا نے اپنے ہاتھ میں موجود چیٹوز کے پیکٹ سے عنادل کے نوٹس پر موجود سائن، کوز، ٹین کے فارمولاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"

مسفیرا کی بات پر عنادل نے اپنا جھکا سر اوپر اٹھایا اور اپنی گردن کو نفی میں ہلایا۔

(جیسے وہ بتانا چاہتی تھی کہ تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔)

" صحیح کہہ رہی ہوں، ہیں نا؟" مسفیرا نے چیٹوز کا آخری پیس نگلتے ہوئے پوچھا۔

" ھممم"۔۔۔ ایک بار پھر عنادل نے اپنی گردن نوٹس پر جھکا لی اب وہ بال پوائنٹ سے کسی امپورٹنٹ فارمولا کو ہائی لائٹ کر رہی تھی۔

پہلے کی نسبت باہر گراؤنڈ سے آنے والی آوازیں اب کافی حد تک مدھم ہو گئی تھیں۔

"یہ زیادہ امپورٹنٹ ہیں؟" مسفیرا نے عنادل سے نوٹس لیتے ہوئے ان کوسچن کے متعلق پوچھا جسے عنادل اپنے رجسٹر پر زبانی سالو کر رہی تھی۔

"زیادہ یا کم؟ یہ تو میں نہیں جانتی لیکن مجھے یہ دیکھنے میں امپورٹنٹ لگ رہے تھے۔ اس لیے میں ان کی اب لکھ کر پریکٹس کر رہی ہوں۔ ایک کام کرو تم بھی ان سوالات کو اچھے سے دیکھ لو کیا پتہ انہی کوسچن میں سے ایک آج ٹیسٹ میں موجود ہو"!

"اوکے۔"

"یہ فضول قسم کے سوالات اور ان کے فارمولاز میری سمجھ سے باہر ہیں۔" مسفیرا نے تنگ آ جانے والے انداز میں کہا اور نوٹس کو بند کر کے ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔

عنادل ابھی بھی اپنے کوسچن کو سالو کرنے میں مصروف تھی۔

"ایک بات پوچھوں؟" مسفیرا نے اپنا رخ عنادل کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

کوری ڈور میں آنے والی مدہم آوازیں اب مکمل طور پر خاموشی اختیار کر گئی تھیں۔ یقیناً بریک کا ٹائم آف ہو گیا تھا اس لیے تقریباً سب سٹوڈنٹس اپنی اپنی کلاسز میں جا چکے تھے۔

"کیا تم انگیجڈ ہو؟" مسفیرا نے دایاں ہاتھ اپنی ٹھوری کے نیچے جماتے ہوئے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"بے اختیار بال پوائنٹ پر عنادل کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، یقیناً کیا جانے والا سوال عنادل کی توقع کے بالکل برعکس تھا"۔

کوریڈور میں اب گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

"جواب دو؟"۔۔۔ مسفیرا نے اتنی ہی دلچسپی سے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔

"نہیں!" عنادل نے بے تاثر چہرے کے ساتھ یک لفظی جواب دیا۔

لیکن۔۔۔۔ "ہمیں بھی اب اپنی کلاس میں جانا چاہیے بریک آف ہو گئی ہے۔" اس سے پہلے مسفیرا کچھ اور کہتی عنادل اپنی چیزوں کو اکٹھا کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"اچھا چلتے ہیں۔" مسفیرا بے دلی سے اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اگر میرا بس چلے تو میں کبھی کالج نہ آؤں اور نہ ہی سر فیصل کا کوئی لیکچر لوں"۔ اپنی کلاس کی طرف جاتے ہوئے مسفیرا نے اپنا روزانہ کاروائی سے دہرائے جانے والا جملہ ایک بار پھر عنادل کو باور کروانا ضروری سمجھا۔



ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کے چہرے پر سنجیدگی کے گہرے اثرات موجود تھے وہ اپنی کین کا سہارا لیے کوریڈور میں چلتے ہوئے آس پاس کے ماحول پر غور و فکر کر رہے تھے کوریڈور سے پرے کچھ لڑکے اور لڑکیاں گول دائرہ بنا کر سوکھی گھاس پر بیٹھے گروپ سٹڈی کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"شاید انہوں نے آج کلاس بنک تھی؟ یا پھر وہ کسی گروپ پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے؟ یا پھر شاید آج ان کا لیکچر فری تھا۔" دور کھڑے اس 47 سالہ شخص نے انہیں جانچتے ہوئے مشاہدہ کیا۔

ان کی نظر اب سامنے سے آنے والے ان دو لڑکوں پر مرکوز تھی جن کے ہاتھ میں کوئی کتاب موجود تھی جو شاید ان کے سلیبس سے ریلیٹڈ کسی سبجیکٹ کی تھی۔ان دونوں کی نظریں اپنی کتابوں پر مرکوز تھیں۔ غور کرنے پر پتہ چلتا تھا کہ وہ بڑی آہستگی سے کچھ لفظ دہرا رہے تھے۔

"السلام علیکم !۔"ان دونوں میں سے ایک نے سامنے سے آتے اس شخص کو دیکھ کر سلام کیا۔

وہ شخص دیکھنے میں اسے اپنے والد کے عمر کے لگ رہے تھے لیکن یونیورسٹی کے رولز کے مطابق سٹوڈنٹس کے کسی بھی عزیز، قریبی یار یلیٹوز اور یہاں تک کہ ان کے پیرنٹس کو یونیورسٹی کے اندر آنے کی اجازت تک نہ تھی۔

"السلام علیکم سر!"اب وہ دوسرا لڑکا اپنے دوست کی پیروی کرتے ہوئے سامنے موجود اس شخص کو سلام کر رہا تھا۔

"وعلیکم السلام"۔ چہرے پر اتنی ہی سنجیدگی لیے اب وہ شخص ان دونوں لڑکوں کے سلام کا جواب دے رہا تھا۔

"یقیناوہ کوئی نیو ٹیچر تھے کیونکہ اس سے پہلے اس نے انہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا تھا" پہلے لڑکے نے اندازہ لگایا۔

"کیا یار اب یونیورسٹی معزوروں کو ہمارے سروں پہ مسلط کرے گی؟"ان میں سے ایک لڑکے نے خود سے دور جاتے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن کوریڈور میں خاموشی ہونے کے باعث یہ بات اس شخص کو باآسانی سنائی دی جواب ان سے کچھ فاصلے پر تھا۔

وہ ان کی باتوں کو ان سنا کرتا اب اگے بڑھ رہا تھا، جیسے اسے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔اب وہ سیکنڈ فلور پر جانے کی غرض سے زینے چڑھنے لگا۔

"ڈسگسٹنگ"۔۔۔انہیں اپنے عقب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی اور ایک بار پھر انہیں یہ سمجھنے میں بالکل وقت نہ لگا کہ یہ لفظ کس کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور کس وجہ سے کیا گیا ہے!



"یہ اکتوبر کا اختتام اور نومبر کا اغاز تھا۔ موسم کافی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ اب دن اور راتیں ٹھنڈک کا احساس دینے لگی تھیں ۔اب بس بارشوں کا انتظار تھا اور موسم سرما کا آغاز "!

وہ اس وقت اپنے بڑے اور خوبصورت لان میں ایک جانب راکنگ چیئر پر بیٹھی بڑی آہستگی سے خود کو جھول رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی گردن کو راکنگ چیئر کی دائیں جانب ڈھلکایا ہوا تھا۔ ان کی نظریں اس وقت لان کے دائیں جانب والے حصے میں بیٹھی چھوٹی عنایہ پے مرکوز تھیں، جو بڑے اشتیاق کے ساتھ اپنے چھوٹے ننھے ہاتھوں سے ایک نئی قسم کا پھول اپنے چھوٹے سے باغیچے میں لگا رہی تھی۔ ویسے تو پورے لان میں ہر طرف سبزہ تھا، جگہ جگہ مختلف قسم کے پودوں کے گملے وغیرہ موجود تھے۔ لیکن عنایہ نے خاص طور پر لعن کے ایک چھوٹے حصے کو اپنا باغیچہ بنایا ہوا تھا، جہاں پر وہ اپنی پسند کے مختلف قسم کے پھولوں کو اگایا کرتی تھی۔ اسے لان کا وہ چھوٹا حصہ جسے وہ "اپنا باغیچہ" کہا کرتی تھی بہت عزیز تھا۔

آج بھی دھوپ موجود تھی لیکن دھوپ میں کسی بھی قسم کی تپش نہیں تھی، بس ہلکی سی گرماہٹ تھی جو ایسے ٹھنڈے موسم میں سکون بخش تھی۔

"آج بھی وہ بڑی خوشی کے ساتھ اپنے باغیچے میں ایک اور نئی قسم کا خوبصورت پھول پلانٹ کر رہی تھی۔ اسے اپنے باغیچے کے چند پھول بے حد عزیز تھے اور اب یہ نیا پھول بھی ان پھولوں میں سے ایک ہونے والا تھا اور ایسا کیوں تھا؟ اسے فوزیہ بیگم سے بہتر کون جان سکتا تھا"!



کلاس روم میں ایک عجیب سا ہنگامہ برپا تھا۔ یہاں پر ہر کوئی کسی نہ کسی سرگرمی میں ملوث تھا۔ زیادہ تر سٹوڈنٹس اپنے موبائل فونز استعمال کر رہے تھے اور کچھ اپنے دوستوں سے باتوں میں مصروف تھے، جبکہ کچھ اپنے نوٹس لینے میں مگن تھے اور باقی کی کلاس، کلاس میں موجود ڈائز کے گرد جھرمٹ بنائے کھڑی تھی۔

"ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک پینسل تھی جس سے وہ سامنے رکھی سکیچ بک پر کچھ ڈرا کر رہا تھا، شاید کوئی تصویر یا کوئی ڈیزائن۔"اس کی آنکھیں اپنے کام پر جمی ہوئی تھیں،اور اس کا چہرہ یکسوئی کا آئینہ دار تھا۔

"ہیلو ہینڈسم!"۔۔اس لڑکے کی سماعت سے کوئی نسوانی آواز ٹکرائی، جسے وہ نظر انداز کر گیا تھا۔اس وقت اس کی توجہ صرف اپنے کام پر تھی۔

وہ اسے خود کی طرف متوجہ نہ ہوتا دیکھ آگے بڑھ گئی تھی۔

"میرا نام فضل قمر ہے اور آج سے میں آپ کی کلاس کو سیویکس پڑھاؤں گا۔"سر فضل نہایت ہی سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے اور بڑے قابل استاد تھے، کل ہی ان کا ٹرانسفر لاہور یونیورسٹی میں ہو گیا تھا۔آج ان کا اس یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔بچپن میں پیش آنے والی کسی خاص بیماری کی وجہ سے وہ اپنی ایک ٹانگ کی زیادہ تر صلاحیت کھو چکے تھے، لہذا یہی وجہ تھی کہ وہ کین کا سہارا لے کر چلتے تھے۔اور ان کے ایسے چلنے پر لوگ اکثر ان کا مذاخ بناتے لیکن وہ ایسے لوگوں کی فضول باتوں پر دھیان دینے کی بجائے اپنے کام پر فوکس کرتے تھے۔

"میرا ماننا یہ ہے کہ اس وقت جو میرے پاس علم ہے وہ یہاں بیٹھے 35 سٹوڈنٹس کے مقابلے بہت کم ہے۔ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک بات جو میں جانتا ہوں وہ آپ لوگ نہ جانتے ہوں اور اسی طرح یہاں بیٹھا ہر سٹوڈنٹ کچھ نہ کچھ جانتا ہو گا جو میرے علم سے پرے ہو گا، لہذا ہم اپنے نالج کو ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کریں گے اس طرح ہم سب کو ایک دوسرے سے بہت کچھ جاننے کا موقع ملے گا۔"

"باقی میں پوری کوشش کروں گا کہ ایک اچھا ٹیچر ہونے کے ناطے آپ کی ایکسپیکٹیشنز پر پورا اتر سکوں اور امید کرتا ہوں کہ اپ سب بھی مجھے مایوس نہیں کریں گے"!

"یس سر"چند لوگوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔



سات سالہ عنایہ ڈریسنگ کے سامنے سٹول پر کھڑی ہو کر خود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ ہر بار چادر کو صحیح سے اوڑھنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ آخر کار اس نے غصے سے چادر کو زمین پہ دے مارا۔ خود وہ سٹول سے نیچے اتر آئی تھی۔

اب وہ غصے سے پاس کھڑی اس چادر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب پانی تیرنے لگا تھا۔ ناک، گال اور تھوڑی شدت ضبط سے سرخ پڑ گئے تھے۔

"کیا ہوا میری چھوٹی سی گڑیا کو؟" اس سے پہلے کہ وہ رونا شروع کر دیتی فوزیہ بیگم جو کسی کام سے یہاں سے گزر رہی تھیں ان کی نظر سامنے کھڑی عنایہ پر پڑ گئی. جو بس رو دینے کو ہی تھی۔

"ماما مجھے ایک نئ چادر لے دیں پلیز۔" وہ موٹے موٹے آنسو بہاتی فوزیہ بیگم کے گلے لگ گئ۔

"میں لے دوں گی آپ کو پہلے رونا بند کرو"۔ وہ اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولیں۔

"آج ہی لے کر دیں۔" وہ ضد کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے لے دوں گی لیکن پہلے اپنے آنسو صاف کرو۔ "

"میری چادر کو زمین پر کس نے پھینکا ہے؟" فوزیہ بیگم عنایہ کو دیکھتے ہوئے بولیں، جو اب آنسوؤں کو صاف کرنے کی غرض سے اپنی آنکھیں ہاتھوں کی پشت سے رگڑ رہی تھی۔

"میں نے" وہ شرمندہ ہوئی۔

"لیکن کس لیے؟"

"کیونکہ یہ میرے سر سے بار بار اتر جاتی ہے جبکہ میں اسے لینے کی کوشش کرتی ہوں "

"بس اتنی سی بات؟"

"جی"۔۔۔ عنایہ نے اپنے سر کو جنبش دی۔

"دیکھو بیٹا یہ چادر آپ کے سائز سے بہت بڑی ہے اور آپ اسے صحیح طریقے سے اوڑھ نہیں پا رہی تھی جس کی وجہ سے وہ بار بار آپ کے سر سے ڈھلک جاتی تھی"۔۔۔ وہ پاس پڑی چادر کو اٹھاتے ہوئے بولیں اب وہ کمرے میں موجود الماری میں سے ایک دوسرا چھوٹے سائز کا سٹالر نکال کر لائیں۔

"یہاں بیٹھو!" فوزیہ بیگم نے عنایہ کو سٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ فوراً بیٹھ گئی تھی۔اب فوزیہ بیگم نے کچھ ہی سیکنڈز میں عنایہ کے سر پر اس سٹالر سے پیارا سا حجاب کر دیا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ بہت زیادہ خوش ہو گئی تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں؟"عنایہ خود کو شیشے میں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔"وہ اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولیں۔

" آپ کو پتہ ہے ماما کیف کو خوبصورت لڑکیاں پسند ہیں،اس نے مجھے بتایا تھا۔ "

"اچھا۔۔۔لیکن آپ تو ویسے بھی خوبصورت ہو۔ "

"نہیں!"۔۔۔فوزیہ بیگم نے نہ سمجھی سے عنایہ کو دیکھا۔

"کیف کہتا ہے، لڑکی وہ خوبصورت ہے جو خود کو چادر میں چھپا کر رکھے۔"وہ آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا!"۔۔اب وہ سارا قصہ سمجھ چکی تھیں۔

"ماما۔۔کیف کب آئے گا؟"چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

"اس نے مجھے بتایا نہیں، لیکن میں اسے بولوں گی کہ وہ جلدی آئے کیونکہ عنایہ اسے بہت مس کر رہی ہے "۔۔۔عنایہ مسکرائی



"یار امی، آپ بات کریں خالہ سے میرے رشتے کی"۔

کیسے کروں؟وہ جھنجھلائیں۔

"امی ان 30 سالوں میں پہلی بار کوئی لڑکی مجھے اچھی لگی ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں "۔۔۔آپ ایک بار خالہ سے میرے لیے بات تو کر کے دیکھیں؟

"وہ نہیں مانے گیں!"۔۔۔۔جواب آیا

"کیوں نہیں مانیں گیں؟"پیشانی پر شکنجے ابھریں۔

"یہ تم بھی اور میں بھی اچھے سے جانتے ہیں کہ عنادل فاروق کی منگ ہے۔ "

"تو؟"۔۔۔اور ویسے بھی میرا نہیں خیال کہ فاروق عنادل کو پسند کرتا ہے !

"جو بھی ہو، خیر وہ نہیں مانے گیں"۔۔۔۔زریں بیگم نے صاف لفظوں میں بتانا چاہا۔

"آخران لوگوں کا مسئلہ کیا ہے؟ یہی کہ میں 31 کا ہوں اور وہ 17 کی؟ اور آج کل یہ ایج ڈفرنس تو بہت کامن ہے"۔

"تم کیوں اس کے پیچھے پاگل ہو رہے ہو؟ تمہیں تو اس سے کئی اچھی اور خوبصورت لڑکیاں مل سکتی ہیں اور ویسے بھی ان مڈل کلاس لوگوں سے ہمارا اسٹینڈرڈ کہاں میچ کرتا ہے!" وہ غرور سے مسکرائیں۔

"مجھے فرق نہیں پڑتا! اگلے مہینے مجھے کام کے سلسلے سے پاکستان جانا ہے اور آپ بھی میرے ساتھ چلیں گیں اور میرے لیے خالہ سے بات کریں گیں"۔

"ہارون تم نے اپنی باجی سے بات کی ہے اس بارے میں؟ "

"یار امی آپ کر لینا بات ان سے "۔۔۔۔وہ کار کی کیز پکڑتے ہوئے بولا۔

ھمممم۔۔۔۔"کہاں جا رہے ہو؟ "

"رائسل خیمہ "۔۔۔۔میرا کلائنٹ آرہا ہے، کام کے سلسلے میں جارہا ہوں۔

"اچھا خیریت سے جانا"۔۔۔۔خداحافظ !



آج کا موسم کافی خوشگوار تھا آج پہلے کی نسبت ٹھنڈ ذرا کم تھی اور ہر سو سورج کی کرنیں موجود تھیں۔ سال کے اختتام میں یہاں پر کافی تعداد میں لوگ سیر و تفریح کرنے یا پھر برف باری کا مزہ لینے کی غرض سے یہاں کثرت سے آیا کرتے تھے۔

"سات لڑکوں کا وہ گروپ اس وقت مری کے پٹریاٹہ ایڈونچر پارک میں موجود تھا۔اس گروپ میں موجود تمام لڑکوں کی عمریں 15 سے 20 سال کے درمیان تھیں"۔

اونچے پہاڑی درختوں کے بیچ، جہاں تازہ ہوا کا بسیرا تھا، زمین سے کچھ فیٹ اوپر رنگوں کا ایک سمندر لہراتا تھا۔ یہ مختلف رنگوں کی سینکڑوں چھتریاں تھیں، جو ایک طویل راستے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ چھتریاں سورج کی تیز کرنوں کو چھان کر ایک دھیمی، خواب ناک روشنی کو نیچے بکھیر رہی تھیں۔اور جب یہ روشنی زمین پر پڑتی تو سائے بھی رنگین ہو جاتے۔

فرش پر چورس پتھروں کی ہموار پگڈنڈی دور تک جاتی تھی، جس کے دونوں کناروں پر زندگی کی چہل پہل تھی۔ بائیں جانب سبز لکڑی کے ڈبے اور بینچز رکھے تھے جہاں چند لوگ سائے میں بیٹھ کر سرد موسم کی دھوپ کا لطف لے رہے تھے۔ دائیں جانب ایک کھلا کیفے تھا، جہاں گہرے جامنی رنگ کی بڑی چھتریاں میزوں کو ڈھانپے ہوئے تھیں، اور ارد گرد لوہے کی کرسیاں موجود تھیں۔

راستے کے وسط میں دور تک لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ چونکہ یہ سال کا اختتام تھا جس وجہ سے کافی تعداد میں نوجوان وہاں موجود تھے جو مختلف اداروں کی ٹرپس کا حصہ تھے۔

"انکل دو آئس کریم پلیز"۔۔۔۔وہ کون والے انکل سے خود کے اور اپنی دوست کے لیے آئس کریم لینے ائی تھی۔

20 سالہ وہ نوجوان جو دکھنے میں "فرانسکو لاچوکی" سے کافی مشابہت رکھتا تھا، اور اس کی یہی پرسنلٹی اسے اپنے باقی بگڑے ہوئے دوستوں سے منفرد بناتی تھی۔

وہ اپنے باقی دوستوں کی نسبت بہت کم گو تھا، چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ کسی کے سوال کرنے پر، جواباً بولنے کی بجائے وہ اپنے سر کو جنبش دے دیتا۔ باقیوں کی طرح وہ نہ تو اس جگہ سے اور نہ ہی وہاں کے ماحول سے متاثر ہوا تھا، "بہت کم چیزیں کیف کی توجہ کا باعث بنتی تھیں"۔

"مینگو یا سٹرابری؟ "

"مینگو "

ان لڑکوں میں سے ایک اپنی پاکٹ میں موجود سگرٹ کی ڈبیا کو باہر نکال کر باقی سب لڑکوں میں سگریٹ تقسیم کر رہا تھا۔

"سٹرابری؟"۔۔۔۔کون والے انکل کو شاید ایک کان سے کم سنائی دیتا تھا اس لیے اب وہ عنادل سے دوبارہ پوچھ رہے تھے

۔

"سٹرابری نہیں مینگو انکل!۔۔۔۔سٹرابری سیرپ تو بیمار لوگ کھاتے ہیں"۔

کیف جو اپنے ہونٹوں کے درمیان رکھی سیگرٹ کو لائٹر کی مدد سے جلانے لگا تھا، عقب سے آنے والی نسوانی آواز پر رکا اور اسے دیکھنے کے لیے اپنی گردن پیچھے کی جانب گھمائی۔

"عنادل کتنی دیر ہے؟ ہم نے جلدی سے ویڈیو شوٹ کرنی ہے اور پھر واپس بھی جانا ہے؟ "

"بس دو منٹ"۔۔۔۔اس سے پہلے کہ کیف اس کا چہرہ دیکھ پاتا وہ سویرا کی جانب مڑ گئی۔



معمول کی طرح وہ آج بھی کام سے لیٹ فارغ ہوا تھا۔ آفس سے سیدھا اب وہ اپنے اپارٹمنٹ جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ آفس میں کام آج زیادہ ہونے کی نسبت تھکاوٹ بھی دوگنا زیادہ تھی۔ ایک گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد بالا آخر وہ اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ چکا تھا۔

ہارون اور اس کی فیملی اس وقت دبئی میں قیام پذیر تھے کچھ عرصہ پہلے وہ سب پاکستان سے یہاں آگئے تھے چونکہ دبئی میں انہیں اچھی جاب مل گئی تھی لہذا اب وہ اپنا مستقبل دبئی میں دیکھتے تھے۔ اور پرمانٹ دبئی میں ہی سیٹل ہو گئے تھے۔ یہ فیملی کل آٹھ افراد پر مشتمل تھی جن میں سے ایک زریں بیگم اور ان کے شوہر مشتاق ریاض تھے اور باقی ان کی اولاد جس میں سب سے پہلے نمبر پر ان کا بڑا بیٹا اویس، دوسرے نمبر پر ان کی بیٹی فروزہ، تیسرے نمبر پر ان کا دوسرا بیٹا سبحان، چوتھے نمبر پر ان کا تیسرا بیٹا ہارون، پانچویں نمبر پر ان کا چوتھا بیٹا عبداللہ اور چھٹے نمبر پر ان کی دوسری بیٹی عروج تھی۔ یہ کل چھ بہن بھائی تھے۔ اور سب ہی اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تھے۔

گھر کا بڑا بیٹا اویس شادی شدہ تھا اور باقی کچھ راز جو صحیح وقت آنے پر سامنے آنے تھے۔

اویس اور اس کی بیوی رائسل خیمہ میں ایک اپارٹمنٹ میں قیام پذیر تھے، جبکہ باقی کی فیملی پروڈکشن سٹی میں کیا پذیر تھی۔ زریں بیگم، مشتاق صاحب اور ان کی دو بیٹیاں عروج اور فروزہ ایک ساتھ رہتے تھے جبکہ باقی تین بھائی ہارون، سبحان اور عبداللہ اپنے الگ اپارٹمنٹس میں رہتے تھے۔ تمام بہن بھائی ایک دوسرے سے مختلف سوچ رکھتے تھے۔ اور ان کی سوچ کس طرح سے مختلف تھی یہ ہم کہانی میں آگے جانیں گے۔

فروزہ، عروج، ہارون اور عبداللہ دبئی کی ایک کمپنی "ریل اسٹیٹ" میں پراپرٹی ڈیلر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ جبکہ سبحان انجینئرنگ کی کسی فیلڈ میں جاب کر رہا تھا، اور اویس جو محنت پسند نہیں تھا وہ دن بھر سکرین کے سامنے بیٹھ کر صرف ٹریڈنگ کرتا تھا۔ ٹریڈنگ اس کے لیے ایک جنون کی مانند تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ کسی دوسرے کام کو ٹریڈنگ پر ترجیح نہیں دیتا تھا اور اس کاروبار میں ہر بار اسے صرف نقصان ہی اٹھانا پڑتا تھا۔ لیکن کس سے فکر تھی؟ آخر جب اس کی بڑی بہن اس کی فائنشلی طور پر مدد کر رہی تھی۔



فوزیہ بیگم جو کچھ دیر پہلے عنایہ کو سلانے کے غرض سے ساتھ لیٹی تھیں، وہ نیند کی گہری وادیوں میں ڈوبنے ہی والی تھیں کے اچانک ڈور بیل کی تیز آواز نے انہیں جھنجوڑ کر جگا دیا۔ فوزیہ بیگم نے چونک کر آنکھیں کھولیں، کمرے میں ہر طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ انہوں نے آہستہ سے کروٹ لی اور دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا، سوءیاں ٹھیک 12 بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ لمحہ بھر کو وہ ساکت رہ گئیں، یہ سوچتے ہوئے کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ پھر وہ دھیرے سے بستر سے اٹھیں اور دروازے کی سمت بڑھنے لگیں۔

جب انہوں نے دروازہ کھولا تو سامنے کیف کھڑا تھا (ان کے بھائی کا بیٹا)۔

اسے دیکھ کر وہ حیران بھی ہوئیں اور بے حد خوش بھی۔ ان کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔

اسلام اباد کے ایک خوبصورت اور پر سکون علاقے میں ان کا گھر واقعہ تھا، جہاں کیف اکثر آیا کرتا تھا۔ لیکن پہلے کی نسبت اب وہ کبھی کبھار ہی آتا تھا، کیونکہ وہ لاہور کے ایک ہاسٹل میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔

آج اسے اچانک یوں دروازے پر دیکھ کر انہیں یوں لگا جیسے گھر کی ویرانی پل میں ختم ہو گئی ہو۔

کیف ان کے لیے اپنے بیٹے کی طرح تھا۔ فوزیہ بیگم کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی لہذا بچپن سے ہی وہ کیف کو اپنے بیٹے کی طرح ٹریٹ کرتی تھیں اور اپنا بیٹا مانتی تھیں۔ ان کے ہسبینڈ آرمی میں کیپٹن تھے، جو ایک کار ایکسیڈنٹ میں مارے گئے تھے۔ جس کا صدمہ انہیں ہمیشہ رہا، اس دوران وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگی تھیں۔ اس وقت جس نے سب سے زیادہ انہیں سہارا دیا، وہ کیف تھا۔ کیف اس وقت 12 سال کا تھا لیکن وہ بہت سمجھدار تھا۔ وہ پورا دن انہیں کسی نہ کسی سرگرمی میں ملوث رکھتا تھا تاکہ ان کا دھیان اس طرف نہ جائے اور واقعی کیف کی محنت رنگ لائی تھی۔ وہ ایک بار پھر زندگی کی طرف واپس لوٹ ائی تھیں۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کیف سے بہت اٹیچ تھیں اور اسے اپنا بیٹا مانتی تھیں۔ لیکن بعد میں کیف کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر سے خود کو اکیلا محسوس کرنے لگیں اور اپنی تنہائی کو ختم کرنے کے لیے ایک دن انہوں نے عنایہ کو اڈاپٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آج وہ اپنے اس فیصلے سے بے حد خوش تھیں۔ عنایہ کے آنے کے بعد ان کی لائف بہت چینج ہو گئی تھی اور وہ اس تبدیلی سے بہت خوش تھیں۔

ایک ماں ہونے کا احساس کتنا خوبصورت ہوتا ہے یہ انہوں نے عنایہ کے آنے سے جانا تھا اور اس سب کے باوجود بھی ان کے دل میں کیف کی محبت میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ آج بھی اسے اپنے بیٹوں کی طرح پیار کرتی تھیں۔

"آؤ بیٹا، اندر آؤ۔۔۔!" وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹیں اور بولیں۔

"تم اسلام اباد کب ائے؟ اور مجھے اپنی آمد کا بتایا کیوں نہیں؟" وہ پانی کا گلاس کیف کے سامنے رکھتی ہوئی بولیں۔

"یار پھوپھو میں آپ کو اور عنایہ کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔" وہ مسکرائیں

"عنایہ سو رہی ہو گی شاید؟" وہ پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے بولا۔

"ھممم۔۔۔ وہ تو تمہیں کب سے مس کر رہی تھی، دیکھنا تمہیں دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔"

"کتنے دن کے لیے آئے ہو؟" وہ سامنے موجود کیری کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"پھپھو دسمبر یہیں گزار کر جاؤں گا۔" وہ ٹرے میں شیشے کا گلاس واپس رکھتے ہوئے بولا۔

"سچ کہہ رہے ہو؟" وہ بے حد خوش ہوئیں۔

"جی!"۔۔۔ وہ مسکرایا

فوزیہ بیگم کی خوشی کی انتہا نہ تھی کیونکہ کافی وقت بعد وہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اکٹھے وقت گزارنے والی تھیں۔

"اوکے تم اب ریسٹ کر لو، باقی باتیں صبح کریں گے۔" وہ مسکرا کر گویا ہوئیں۔

"جی پھپھو!" اب وہ اٹھ کر اپنا سامان اٹھا رہا تھا اور پھپھو اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔



صبح کی نرم دھوپ کھڑکی کے پردے سے چھن کر کمرے میں پھیل رہی تھی۔ کیف اپنی میز کے سامنے بیٹھا تھا، کانوں میں بلوتھ لگائے وہ مدھم سے گانے سنتے ہوئے گہرے سکون میں ڈوبا ہوا تھا۔ سامنے سفید سکیچ بک کھلی تھی اور اس کے ہاتھ میں پکڑی پینسل جیسے اس کی سانسوں کے ساتھ چل رہی ہو۔

وہ نہایت محویت سے آنکھوں کی تصویر بنا رہا تھا، باریک لکیریں ہلکی سی شیڈ نگ، اور پلکوں کی نرم جھکاؤ میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ شاید وہ آنکھیں خود ہی اتنی حسین تھیں۔۔۔ یا پھر کیف کے ہاتھوں کی مہارت تھی جو انہیں اور بھی دلکش بنا رہی تھی۔ وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔

دنیا کی ہر آواز جیسے کہیں دور رہ گئی تھی۔ صرف کمرے میں پھیلی خاموشی، ہلکی دھوپ، اور کیف کی پینسل کی سرسراہٹ باقی رہ گئی تھی۔

وہ مکمل طور پر اپنی تخلیق کی دنیا میں کھو چکا تھا۔ جہاں صرف وہ تھا، اور وہ آنکھیں۔

اسی دوران دس سالہ عنایہ آہستہ سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ کیف اپنی سکیچ بک پر آخری لکیریں بنا رہا تھا، تقریباً تصویر مکمل ہو چکی تھی۔ وہ اتنا محو تھا کہ اسے عنایہ کے آنے کا احساس تک نہ ہوا۔ معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ عنایہ نے پیچھے سے آ کر اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیے۔ لمحہ بھر کو کیف ٹھٹک سا گیا۔ جیسے خواب اور حقیقت کے درمیان کہیں رک گیا ہو۔ وہ اب بھی اسی تصویر کی آنکھوں میں کھویا ہوا تھا، جن میں اسے پوری دنیا سمٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ عنایہ کی معصوم ہنسی اور اس کے نرم لمس نے کمرے کی سکوت میں ایک خوشگوار سی رونق گھول دی تھی۔

"عنایہ؟" وہ دھیرے سے مسکرایا

"تم کب آئی؟" اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا، مگر عنایہ کی توجہ کہیں اور تھی۔ جواب دینے کے بجائے وہ میز پر رکھی اس سکیچ بک کو ٹک ٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔

کیف کو اچانک احساس ہوا کہ وہ اس کی بات سن ہی نہیں رہی۔ اس کی نظریں ان آنکھوں پر جمی تھیں جو ابھی صفحے پر جنم لے چکی تھیں۔

"عنایہ۔۔۔؟" اس نے نرمی سے پھر پکارا

اس کی آواز میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ، اور بے اختیار سا پیار شامل تھا۔ کمرے کی ہوا جیسے ایک پل کو ٹھہر گئی تھی، صرف دو ننھی آنکھیں تصویر کو دیکھ رہی تھیں۔۔۔ اور دو خاموش آنکھیں ان کے ردعمل کا انتظار کر رہی تھیں۔

"یہ آنکھیں کس کی ہیں کیف؟ "

"تمہیں یہ پسند آئیں؟ "

"ہاں۔۔۔ یہ بہت خوبصورت ہیں، پر یہ کس کی ہیں؟ "

"ایک بے وقوف لڑکی کی جسے سٹرابری سیرف والی آئس کریم نہیں پسند۔" کیف کے لبوں کو ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا تھا۔
"کیا مطلب؟" وہ کنفیوز ہوئی

وقت جیسے پلٹ کر مری کے پٹریاٹا ایڈونچر پارک میں ٹھہر گیا تھا۔ ہلکی دھند، ٹھنڈی ہوا اور درختوں کی سرگوشیاں فضا میں گھل رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے آئس کریم کھا رہی تھی اور اس کی دوست ہنستے ہوئے اس کے چھوٹے چھوٹے ویڈیو شارٹس بنا رہی تھی۔ بے فکری اور معصومیت اس کے چہرے پر سجی ہوئی تھی۔

دوسری طرف ایک بینچ پر بیٹھا کیف اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار کسی دلکش منظر سے روبرو ہوا ہو۔

مگر اس کی نظر صرف اس کے چہرے پر نہیں، بلکہ خاص طور پر اس کی آنکھوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت ہیزل گرین آنکھیں سرد ہوا میں بھی ایک نرمی سی بھر رہی تھیں۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب کیف کے دل نے پہلی بار اعتراف کیا کہ حسن صرف چہرے میں نہیں بلکہ نگاہوں کی گہرائی میں بھی ہوتا ہے

اچانک وہ چونکی، اسے محسوس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر نظریں اٹھائیں تو سامنے کیف کی سیاہ گہری آنکھیں اس کی آنکھوں سے جا ٹکرائیں۔ پل بھر کے لیے وقت تھم گیا۔

ہوا کی ٹھنڈی لہر، درختوں کی سرسراہٹ، لوگوں کا شور، سب پیچھے رہ گیا تھا۔ " اب بس وہ تھی ۔۔۔ اور اس کی آنکھیں

، جو کیف کے دل پر پہلی دستک بن کر اتر چکی تھیں۔ "

اس نے نظریں جھکا کر فوراً دوسری طرف دیکھ لیا، مگر کیف اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلی لڑکی تھی جس کی خوبصورتی کا اعتراف کیف کے دل نے کیا تھا۔

اس احساس میں نہ کوئی شرط تھی، نہ کوئی خواہش۔ بس ایک ان دیکھا تعلق تھا۔۔۔ ایک نرمی، جو کیف کے دل میں پہلی بار جاگی تھی۔

وقت دوبارہ حال میں لوٹ آیا تھا۔ کیف نے مسکراتے ہوئے نرمی سے کہا،

"کچھ نہیں۔۔۔" اب وہ آہستہ سے جھکا اور ننھی سی عنایہ کی چھوٹی سی ناک پر پیار سے ایک نرم بوسہ دیا۔ جس پر وہ خوشی سے کھلکھلائی۔



یہ اٹلی کی تنگ اور خاموش گلی تھی۔ رات کی سیاہی ہر طرف کسی چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ ٹمٹماتی سٹریٹ لائٹس کی کمزور روشنی، دھند اور سموگ میں گم ہو کر ایک پر سرار سا منظر بنا رہی تھی۔ گلی کے بیچوں بیچ ایک لاش پڑی تھی، بدن ٹوٹا ہوا، لباس گرد سے اٹا ہوا، اور اس کے سامنے ایک لڑکا زمین پر بیٹھا تھا۔

وہ چند قدم دور تھا، مگر اس کی نظریں ایک پل کو بھی ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ جیسے اس کے سامنے کوئی انسان نہیں، بلکہ کوئی عجیب معمہ پڑا ہو۔ اس کی آنکھوں میں لالی (سرخی) تھی پتہ نہیں جاگتے رہنے کی تھکن تھی، خوف تھا۔۔۔ یا پھر واقعی خون اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ گھٹنوں پر جڑے ہوئے تھے، اور چہرے پر ایک غیر معمولی سکون۔ جیسے یہ منظر اس کے لیے نیا نہیں تھا، جیسے وہ اس خاموشی کا عادی ہو چکا ہو۔

چار سو دھند تیر رہی تھی۔ سائے لمبے ہو کر ایک دوسرے میں گم ہوتے جا رہے تھے، اور لڑکے کی خاموش گمبھیر آنکھیں صرف ایک ہی نقطے پر جمی رہیں۔ (لاش پر)

ایک ہلکی سی ہوا چلی، اس کی جیکٹ کا کالر ہلا۔۔۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ وہ محسوس ہوتا تھا جیسے اندھیرے، دھند اور موت ۔۔۔ تینوں نے مل کر اس خاموش لڑکے کو اپنے حصار میں لے لیا ہو۔

وہ آہستہ آہستہ اٹھا اور لاش کے قریب چلا آیا۔ اس کے قدموں کی چاپ اس سنسان گلی میں عجیب سی گونج پیدا کر رہی تھی۔ وہ جھک کر لاش کے قریب بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں وہی سرخی، وہی سرد سکون۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھایا اور لاش کی گردن پر انگلی پھیرنے لگا، جیسے کسی جانے پہچانے نمونے کو دہرا رہا ہو۔

گردن کی سیاہ ہوتی جلد پر وہ ایک نشان بناتا جا رہا تھا۔ بالکل بنا کسی جھجک، بنا کسی ہچکچاہٹ کے۔ ایسے جیسے یہ سب اس کے لیے بہت معمولی سی بات ہو جیسے یہ نشان وہ پہلی بار نہیں بنا رہا۔۔۔ بلکہ برسوں سے یہی کرتا آ رہا ہو۔

نشان گہرا ہوتا گیا اور ساتھ ہی گردن سے خون اور تیزی سے بہنے لگا۔ سرخ دھاریں آہستہ آہستہ بہہ کر گلی کے ٹھنڈے فرش پر پھیلنے لگیں۔ وہ خاموشی سے یہ سب دیکھتا رہا۔ نہ گھبراہٹ، نہ عجلت، صرف ایک عجیب سی دلجمعی جیسے وہ کسی فن پارے کو مکمل کر رہا ہو۔

ہوا اب مزید سرد ہو گئی تھی۔ دھند گہری ہو کر اس منظر کو اپنے اندر لپیٹنے لگی۔ اور وہ لڑکا۔۔۔ اپنے چہرے پر بنا کوئی تاثر لیے، صرف اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ نشان مکمل کر چکا تھا۔ایک لمحے کے لیے اس نے خاموشی سے گردن کو دیکھا، جیسے تصدیق کر رہا ہو کہ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا وہ چاہتا تھا۔ پھر وہ سست رفتار سے کھڑا ہوا۔

اس نے مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی نہ کی۔ قدم پیچھے کی طرف بڑھنے لگے، مگر نظریں اب بھی اسی لاش پر جمی رہیں۔

اس کی آنکھوں کی سرخی ٹھنڈی اور بے حس تھی۔ کوئی پچھتاوا نہیں، کوئی خوف نہیں۔

اس کے ہاتھ خون سے تر تھے۔انگلیوں کے درمیان جما ہوا گاڑھا سرخ رنگ قطرہ قطرہ بن کر زمین پر گرتا جا رہا تھا، پتھر پر پڑتے ہی وہ قطرے ٹھنڈی رات میں بھیانک نقش بنا رہے تھے۔ ہر قطرہ جیسے اس گلی کی خاموشی میں ایک نئی بازگشت پیدا کر رہا تھا۔

وہ پیچھے ہٹتا گیا، آہستہ آہستہ، اور اس کے قدم دھند میں گم ہونے لگے۔ سموگ نے پہلے اس کے کندھوں، پھر اس کے چہرے کو نگل لیا۔چند ثانیوں بعد بس خالی گلی رہ گئی۔۔۔

"لاش۔۔۔ "

"اور بہتا ہوا خون۔ "



رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کمرے میں مدھم سی روشنی تھی اور وہ آنے والے کل کے امتحان کی تیاری میں گم تھی۔ کتاب کھلی ہوئی تھی، لفظ آنکھوں کے سامنے تھے مگر ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔اچانک موبائل کی سکرین روشن ہوئی۔

ٹرن۔۔۔

ایک نوٹیفکیشن۔

نامعلوم نمبر سے صرف ایک لفظ:

"Hi”

اس نے الجھن کے عالم میں موبائل اٹھایا، نمبر چیک کیا۔ کنٹری کوڈ مختلف تھا۔ وہ چونک اٹھی۔ یہ پاکستان کا نمبر نہیں تھا، کسی اور ملک سے آیا ہوا پیغام تھا۔اس نے جواب نہیں دیا اور سکرین بند کرنے ہی والی تھی کہ ایک اور نوٹیفکیشن ابھرا:

"How are you ?""""

اس کے دل میں ایک لمحے کو تجسس نے سر اٹھایا۔ بلاک کرنے سے پہلے اس لیے خود سے پوچھا، آخر کون ہو سکتا ہے؟

انگلیاں سکرین پر پھسلیں اور اس نے صرف ایک لفظ ٹائپ کیا:

"Who ? """

پیغام بھیجتے ہی ایک سیکنڈ کے اندر سین ہو گیا۔ اس کی نظریں سکرین پر جم گئیں۔ سامنے "ٹائپنگ" کے لفظ ابھرنے لگے، جیسے کوئی بے تابی سے جواب لکھ رہا ہو۔ چند لمحوں کے بعد پیغام آیا:

" Haroon Mushtaq """

وہ نام پڑھ کر ٹھٹک گئی۔ نام جانا پہچانا سا تھا مگر یادوں میں کوئی چہرہ ابھر نہ سکا۔ اس نے ہلکی سی سانس لی اور دوبارہ لکھا:

" Sorry , may I Know who are you ?""""

جواب آیا:

" yes...I am your cousin . I think you don't recognize me """

وہ ابھی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک باہر زوردار گرج چمک ہوئی۔ کھڑکی کے شیشے کانپ اٹھے۔ آسمان جیسے چیخ پڑا ہو۔

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اسے بچپن سے ہی گرج اور کڑک سے خوف آتا تھا۔

اس نے موبائل وہیں چھوڑا، کتاب بند کی اور بغیر دیکھے ماں کے کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔

اندھیرے راہداری میں اس کے قدموں کی چاپ اس کے اپنے خوف کی گواہی دے رہی تھی، جبکہ پیچھے موبائل کی سکرین پر اب بھی ایک نام روشن تھا۔

"ہارون مشتاق۔"

جو شاید اس رات اس کی زندگی میں خاموشی سے داخل ہو چکا تھا۔



ڈائننگ ٹیبل پر سب جمع تھے۔ کھانے کی خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ عنایہ پوری توجہ کے ساتھ کھانے میں مصروف تھی ،جبکہ کیف حسب عادت اسے چھیڑ رہا تھا۔ کبھی وہ ناراضی سے بھویں سکڑ لیتی، کبھی روٹھ کر ماں سے شکایت کرتی۔ پھپو اس کی شکایت سن کر کیف کو ڈانٹنے کا ناٹک کرتیں اور کیف ان کی ادا پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر دیتا۔

یہ منظر دیکھ کر پھپو کا دل عجیب سی خوشی سے بھر گیا۔ دونوں بچوں کو ایک ساتھ دیکھ کر انہیں یوں محسوس ہوا جیسے برسوں بعد گھر میں مکمل خاندان کی کمی پوری ہو گئی ہو۔ اسی احساس کے ساتھ ان کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔

کیف کی نظر پڑی تو وہ چونک گیا۔

"کیا ہوا ہے پھپو؟ "

"کچھ نہیں۔۔۔" وہ مسکرائیں، اور دوپٹے کے کونے سے آنکھوں کے نم گوشے صاف کر لیے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے آہستہ سے پوچھا،

"اپنے پاپا سے ملنے کب جاؤ گے؟ وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ "

وہ جواب جانتی تھیں، پھر بھی سوال کر بیٹھی تھیں۔

کیف کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری، مگر وہ مسکراہٹ خوشی کی نہیں بلکہ استہزائیہ مسکراہٹ تھی، جیسے وہ جانتا ہو کہ سچ کچھ اور ہے۔

"وہ میرے پاپا نہیں ہیں۔۔۔ وہ انوشے اور بلال کے پاپا ہیں۔ "

یہ کہہ کر اس نے خاموشی سے نوالہ اٹھا لیا۔

پھپو کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کس نے کہا تم سے یہ؟" ان کی آواز میں فکر لرز گئی۔

"میں جانتا ہوں پھپو۔۔۔" کیف نے نظریں جھکائے رکھیں۔

"نہیں کیف، ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ تمہارے بھی پاپا ہیں۔ "

کیف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر اس کے دل کے اندر کہیں کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اس نے بس سر ہلا دیا، ہاں میں۔۔۔ بغیر کچھ کہے۔

پھپو نے گہری سانس لی اور بات بدلتے ہوئے نرمی سے کہا، "سنو۔۔۔ میں نے کل کے لیے کچھ پلان کیا ہے۔ کل ہم سب وہاں چلیں گے۔ اس طرح ان سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور ذرا سیر بھی ہو جائے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے کیف ؟ "

یہ سب وہ صرف کیف کے لیے کہہ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ کیف اپنے باپ سے محبت کرتا ہے، اور ان کی توجہ اور اپنائیت کا طلبگار ہے۔ مگر سوتیلی ماں کی سرد مہری اور بہن بھائی کی بے اعتنائی نے اس کے دل میں ایک ایسا کھلا پیدا کر دیا تھا جو ہر روز اسے چھبتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" کیف نے مختصر سا جواب دیا۔

پھو پھو کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری، مگر ان کا دل جانتا تھا کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے ایک ٹوٹا ہوا بچپن خاموشی سے سانس لے رہا ہے.



پروگرام کے مطابق وہ اگلے دن اس گھر پہنچ گئے تھے۔ کیف کے والد اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے، کسی اہم میٹنگ میں مصروف تھے۔ تاہم پیغام بھجوا دیا گیا کہ وہ رات کا کھانا سب کے ساتھ کھائیں گے، اور ساتھ ہی یہ اصرار بھی کیا گیا کہ کیف اور پھپو (منصور صاحب کی بہن) کم از کم ایک دن وہی قیام کریں۔ جس پر پھپو نے رضامندی ظاہر کر دی۔

اس گھر میں قدم رکھتے ہی کیف نے محسوس کیا کہ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ دیواریں وہی تھیں، مگر اپنائیت کہیں کھو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا، مگر دروازہ کھولتے ہی دل کو ایک اور دھچکا لگا۔ وہ کمرہ اب اس کا نہیں رہا تھا، وہ بلال کا کمرہ بن چکا تھا۔ اس نے ایک لمحے کو ٹھہر کر کمرے کو دیکھا، جیسے یادوں سے اجازت مانگ رہا ہو، پھر خاموشی سے دروازہ بند کر دیا۔

قدم خود بخود اسٹور روم کی طرف اٹھ گئے۔ وہی کمرہ جو بچپن میں اس کی پناہ گاہ تھا، اس کا رازدار۔

اس نے کمرے کے دائیں کونے کی طرف دیکھا، وہی جگہ جو اسے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ یادوں کا سیلاب امڈ آیا۔ اسے یاد تھا جب بھی اس کا دل بہت بھاری ہو جاتا، تنہائی حد سے بڑھ جاتی، وہ یہاں آ کر بیٹھ جاتا، گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر جی بھر کے رو لیتا۔ اور آنسوؤں کے بعد دل ذرا ہلکا ہو جاتا، جیسے درد کچھ کم ہو گیا ہو۔

آج وہ کونہ خالی تھا، مگر اس کے اندر کا کیف پھر وہی بچہ بن گیا تھا۔ تنہا، خاموش اور نظر انداز کیا ہوا۔

گھر میں اس وقت بلال موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سوات کی سیر پر گیا ہوا تھا اور شام تک واپس آنے والا تھا۔ انوشے بھی گھر پر نہیں تھی، وہ کسی آؤٹ ڈور پارٹی میں مصروف تھی۔ گھر میں صرف آصفہ بیگم موجود تھیں جو پھوپھو کے ساتھ باتوں میں مشغول تھیں۔

عنایہ کیف کے ساتھ تھی۔ وہ باغیچے میں اس کے ساتھ کھیل رہا تھا، کبھی اسے ہنسا دیتا، کبھی خود مسکرا دیتا۔ مگر اس مسکراہٹ کے پیچھے بے چینی چھپی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ وہ اپنے والد کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر وہ ایک طویل عرصے بعد ان سے ملنے والا تھا۔ اس کے دل میں باتوں کا ہجوم تھا۔ بہت سے شکوے، بہت سی کہانیاں اور کچھ ایسے سوال جن کے جواب وہ برسوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ بے صبری سے اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا جب وہ سامنے بیٹھ کر اپنے والد کو دیکھے گا، ان کی آواز سنے گا اور شاید ان کی آنکھوں میں اپنے لیے وہی پرانی محبت لاش کر سکے۔

شام ڈھل رہی تھی، سائے لمبے ہو رہے تھے اور کیف کا دل ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اور زیادہ دھڑکنے لگا تھا۔ اس امید میں کہ شاید آج کچھ بدل جائے۔



ریاضی کی کلاس جاری تھی مگر عنادل کے لیے وہ لمحے حد سے زیادہ اکتاہٹ سے بھرے ہوئے تھے۔ استاد کی آواز کانوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ جاتی جیسے دل و دماغ نے سننے سے انکار کر دیا ہو۔ رجسٹر اس کے سامنے کھلا تھا مگر سوالوں اور فارمولوں کی جگہ اس کی انگلیاں بے ترتیب لکیریں کھینچ رہی تھیں۔ وہ لکیریں جو کسی مقصد کے بغیر تھیں، مگر پھر بھی لیکچر سے کہیں زیادہ دلچسپ لگ رہی تھیں۔ اچانک اس کے خیالات کل کی طرف بہک گئے۔ وہ انجان سا لڑکا، وہ نام، وہ پیغام، جس کی پہچان ابھی تک ایک سوال بن کر اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ آج گھر جا کر امی سے ضرور پوچھے گی۔ شاید امی کی یادداشت میں کوئی جواب چھپا ہو۔

کھڑکی کے باہر نظر پڑی تو منظر بدل چکا تھا آسمان پر بادل پھر سے امڈ آئے تھے اور بارش کی نرم بوندیں شیشے پر سرگوشیاں کرنے لگی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر عنادل کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ اسے بچپن سے ہی بارش اور ابر آلود موسم سے محبت

تھی۔ اگر کبھی اسے اختیار ملتا کہ وہ صرف ایک ہی موسم ہمیشہ کے لیے چن لے، تو وہ بلا جھجک سردیوں اور بارش کا انتخاب کرتی۔

اس کی ایک دیرینہ خواہش تھی برف کو حقیقت میں گرتے دیکھنے کی۔ وہ برف جو اس نے صرف کہانیوں اور تصویروں میں دیکھی تھی۔ مگر قسمت نے کبھی اسے یہ منظر نصیب نہیں کیا۔

بارش کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی، سنسناہٹ بھری ہوا چلنے لگی۔ بوندیں زمین سے ٹکراتیں اور ہوا کے جھونکے دل تک اتر جاتے۔ دن کی روشنی آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگی، جیسے شام نے وقت سے پہلے پردہ تان لیا ہو۔ عنادل کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ڈارک فینٹسی دنیا کا حصہ بن گئی ہو۔ وہ دنیا جسے وہ دل ہی دل میں بے حد پسند کرتی تھی۔

کلاس روم میں بیٹھے بیٹھے بھی اس کا دل ان بادلوں کے ساتھ کہیں دور اڑ چکا تھا۔ جہاں بارش، خاموشی اور اسرار ایک ساتھ سانس لیتے تھے۔



ڈائننگ ٹیبل پر سب موجود تھے۔ کھانے کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی اور باتوں کا شور ماحول کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔ سب ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے، ہنسی کے ہلکے پھلکے کہکے بھی سنائی دے رہے تھے۔ مگر ان سب کے درمیان ایک وجود ایسا بھی تھا جو مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

کیف پلیٹ کو سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ بریانی ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی، مگر وہ کھانے کے بجائے بس کانٹے کو آہستہ آہستہ چاولوں میں گھما رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی سمت اٹھ جاتیں، جیسے کسی کے آنے کا انتظار ہو۔ بلال اور انوشے وقت پر گھر پہنچ چکے تھے، مگر منصور صاحب اب تک نہیں آئے تھے۔ البتہ ان کی طرف سے میٹنگ میں پھنس جانے کا پیغام ضرور آیا تھا، مگر کیف کے لیے اطلاع بھی تسلی نہ بن سکی۔

سب باتیں کر رہے تھے، ہنس رہے تھے، مگر وہ ان لمحوں کا حصہ نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر نا مسکراہٹ تھی، نہ کسی بات پر رد عمل۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی موجودگی محض جسمانی ہو، روح کہیں اور ٹھہری ہو۔ اس کی دلچسپی کسی گفتگو میں نہیں تھی۔ وہ صرف ایک شخص کا منتظر تھا اور وہ شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نوالہ اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔

"کیف بھائی، آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟" اچانک بلال کی آواز گونجی۔

ایک لمحے میں ساری محفل پر خاموشی چھا گئی۔ باتوں کا شور جیسے کسی نے یکدم چھین لیا ہو۔ آصفہ بیگم کی نظریں فوراً کیف کی طرف اٹھیں۔ سرد، ناگواری سے بھری ہوئی۔

وہ کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ کیف اس خاندان کا حصہ بنے اور ان کی آنکھوں میں وہی پرانی ناپسندیدگی جھلک رہی تھی۔

"کیسے ہیں سب لوگ؟" کیف نے جواب دینے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اچانک دروازے سے منصور صاحب کی آواز گونجی۔

ان کی آواز کے ساتھ ہی خاموشی ٹوٹ گئی۔ ماحول دوبارہ زندہ ہو گیا، باتیں شروع ہو گئیں، کرسیوں کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ مگر کیف کے دل میں جو خاموشی اتر چکی تھی، وہ بدستور وہیں ٹھہری رہی۔ گہری، بوجھل اور تکلیف دہ۔

کیف منصور صاحب کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر انہیں گلے لگا لے، برسوں کی دوری کو ایک لمس میں سمیٹ لے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنا قدم بڑھاتا، بلال دوڑتا ہوا گیا اور منصور صاحب سے لپٹ گیا۔ کیف کا بڑھا ہوا قدم وہیں ٹھہر گیا، جیسے زمین نے اسے جکڑ لیا ہو۔

"میرا بیٹا کیسا ہے؟" منصور صاحب نے بلال کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ دونوں ایک ساتھ ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئے، اور کیف وہیں کھڑا رہ گیا۔ خاموش، بے آواز۔

چند لمحوں بعد منصور صاحب اس کے قریب آئے۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا، "کیف، کیسے ہو؟ "

یہ ایک سوال تھا، بس ایک رسمی سا سوال۔ کوئی بازو نہ پھیلے، کوئی قربت نہ ملی۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئے، بہن سے ملنے اور دوسروں سے حال احوال کرنے۔

کیف کی نظریں ان کے پیچھے جمی رہیں۔ دل کے کسی کونے میں ایک کمزور سی امید جاگی کہ شاید وہ پلٹیں گے، شاید دوبارہ آئیں گے اور اسے بھی گلے لگا لیں گے۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے پلکیں جھپکیں، خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ رونا نہیں چاہتا تھا، بالکل نہیں۔ مگر اسے اپنا وہی بچپن یاد آ گیا۔ وہ چھوٹا سا کیف جو ہمیشہ اسی طرح پیچھے رہ جاتا تھا، جسے ہر بار نظرانداز کیا جاتا تھا، جس کے حصے میں ہمیشہ خاموشی آتی تھی۔ اس نے خاموشی سے آنسوؤں کو واپس دھکیلا، گہری سانس لی اور آہستہ سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

ٹیبل پر سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ آوازیں، باتیں، کہکے۔ مگر کیف کے اندر کچھ اور ٹوٹ گیا تھا، خاموشی کے ساتھ۔



کل کے لیے ایک پروگرام بنایا گیا تھا۔ اسلام اباد کے ایک پر تعیش ریسٹورنٹ میں سب باہر کھانے کے لیے جانے والے تھے، مگر کیف نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے ایک بہانہ بنایا کہ وہ پہلے ہی اپنے دوستوں کے ساتھ ملنے کا پلان بنا چکا ہے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ دوبارہ اپنے والد کی توجہ سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یہ احساس اس کے لیے باقی سب تکلیفوں سے زیادہ بھاری تھا، کیونکہ بچپن سے ہی اس کے والد ہمیشہ اس کو نظرانداز کرتے آئے تھے، اور ہر بات میں اپنے دوسرے بچوں کو ترجیح دیتے تھے۔ ہر بار دوسرے بچوں کو ترجیح ملتی، ہر بار اس کے جذبات کو نظرانداز کیا جاتا۔

کیف صرف سات سال کا تھا جب اس کی والدہ نے اس کے والد سے طلاق لے لی تھی۔ وہ اپنے بڑے بیٹے اور چھوٹی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ وہ کیف کو بھی ساتھ لے کر جانا چاہتی تھیں۔ لیکن منصور صاحب نے ایسا ہونے نہیں دیا انہوں نے کیف کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مومنہ بیگم نے بہت کوشش کی کیف کو اپنے ساتھ رکھنے کی مگر سب ناکام گئی، البتہ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ منصور اپنے بیٹے کیف سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ وہ کیف کو خود سے دور نہیں جانے دیں گے لہذا وہ مان گئیں اور اپنے دوسرے بچوں کو لے کر وہاں سے چلی گئیں۔

کیف اس وقت بہت رویا تھا، کیونکہ وہ کبھی بھی اپنے والدین کی جدائی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا بچپن اس لمحے کے صدمے میں ٹھہر گیا تھا۔



کلب کی نیم تاریخ فضا میں مدھم موسیقی گونج رہی تھی۔ نیون لائٹس کے نیچے چند کم عمر لڑکے ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ایسے مقام پر جہاں ان کی موجودگی خود ایک غلطی تھی، مگر تعلقات نے دروازے کھول دیے تھے۔ کیف ان میں خاموش بیٹھا تھا۔

ان میں موجود ایک لڑکے نے چھوٹے چھوٹے پیکٹ میز پر رکھے۔ فضا میں ایک اجنبی سے سنسنی پھیل گئی۔ کیف نے نگاہیں جھکا لیں۔

"میں نہیں لوں گا،" اس نے آہستہ مگر واضح کہا۔

"بس ایک بار آزمالو، کیا فرق پڑتا ہے؟" عثمان ہنسا۔

"تم یہ کیوں لیتے ہو؟" کیف نے پوچھا۔

"کیونکہ یہ ایک لت بن جاتی ہے۔" عثمان کی آواز میں عجیب سا فخر تھا۔

"کیسی لت؟ "

"جب آزمالو گے تو خود سمجھ جاؤ گے۔"

میز کے گرد بیٹھے لڑکے اپنے خول میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ اسی لمحے ایک کم سن لڑکا عثمان کے قریب آیا۔ اب وہ جھک کر عثمان سے کچھ کہہ رہا تھا۔

کیف بڑے غور سے اس لڑکے کو جانچ رہا تھا۔ اس کی عمر شاید 15 بھی نہ تھی۔ اس نے اندازہ لگایا۔

عثمان نے وہیں سے کاؤنٹر میں موجود ویٹر کو اشارہ کیا اور وہ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھ گیا، جیسے یہ سب معمول کی بات ہو۔

کیف اس لڑکے کو مسلسل گھور رہا تھا، جیسے وہ اپنے کسی سوال کے جواب کو تلاش کر رہا ہو۔

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔" عثمان نے کیف کو دیکھتے ہوئے کہا، جیسے وہ اس کے سوال کا جواب جانتا تھا۔

"اس کی ماں مر چکی ہے، باپ نے دوسری شادی کر لی اور کچھ دن پہلے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ بس چند لمحوں کے لیے یہ سب بھلانا چاہتا ہے، کچھ دیر کے ہی لیے مگر سکون چاہتا ہے۔ "

یہ الفاظ کیف کے دل میں تیر کی طرح اترے۔ چند لمحوں کا سکون۔۔۔۔ سب کچھ بھول جانا، یہ خواہش تو اس کے اندر بھی مدت سے پل رہی تھی۔ ایک لمحے کی کمزوری نے برسوں کے ضبط کو ہرا دیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے لرزتے ہاتھ سے وہ چھوٹا سا پیکٹ تھام لیا۔

اگلے ہی لمحوں میں اس کے اندر ایک عجیب سا طوفان اٹھا۔ سر جیسے کسی نے جکڑ لیا ہو، سینہ بھاری ہو گیا، نگاہیں دھندلا گئیں۔ دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ کرسی پکڑ کر سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا مگر زمین اس کے قدموں کے نیچے سے سرک گئی۔

کانوں میں شور بڑھنے لگا۔ کہیں دور سائرن کی آوازیں، لوگوں کی بھاگ دوڑ، کسی کا نام پکارنا۔ کیف کچھ سمجھ نہ سکا۔
آخری خیال جو اس کے ذہن میں ابھرا، وہ یہ تھا کہ شاید وہ واقعی سب سے دور جا رہا ہے۔۔۔۔ بہت دور۔
پھر تاریکی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔



کل اس کا امتحان تھا۔۔۔ مگر اب اسے اس کی کوئی پرواہ نہ رہی تھی۔
کتاب اس کے سامنے کھلی تھی، مگر لفظ اس کی نظروں سے پھسل کر کہیں اور جا ٹھہرتے تھے۔۔۔ وہیں، جہاں ہارون کی مسکراہٹ بسی تھی۔
ہارون نے محبت کے ایسے نرم، دلکش جال بنے تھے کہ وہ آہستہ آہستہ ان میں الجھتی چلی گئی۔۔۔ پہلے یقین نہ آیا، پھر ماننے لگی، اور اب وہی یقین اس کی دنیا بن چکا تھا۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اور شاید وہ یہ بھول گئی تھی کہ "کچی عمر کی غلطیاں بڑی پکی ہوتی ہیں۔"
بارش کی ہلکی بوندیں کھڑکی پر دستک دے رہی تھیں، اور وہ اپنی ہی سوچوں میں گم، ایک ایسے راستے پر چل پڑی تھی جہاں محبت تو تھی مگر انجام اب بھی دھند میں چھپا ہوا تھا۔



اسلام اباد کا موسم سیاہ بادلوں کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ فضا میں ٹھنڈی ہواؤں کا بسیرا تھا۔ سڑکیں لوگوں سے بھری تھیں ۔ جن میں کچھ موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور کچھ اپنی ہی دنیا میں گم تھے۔ اسی خوشی اور ہلچل کے درمیان ایک ایمبولنس پوری رفتار سے گزر رہی تھی۔
اس کے اندر زندگی اور موت کے درمیان ایک خاموش جنگ جاری تھی۔ ایک شخص اپنی آخری سانسوں سے لڑ رہا تھا اور اس کے قریب بیٹھا وہ دوسرا انسان اسے بچانے کے لیے بے اختیار کوشش کر رہا تھا۔ پر کیوں؟

آخری بار کیف نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں کھولی تھیں۔ سب کچھ دھندلا تھا۔۔۔روشنی، آوازیں، اور چہروں کے سائے۔ بس ایک مبہم ساوجود دکھائی دیا تھا۔ وہ شخص جو اس کے قریب بیٹھا تھا، مگر اس کا چہرہ پہچان سے باہر تھا۔ پھر سب کچھ دوبارہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔۔۔اور اس بار وہ مکمل طور پر بے حس، بے خبر، اپنی ہی دنیا سے کٹ چکا تھا۔ جہاں نہ آواز تھی، نہ روشنی، صرف ایک گہرا سا خلا تھا جو آہستہ آہستہ اسے اپنے اندر کھینچ رہا تھا۔

دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا اور ان کی گاڑی ٹریفک کے ہجوم میں بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔

"میں نے تو سوچا تھا ہم وقت پر پہنچ جائیں گے۔۔۔ مگر کافی دیر ہو گئی ہے۔" فجر نے بیزاری سے کھڑکی کے شیشے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" عنادل نے ہلکی سی سانس لے کر سر ہلایا۔

"پریشان نہ ہو، ہم جلد پہنچ جائیں گے۔۔۔اور سب کے ساتھ خوب انجوائے کریں گے۔" اصغر صاحب نے مسکراتے ہوئے تسلی دی۔

عنادل نے اپنی بوریت کم کرنے کے لیے کھڑکی کے باہر نظر دوڑائی۔ سڑک لوگوں اور گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی، ہر کوئی اپنی منزل کی طرف جلدی میں تھا۔۔۔ کہ اچانک پیچھے سے آنے والی ایمبولنس کی تیز آواز ابھری۔

چند لمحوں میں منظر بدل گیا تھا۔ لوگ راستہ دینے لگے، گاڑیاں کنارے ہونے لگیں، اور شور میں ایک لمحاتی سنجیدگی گھل گئی۔

وہ ایمبولنس تیزی سے ان کی گاڑی کے قریب سے گزری۔ اس کی رفتار میں ایک عجیب سی بے چینی تھی، جیسے وہ کسی کی زندگی کو وقت کے ہاتھوں سے چھین لینے کی کوشش کر رہی ہو۔

عنادل کی نظر بے اختیار اس پر ٹھہر گئی۔ اس کا دل اچانک بوجھل سا ہو گیا جیسے کسی انجانے درد نے اسے چھو لیا ہو۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں بند کیں اور دل ہی دل میں اس شخص کے لیے دعا کی۔

"یا رب۔۔۔ جس کی سانسیں اس وقت تیرے حکم کی محتاج ہیں، اس پر اپنی رحمت کا سایہ فرما۔ اس کے درد کو آسانی میں بدل دے، اور اسے ایسی زندگی عطا کر جس میں سکون اور شفا ہمیشہ اس کے ساتھ رہے۔ آمین۔"

اس نے آنکھیں کھولیں تو سڑک ویسے ہی تھی۔ مگر اس کے دل میں ایک انجانی سی بے چینی چھوڑ گئی تھی۔

جیسے وہ لمحہ کسی آنے والی کہانی کا آغاز ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ارزروم (ترکی)

ارزروم ترکی کے مشرق میں واقع ایک خوبصورت اور تاریکی شہر ہے۔

یہ شہر بلند پہاڑوں کے دامن میں بسا ہوا ہے اور سردیوں میں جب برف اس کی گلیوں، چھتوں اور درختوں کو اپنی سفید چادر میں ڈھانپ لیتی ہے، تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پوری دنیا خاموشی کی آغوش میں سو گئی ہو۔ ہوا میں ایسی ٹھنکی ہوتی ہے جو صرف جسم کو نہیں بلکہ انسان کے اندر تک اتر جاتی ہے۔

ارزروم اپنے قدیم تاریخ کے لیے بھی مشہور ہے۔ یہاں کی مساجد، قلعے اور پرانے دروازے صدیوں کی کہانیاں سناتے ہیں۔ جیسے وقت نے خود کو ان دیواروں میں قید کر لیا ہو۔ خاص طور پر "ڈبل مینارت مدرسہ" جیسی عمارتیں اس شہر کی شان کو اور بھی بڑھا دیتی ہیں۔

یہ شہر صرف سردی کا نہیں بلکہ حوصلے اور برداشت کا بھی استعارہ ہے۔ یہاں کے لوگ سخت موسم کے باوجود اپنی سادگی اور مہمان نوازی کے لیے جانے جاتے ہیں۔

صبح کے ساڑھے پانچ بجے الارم کی تیز آواز نے کمرے کی خاموشی کو چیر ڈالا۔ وہ لڑکی جو گہری نیند کے کسی نرم سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی، الارم کی پہلی ہی آواز پر چونک کر اٹھ بیٹھی۔ چند لمحے وہ یوں بیٹھی رہی جیسے خواب اور حقیقت کے درمیان کہیں الجھ گئی ہو، پھر آہستہ آہستہ حقیقت اس پر واضح ہونے لگی۔ یہ اس کے روزانہ جاگنے کا وقت تھا۔

اس نے عادتاً اپنے برابر پڑے الارم کلاک کو ہاتھ بڑھا کر بند کیا۔

کمرے میں نیم اندھیرا تھا اور سردی کی ایک ہلکی سی لہر اب بھی فضا میں موجود تھی۔ اس کی نظر دوسری طرف گئی جہاں اس کی چھوٹی بہن گہری نیند میں سوئی ہوئی تھی۔ وہ لمحہ بھر اسے دیکھتی رہی جو کتنے سکون سے اپنی نیند پوری کر رہی تھی، پھر نرمی سے اس پر کمبل ٹھیک کیا تاکہ سرد ہوا اس تک نہ پہنچے۔

بستر سے اترتے ہوئے اس نے آہستگی سے قدم زمین پر رکھے۔ اب اس کا رخ کمرے میں موجود کھڑکی کی جانب تھا۔ کھڑکی کے پاس آکر اس نے پردہ ہٹایا۔ باہر کا منظر سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ برف مسلسل گر رہی تھی۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا کھڑکی

کے کھلتے ہی اس کے چہرے سے ٹکرایا اور چند ہی لمحوں میں اس کا جسم کپکپا اٹھا۔ اس نے فوراً کھڑکی بند کر دی، مگر سردی کی چھاپ جیسے اس کے اندر تک اتر چکی تھی۔

اب اس کا رخ بیڈ کے سائیڈ پر موجود میز کی طرف تھا۔ وہ میز کی جانب آئی اور اپنا موبائل اٹھایا۔ فجر کی نماز کا وقت دیکھنے کے لیے اس نے ایک ایپ کھولی۔

یہاں کے موسم کی سختی اسے ہمیشہ حیران کرتی تھی۔ ارزروم میں سردیوں کے دن چھوٹے اور گرمیوں کے دن غیر معمولی طور پر طویل ہو جاتے تھے۔ اسی فرق کی وجہ سے ہر روز نماز کے اوقات بدل جاتے تھے، اور اسے ہمیشہ نماز پڑھنے سے پہلے نماز کا وقت چیک کرنا پڑتا تھا۔

"ہر روز نیا وقت۔۔۔ پھر بھی عبادت کا لمحہ ایک ہی رہتا ہے۔" وہ ہلکی سی سانس لے کر خود سے بڑبڑائی۔

اس نے سکون سے سکرین بند کی اور دل ہی دل میں دن کی تیاری شروع کر دی، جیسے یہ سرد صبح بھی اس کی عادتوں کا حصہ بن چکی ہو۔



آج کا دن باقی دنوں کے مقابلے میں زیادہ خاص تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے موبائل کو ہاتھ میں لیے صحن کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگا رہی تھی۔ زلیخہ کا دل تیز رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے کیا نتیجہ نکلنے والا تھا۔

زلیخہ نے کچھ ہی دن پہلے اپنی پسند کی یونیورسٹی کا اینٹری ٹیسٹ دیا تھا اور آج اس ٹیسٹ کا رزلٹ تھا اور اسی بے چینی سے کہ وہ پاس ہو گی یا نہیں وہ بے چینی سے یہاں سے وہاں چکر کاٹ رہی تھی۔ کہ اچانک اسے ایک ای میل موصول ہوئی۔

اس نے فوراً سے وہ ای میل اوپن کی اور اس کی آنکھیں حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے بھر گئیں جب اس نے پڑھا کہ وہ "آتاترک یونیورسٹی" کا اینٹری ٹیسٹ پاس کر چکی ہے۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔

آتاترک یونیورسٹی میں پڑھنا اس کی زندگی کی ایک خواہش تھی جو اب پوری ہونے والی تھی۔ اور اب وہ باقی سب کو یہ خوشخبری سنانے چلی گئی۔

"امی، طہور۔۔۔۔ پتہ ہے میں نے یونیورسٹی کا اینٹری ٹیسٹ پاس کر لیا ہے۔" وہ بے حد خوشی سے سب کو بتا رہی تھی اور سب اس کی خوشی میں ویسے ہی خوش تھے۔

"یونی جوائن کب سے کر رہی ہو پھر؟" ساجدہ بیگم نے پوچھا۔

"میری کلاسز نیکسٹ منتھ سے سٹارٹ ہو رہی ہیں۔ میں نیکسٹ منتھ سے ہی جوائن کروں گی۔" وہ پرجوش ہوئی

"امی، طہور آپ دونوں آج تیار رہیے گا۔ آج شام کا ڈنر ہم سب باہر کریں گے اور طاہر بھائی کو کال کر کے گھر جلدی آنے کا کہہ دیجئے گا اور یہ بھی کہ آج کا ڈنر میری طرف سے ہے۔" وہ سب کو حکم دیتی اپنی باقی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔



آج ویک اینڈ پر وہ دونوں بہنیں گھر کی صاف صفائی کرنے میں مصروف تھیں۔ دونوں بہنیں الماریوں اور پرانے سامان میں الجھی ہوئی تھیں کہ اچانک سٹور روم کے ایک کونے سے ایک پرانا لکڑی کا صندوق ملا۔ صندوق پر ہر طرف گرد جمی ہوئی تھی۔

زلیخہ نے تجسس سے اسے کھولا۔۔۔ صندوق کے اندر بچپن کے کھلونے رکھے تھے۔ وہی رنگین کھلونے جن سے وہ اور طہور بچپن میں کھیلا کرتی تھیں۔ اب وہ ایک ایک کھلونا اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ہر چیز جیسے بچپن کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ پھر اس کی نظر ایک چھوٹی سی روئی سے بنی گڑیا پر جا ٹھہری۔ اس نے اسے آہستگی سے ہاتھ میں لیا جیسے کوئی بہت قیمتی چیز ہو۔ نا چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ یہ صرف ایک گڑیا نہیں تھی، یہ اس کے بچپن کا ایسا لمحہ تھا جو کبھی واپس نہیں آ سکتا تھا۔

" اوہ۔۔۔ یہ وہی گڑیا ہے نا۔۔۔ جو یوسف نے تمہارے لیے بنائی تھی؟" طہور نے اپنی بہن کو یوں خاموش کھڑے دیکھا تو چونک کر بولی۔

زلیخہ نے کچھ کہنے کی بجائے بس ہلکا سا سر ہلا دیا۔ مگر اس کے ایک اشارے کے پیچھے کتنی یادیں، کتنے احساسات چھپے تھے۔ یہ شاید الفاظ بھی بیان نہ کر پاتے۔

آج کا پورا دن اس نے اداسی میں گزارا، نا چاہتے ہوئے بھی اس کے دل و دماغ پر ایک ہی سوچ حاوی تھی۔

دونوں ہاتھ تھوڑی کے نیچے جمائے، وہ بستر پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی اور نظریں کسی ان دیکھے نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ہر طرف خاموشی تھی مگر اس کے اندر خیالوں کا ایک ہجوم برپا تھا۔

وہ کسی ایک سوچ پر ٹھہرتی، تو دوسری آکر اسے اپنی طرف کھینچ لیتی۔ اس کے چہرے پر کبھی ہلکی سی مسکراہٹ ابھرتی، اور اگلے ہی لمحے آنکھوں میں ایک انجانی سی اداسی اتر آتی۔ اس کے خیالات اس وقت ماضی اور حال کے درمیان الجھے ہوئے تھے۔

"آخر وہ اس وقت کہاں ہوگا؟ "

"کیا کر رہا ہوگا؟ "

"کیسا دکھتا ہوگا؟"

"کہاں رہتا ہوگا؟۔۔۔اور سب سے ضروری بات۔۔۔ کیا اسے میں یاد ہوں گی؟"

" کہیں وہ مجھے بھول تو نہیں گیا ہوگا؟" وہ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ جانتی تھی کہ یہ سب سوچنا بیکار ہے، مگر وہ اپنے دل کو کیسے سمجھاتی؟"

"آخر وہ اس شخص کو کیسے بھلا دیتی جو اس کے لیے سب سے خاص تھا؟" اس نے مایوسی سے نظریں جھکا لیں۔

ارزروم کی سرد فضا میں ساجدہ بیگم اور ان کے شوہر ولی احمد اپنی چھوٹی سی مگر پر سکون دنیا بسائے ہوئے تھے۔

ان کے دو بچے تھے۔ طاہر، جو بڑا بیٹا تھا، اور طہور، جو ان کی ننھی بیٹی تھی۔

ولی احمد پیشے کے اعتبار سے سنار تھے، اور ان کا کاروبار خاصہ اچھا چل رہا تھا۔ محنت اور دیانت کے ساتھ انہوں نے اپنی زندگی سنواری، اور سب سے پہلے اسی شہر میں ایک خوبصورت سا گھر خریدا۔ ایک ایسا گھر جس میں خواب بھی بستے تھے اور سکون بھی

۔

مگر وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔۔۔۔

ترقی کے بعد اچانک کاروبار میں نقصان شروع ہو گیا۔ حالات نے پلٹا کھایا، اور ان نقصانات نے ولی احمد کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد ساجدہ بیگم پر جیسے ذمہ داریوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔

ساجدہ بیگم کو سلائی کا ہنر آتا تھا، سو انہوں نے گھر ہی سے ایک چھوٹا سا کام شروع کیا۔ آہستہ آہستہ محنت رنگ لانے لگی، اور وہی چھوٹا سا کام ان کے لیے سہارا بن گیا۔

وقت کے ساتھ انہوں نے نہ صرف اپنے بچوں کو سنبھالا، بلکہ زندگی کو ایک بار پھر سنوار لیا۔

اسی دوران، ان کی سگی بہن کی بیٹی زلیخہ بھی ان کی زندگی کا حصہ بن گئی۔ وہ صرف چار سال کی تھی جب ایک حادثے میں اس کے والدین اس دنیا سے چلے گئے۔

اس معصوم بچی کو ساجدہ بیگم نے محبت اور اپنائیت کے ساتھ اپنی آغوش میں لے لیا۔

زلیخہ کے لیے اب ماں کا مطلب صرف ایک ہی تھا۔۔۔اور وہ تھیں ساجدہ بیگم۔

اس لیے وہ انہیں "امی" کہہ کر ہی پکارتی تھی۔



اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں اور سامنے موجود دیوار کو خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

اسے سب کچھ دھندلا سا دکھائی دیا۔ یعنی وہ اب بھی نشہ آور ادویات کے زیر اثر تھا۔

چند لمحوں تک وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکا، ذہن جیسے دھند میں لپٹا ہوا تھا۔۔۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"اور میں یہاں کیوں ہوں؟"۔۔۔ کیف کے ذہن میں سوال ابھرے

پھر آہستہ آہستہ شعور نے ساتھ دینا شروع کیا۔۔۔

سفید دیواریں، مدھم سی روشنی، اور مشینوں کی ہلکی آواز۔۔۔ یہ کسی ہسپتال کا کمرہ تھا۔

"میں یہاں کیوں ہوں۔۔۔؟" اس نے خود سے سوال کیا، مگر جواب کہیں نہیں تھا۔

اس نے نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔۔۔۔

اسے تب احساس ہوا جب اس نے اپنے جسم کی بے بسی اور سٹیچر کی سختی کو محسوس کیا۔ وہ خود ہی مریض تھا، اس کمرے کا مرکز۔۔۔اور سب کچھ اسی کے گرد تھا۔

اس نے اپنی نظریں آہستہ سے دائیں ہاتھ کی طرف موڑیں۔۔۔ شفاف ٹیوب اس کی رگ میں اترتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی، جس کے ذریعے دوا کی بوندیں ایک ترتیب سے اس کے جسم میں شامل ہو رہی تھیں۔

کینولہ کے گرد سفید ٹیپ مضبوطی سے جمی ہوئی تھی،اور ہاتھ میں ہلکی سی جلن اور بوجھ کا احساس اسے اپنی کمزوری کا شدت سے احساس دلا رہا تھا۔

چند لمحوں بعد ذہن پر چھائی دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔۔۔اور یادیں ایک ایک کر کے لوٹنے لگیں۔

کلب کی تیز روشنی۔۔۔

دوستوں کی ہنسی۔۔۔

عجیب سا شور۔۔۔

اور وہ زہر جیسا نشہ۔۔۔سب کچھ واضح ہوتا چلا گیا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں، جیسے خود سے نظریں چرا رہا ہو۔

"مگر۔۔۔مجھے یہاں کون لایا۔۔؟"دل میں ایک اور سوال ابھرا۔

دروازہ ہلکے سے کھلا اور ایک ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔

اس نے قریب آکر مختصر سی نظر اس پر ڈالی، جیسے اس کی حالت کا اندازہ لگا رہا ہو۔

"اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟ بہتر ہو؟"اس نے نرم مگر پیشہ ورانہ لہجے میں پوچھا۔

کیف کے لب ہلکے سے ہلے۔۔۔مگر آواز ساتھ نہ دے سکی۔اس نے بس آہستگی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

کمزوری ابھی تک اس کے وجود پر غالب تھی،اور الفاظ جیسے کہیں اس کی گرفت سے نکل چکے تھے۔

"تمہاری فیملی باہر تمہارا انتظار کر رہی ہے کیف۔"ڈاکٹر نے فائل بند کرتے ہوئے مختصر سا جملہ کہا۔

یہ سنتے ہی کیف کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ایک انجانا سا خوف اس کے اندر اترنے لگا۔

"کیا سب کو پتا چل گیا ہو گا۔۔؟ "

"میں یہاں کیوں ہوں۔۔۔اور وہ ڈرگز۔۔۔؟"کیف کو شدت سے شرمندگی کا احساس ہوا۔

"کیا انہیں بھی سب معلوم ہو گیا ہو گا۔۔؟"اس کا ذہن فوراً اپنے والد کی طرف گیا۔کیف نے بے اختیار اپنی نظریں جھکا لیں ۔دل میں ایک عجیب سی گھبراہٹ پھیل گئی۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے والد پہلے ہی اس سے دور رہتے ہیں۔۔۔

اور اب۔۔۔

شاید یہ فاصلہ نفرت میں بدل جائے۔۔۔ یہ خیال ہی اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ کیونکہ کیف اپنے والد سے بہت محبت کرتا تھا، اور وہ ان کی محبت سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔۔۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔

کیف کے ہاتھ بے اختیار کانپنے لگے۔ اس نے سفید چادر کی سلوٹوں کو تھام لیا، جیسے خود کو سنبھالنے کی ایک ناکام سی کوشش کر رہا ہو۔

وہ نظریں اٹھانے کی بھی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ کیونکہ بعض اوقات سچ کا سامنا کرنے سے زیادہ مشکل، اس کے معلوم ہو جانے کا خوف ہوتا ہے۔



ارزروم (ترکی) کی سرد مگر دلکش شام تھی۔ باہر برف کی ہلکی تہ زمین کو سفید چادر کی طرح ڈھانپ رہی تھی اور ہوا میں خنکی کے باوجود ایک عجیب سی خاموش خوبصورتی تھی۔

شہر کے ایک آرام دہ سے کیفے میں وہ لڑکی کھڑکی کے قریب ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ شیشے کے پار برف کے گرتے ہوئے ذرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے گہرے سرمئی لمبے کوٹ کے ساتھ عنابی رنگ کا نٹڈ لباس پہنا ہوا تھا، اور اسی رنگ کی نرم چادر اس کے سر پر حجاب کے طور پر ڈھلی ہوئی تھی۔ اس کا انداز نہایت سادہ مگر بے حد نفیس تھا۔ وہ بار بار اپنی نگاہ دروازے کی طرف اٹھاتی، جیسے کسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہو۔

کافی کے گرم کپ سے اٹھتی بھاپ اس کے چہرے کے قریب آ کر بکھر جاتی۔ اس کی خاموشی میں ایک عجیب سا سکون تھا، مگر اس سکون کے پیچھے انتظار کی بے چینی چھپی ہوئی تھی۔

کیفے میں بیٹھے کچھ لوگ لاشعوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اس کے چہرے کی سادگی اور وقار میں ایک ایسی کشش تھی جو لوگوں کی توجہ کھینچ لیتی تھی، مگر وہ خود اس سب سے بے خبر اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔

پھر اچانک کیفے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ ادھر ادھر نظر دوڑاتی ہوئی سیدھی اسی میز کی طرف بڑھنے لگی جہاں زلیخہ بیٹھی تھی۔

جیسے ہی اس نے اپنی دوست کو دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

زلیخہ نے بھی اپنی نظریں اٹھائیں اور جیسے ہی اس کی دوست سامنے آئی، اس کے ہونٹوں پر ایک نرم، سچی مسکراہٹ آگئی۔۔۔ وہ مسکراہٹ جو صرف اپنے پسندیدہ انسان کو دیکھ کر دل سے نکلتی ہے۔

"تم آگئیں۔۔۔" زلیخہ نے خوشی سے کہا، جیسے انتظار کا بوجھ ایک دم ہلکا ہو گیا ہو۔

اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئیں، جبکہ باہر ارزروم کی سرد ہوا اپنی خاموشی کے ساتھ شہر کو چھوتی رہی اور کیفے کے اندر دو دوستوں کی ملاقات نے ماحول کو کسی حد تک گرم اور روشن کر دیا۔

"چلو جلدی سے بتاؤ وہ بات جس کے لیے تم نے مجھے یہاں بلایا ہے؟" دونوں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے جمائے وہ بے چینی سے بولی۔

"میں نے آتاترک یونیورسٹی کا اینٹری ٹیسٹ پاس کر لیا ہے۔"

"ارے واہ زلیخہ!۔۔۔ تم نے تو واقعی مجھے خوشخبری سنائی ہے اور اس خوشی کی ٹریٹ کب دے رہی ہو؟" وہ پرجوشی سے بولی ۔

"اوہو!۔۔۔ ٹریٹ بھی دے دوں گی یار، مگر یہ وہ بات نہیں ہے جس کے لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ "

"اچھا۔۔۔ تو پھر کیا بات ہے؟" اربش نے تجسس سے پوچھا۔

"تمہیں وہ عکاشہ خالہ کا بیٹا یاد ہے؟ "

"کون وہ؟۔۔۔ جس نے تمہارے لیے وہ روئی والی گڑیا بنائی تھی؟ "

"ہاں وہی۔۔۔"

"کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"یوسف۔" بے اختیار زلیخہ کے لبوں کو ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا۔

"اچھا۔۔۔ تو؟"

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔" زلیخہ نے آہستگی سے کہا۔

"اور تم کیوں اس سے ملنا چاہتی ہو؟" اربش کو تجسس ہوا۔

"کیونکہ میں اسے یاد کرتی ہوں۔ آخر وہ میرا بچپن کا دوست ہے۔ "

"تم جانتی ہو وہ اب کہاں رہتا ہے؟"

"نہیں۔۔۔"زلیخہ مایوس ہوئی۔

"کوئی فون نمبر، کوئی انسٹا یا فیس بک آئی ڈی یا اس سے ریلیٹڈ کوئی ایسی چیز، جو تمہیں اس تک پہنچا دے، ہے تمہارے پاس؟

"

"نہیں۔۔۔"

"تو پھر تم اسے کیسے ڈھونڈو گی یار؟"اربش بے زاری سے پاس رکھی کافی کا سپ لیتے ہوئے بولی۔

"یہی تو پرابلم ہے۔۔۔اسی کا حل نکالنے کے لیے تو تمہیں میں نے یہاں بلایا ہے۔اربش یار پلیز میری مدد کرو نا۔۔۔"زلیخہ کسی معصوم بچے کی طرح بضد ہوئی۔

اربش جواب دینے کی بجائے مزے سے اپنی کافی انجوائے کر رہی تھی۔

"تم اپنی اکلوتی دوست کی مدد نہیں کرو گی کیا؟"زلیخہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اچھا اچھا۔۔۔کرتے ہیں کچھ، بس تم رونا مت۔۔۔نہ جانے اتنے آنسو تم لاتی کہاں سے ہو زلیخہ۔ "

"تم دنیا کی سب سے اچھی دوست ہو۔"زلیخہ نے اپنی نشست سے اٹھ کر اربش کو گلے لگایا۔

"تم بھی۔۔۔"اربش کی نرم ہنسی فضا میں گونجی۔آس پاس بیٹھے لوگ بے اختیار مسکراتے ہوئے ان دو پیاری لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔



وہ ایک پر سکون جھیل کے کنارے بیٹھی تھی۔پانی کی سطح آئینے کی طرح ساکت تھی،اور ارد گرد پھیلی خاموشی میں ایک عجب سی طمانیت گھلی ہوئی تھی، جیسے یہ جگہ زمین پر نہیں، کسی خواب کی دنیا ہو۔

اسی لمحے اس کی نظر دور ایک درخت کے نیچے کھڑے ایک شخص پر پڑی۔وہ جھک کر کچھ زمین کے نیچے رکھ رہا تھا۔

"سنیے۔۔۔!"اس نے آواز دی۔

مگر اس نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔وہ اپنا کام مکمل کر کے مڑنے لگا۔

زلیخہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز قدموں سے اس درخت کی طرف بڑھی۔ دل عجیب سی بے چینی سے دھڑک رہا تھا۔

درخت کے پاس پہنچ کر اس نے جھک کر دیکھا، وہاں روئی کی بنی ایک چھوٹی سی گڑیا رکھی تھی۔

"یہ گڑیا۔۔۔"اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔

زلیخہ نے فوراً سر اٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا، جو اب اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

"یوسف۔۔۔!"اس نے بلند آواز میں پکارا۔

وہ شخص ایک لمحے کو رک گیا۔ آہستہ آہستہ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔۔۔

اور اسی لمحے۔۔۔

زلیخہ کی آنکھ کھل گئی۔

کمرہ خاموش تھا۔۔۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، مگر دل کی دھڑکن تیز تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور چھت کو خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"یہ ایک خواب تھا۔۔۔ صرف ایک خواب۔"

اس کے لبوں پر ادھوری سی اداسی اتر آئی، کیونکہ وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی تھی۔

جیسے کوئی بہت قیمتی لمحہ اس کے ہاتھوں سے پھسل گیا ہو۔

زلیخہ نے جھک کر اپنے دائیں جانب رکھے لیمپ کو جلایا۔ تو ہلکی سی زرد روشنی کمرے میں پھیل گئی، جیسے خاموشی کو بھی ایک نرم سا رنگ مل گیا ہو۔

زلیخہ نے آہستہ سے اپنے بیڈ کے دائیں جانب موجود سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور وہاں پر رکھی ہوئی وہی روئی کی بنی ہوئی گڑیا نکال لی۔

اس کے لبوں پر ایک مدہم سی مسکراہٹ آگئی۔ جیسے یہ گڑیا نہیں، کوئی محفوظ یاد ہو جسے وہ ہر بار چھو کر جی لیتی ہو۔

ارزروم کی ایک شام۔۔۔

ٹھنڈی ہوا گلیوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ کچھ بچے سڑکوں پر اپنے کھلونوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ہنستے، دوڑتے، شور مچاتے ہوئے۔

مگر انہی کے بیچ، ایک طرف دس برس کی ایک بچی اکیلی بیٹھی تھی۔

اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے تھے، اور پلکیں سوجی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ کچھ دیر پہلے ہی رو کر چپ ہوئی ہو۔

اسی لمحے اس نے سامنے سے آتے ہوئے ایک 15 سالہ لڑکے کو دیکھا۔

"یوسف۔۔۔"

اسے دیکھتے ہی زلیخہ کے لبوں پر بے اختیار سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"تم رو رہی تھیں؟" یوسف نے قریب آ کر نرم لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" زلیخہ نے مسکرانے کی کوشش کی، مگر وہ مسکراہٹ آنکھوں تک نہ پہنچ سکی۔

یوسف اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک نظر اس کی آنکھوں میں ڈالی اور ہلکا سا سر ہلایا۔

"میں تمہاری آنکھیں پڑھ سکتا ہوں زلیخہ، تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ "

اس کی آنکھیں اس کی بات سن کر پھیل گئیں۔ وہ لمحہ بھر کو خاموش رہ گئی۔ پھر دل ہی دل میں مان گئی کہ وہ درست کہہ رہا ہے ۔کیونکہ اس پوری دنیا میں ایک ہی شخص تھا جو اس کی آنکھیں پڑھ سکتا تھا، اور وہ تھا۔۔۔ یوسف۔

"اب بتاؤ۔۔۔ کیا ہوا ہے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"میری پسندیدہ گڑیا کھو گئی ہے۔۔۔" زلیخہ کی آواز مدھم پڑ گئی، اور اداسی پھر سے اس کے چہرے پر اتر آئی۔

"بس اتنی سی بات۔۔۔؟" وہ ہلکا سا مسکرایا، پھر اپنے پیچھے سے ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا جو سرخ کاغذ میں لپٹا ہوا تھا، اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے۔۔۔؟" زلیخہ نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے لیے تحفہ۔۔۔ میری طرف سے۔ "

"تحفہ۔۔۔؟" اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ چمک بھی آ گئی۔

"ہاں، تحفہ۔" وہ مسکرایا

"مگر۔۔۔ میں یہ کیسے لے سکتی ہوں؟" وہ الجھن میں پڑ گئی۔

"لے سکتی ہو۔۔۔ کیونکہ تمہارا دوست دے رہا ہے۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ اس میں کیا ہے؟" اس نے ڈبہ ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ ایسا۔۔۔ جو میں نے خود تمہارے لیے بنایا ہے۔" اس کی مسکراہٹ میں خلوص صاف جھلک رہا تھا۔

"سچ۔۔۔؟" زلیخہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ وہ جلدی سے اسے کھولنے لگی ہی تھی کہ یوسف نے اسے روک دیا۔

" کبھی نہیں۔۔۔ جب میں چلا جاؤں گا، تب کھولنا۔" زلیخہ ٹھٹک گئی۔

"تم کہیں جا رہے ہو؟ "

"ہاں۔۔۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کہاں۔۔۔؟" زلیخہ کا دل بے اختیار بے چین ہو گیا۔

"ہم۔۔۔ مستقل طور پر استنبول جا رہے ہیں۔ "

"کیا۔۔۔؟" زلیخہ کے چہرے کی ساری خوشی ایک دم ماند پڑ گئی۔

"تم واپس کب آؤ گے؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔۔۔"

"تو تم واپس نہیں آؤ گے؟" اس کی آنکھیں دوبارہ نم ہو گئیں۔

"تم چاہتی ہو کہ میں واپس آؤں۔۔۔؟" یوسف نے اسے غور سے دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔

"ہاں۔۔۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں تمہارے لیے واپس آؤں گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

زلیخہ کے چہرے پر ایک بار پھر روشنی لوٹ آئی۔

"تو۔۔۔ کیا تم میرا انتظار کرو گی؟ "

"ہاں۔۔۔ زلیخہ یوسف کا انتظار کرے گی۔" وہ لمحہ بھر کو رکی۔۔۔ پھر آہستہ سے بولی،

"لیکن وعدہ کرو۔۔۔ تم ضرور آؤ گے میرے لیے۔۔۔ "

"میں وعدہ کرتا ہوں۔۔۔ میں تمہارے لیے واپس آؤں گا۔"

وہ اچانک چونک کر حال میں واپس آئی۔ گڑیا اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی، اور آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"آہ۔۔۔ یوسف۔۔۔" اس نے دھیمی آواز میں خود سے کہا۔

"تم اپنا وعدہ بھول گئے ہو، مگر میں نہیں بھولی ہوں۔" اس نے گڑیا کو اپنے سینے سے لگا لیا، جیسے کسی پرانی یاد کو تھام رہی ہو۔

"میں تمہارا تب تک انتظار کروں گی۔۔۔جب تک تم واپس نہیں آتے۔ "

"اور اگر تم نہ آئے۔۔۔تو میں تمہیں خود ڈھونڈ لوں گی۔"اس کی آنکھوں میں ایک عزم سا ابھر آیا۔



(باب:2)

سیاہ ہُوڈی اور اسی رنگ کی جینز میں ملبوس وہ سنسان سڑک پر آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ شام کی دھند اٹلی کی گلیوں پر پھیل چکی تھی۔ اس کے ہاتھ جیبوں میں تھے، چہرہ ماسک سے ڈھکا ہوا تھا، اور ہُوڈی کی ٹوپی سر پر کچھ یوں کھنچی ہوئی تھی جیسے وہ خود کو دنیا کی نظروں سے چھپانا چاہتا تھا۔
وہ ایک زیرِ زمین اسٹیشن کے سامنے آ کر رُک گیا۔ چند لمحے وہ وہیں کھڑا رہا، پھر خاموشی سے سیڑھیاں اُترتا ہوا پلیٹ فارم تک آ گیا۔ وہاں بھیڑ کم تھی، مگر ہر چہرہ اپنی اپنی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ وہ ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا، نظریں کہیں دور جمائے، جیسے کسی سوال کا جواب تلاش کر رہا ہو۔

ٹرین کی آمد کی آواز نے خاموشی توڑ دی۔ دروازے کھلے، لوگ اندر داخل ہوئے، اور وہ بھی انہی میں شامل ہو گیا۔ اندر آ کر اس نے ایک خالی نشست پر بیٹھنے کا انتخاب کیا۔

ریل گاڑی کی کھڑکی کے پاس وہ خاموشی سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ باہر کی دنیا تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگ رہی تھی، مگر اس کے اندر وقت جیسے کہیں ٹھہر گیا تھا۔ مدھم سی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، جس سے اس کی تھکی ہوئی آنکھیں اور بھی بوجھل لگ رہی تھیں۔

اس نے سر پیچھے ٹکا رکھا تھا، جیسے چھت کو نہیں بلکہ اپنی قسمت کو دیکھ رہا ہو۔ سانسیں دھیمی مگر گہری تھیں، جیسے ہر سانس کے ساتھ کوئی بوجھ اندر ہی اندر اتر رہا ہو۔

ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چیز پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ شاید فون، یا کوئی یاد... جسے وہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ انگلیاں ہلکی سی کپکپا رہی تھیں، جیسے دل کے اندر چلنے والی بے چینی اب ہاتھوں تک آ پہنچی ہو۔

ریل کے پہیوں کی مسلسل آواز، "کھٹرک... کھٹرک... کھٹرک..."، اس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ ہو چکی تھی۔ آس پاس بیٹھے لوگ اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے، مگر وہ... وہ کسی اور ہی جہان میں کھویا ہوا تھا۔

اس کی آنکھیں بند ہوئیں، اور ایک لمحے کو یوں لگا جیسے وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا ہو۔ مگر کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں... چاہے وہ کتنی ہی دور کیوں نہ چلا جائے۔

اور وہ بھی شاید انہی یادوں کا اسیر تھا۔ ایک ایسا مسافر، جو سفر میں نہیں بلکہ اپنے اندر کہیں کھو چکا تھا۔

"آخر انسان اتنا خود غرض کیوں ہے؟" اسی خاموشی میں ایک سوال اس کے ذہن میں ابھرا۔

کچھ لمحوں کے لیے اس کی نگاہیں چھت پر ٹھہر گئیں، اور سوچوں کا ایک سلسلہ اس کے اندر بہنے لگا۔

انسان... جو بقا کے نام پر جیتا ہے۔ جو ہمیشہ اپنے لیے زیادہ چاہتا ہے۔ زیادہ طاقت، زیادہ محبت، زیادہ اختیار۔ شاید اس کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ پہلے خود کو بچانا سیکھتا ہے، اور اسی میں کہیں دوسروں کو بھول جاتا ہے۔

پھر ایک کمی کا احساس... ایک خوف کہ کہیں کچھ کم نہ پڑ جائے۔ اسی خوف میں وہ دوسروں سے آگے نکلنا چاہتا ہے، چاہے اس کے لیے کسی کو پیچھے چھوڑنا پڑے۔

اور سب سے بڑھ کر... ہر انسان اپنی کہانی کا مرکز ہوتا ہے۔ اپنی نظر میں وہی ہیرو ہے، اور باقی سب کردار محض پس منظر۔ شاید اسی لیے وہ دوسروں کے درد کو محسوس نہیں کر پاتا۔

ٹرین کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں، جیسے ان خیالات کو سمیٹ رہا ہو۔

پھر اچانک اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آگئی۔

"شکر ہے... میں انسان نہیں ہوں... میں تو وہ ہوں... جسے اس دنیا نے خود بنایا ہے۔" اس نے بہت دھیمے لہجے میں خود سے کہا۔

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھری، ٹھنڈی، مگر پُراسرار۔

ٹرین اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی، اور اس کے دل میں ایک فیصلہ واضح ہو چکا تھا۔ اب اسے اٹلی چھوڑنا تھا۔۔۔ جتنا جلد ممکن ہو۔



کمرے میں ہلکی سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں پر سجی نرم روشنیوں کی جھلک دلہن کے جوڑے پر پڑ کر ایک الگ ہی چمک پیدا کر رہی تھی۔ عنادل آج دلہن بنی بیٹھی تھی۔ سرخ لباس، مہندی سے سجے ہاتھ، اور آنکھوں میں ان گنت خواب۔

وہ خاموش بیٹھی تھی، مگر اس کے اندر خیالات کا ایک ہجوم برپا تھا۔

"بیٹیاں کتنی جلدی بڑی ہو جاتی ہیں نا..." اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

کل تک وہ اپنے ماں باپ کی لاڈلی بیٹی تھی... اور آج کسی کی بیوی بننے جا رہی تھی۔

اس نے آہستہ سے ایک گہری سانس لی، جیسے اپنے بکھرے ہوئے احساسات کو سمیٹ رہی ہو۔ دل میں ایک انجانا سا خوف بھی تھا۔

کیا وہ واقعی آج اپنے ماں باپ سے دور چلی جائے گی؟

کیا یہ گھر، جہاں اس کی ہر یاد بسی ہے، اب اس کا نہیں رہے گا؟۔۔۔ مختلف سوالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

اسی اثنا میں دروازہ آہستگی سے کھلا، اور مولوی صاحب نکاح کے لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ فضا میں ایک سنجیدگی سی پھیل گئی۔ چند لمحوں بعد الفاظ ادا ہوئے، اور گواہوں کی موجودگی میں ایک نیا رشتہ قائم ہو گیا۔

چند ہی لمحوں میں...

عنادل نور، عنادل ہارون بن چکی تھی۔

اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ جدائی کا دکھ صاف جھلک رہا تھا۔ ماں باپ سے بچھڑنے کا خیال دل کو بوجھل کر رہا تھا۔ مگر اسی دل کے کسی کونے میں ایک روشنی بھی تھی۔۔۔ اپنی محبت کو پا لینے کی خوشی۔

وہ ایک ساتھ دو جذبوں میں گھری ہوئی تھی... اداسی بھی، خوشی بھی۔۔۔ اس نے سر جھکا کر خاموشی سے مسکرا دیا۔

اس لمحے وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی محسوس کر رہی تھی۔

دل ہی دل میں اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔۔۔ کہ جسے اس نے دل سے چاہا، اسے وہی نصیب ہوا۔

اس کے لیے اس وقت سب کچھ خوبصورت تھا... بہت خوبصورت۔

اسٹیج رنگ برنگی روشنیوں سے چمک رہا تھا۔ ہر طرف ہنسی، باتوں اور کیمروں کی فلیشز کا شور تھا۔ لوگ باری باری دلہن کے ساتھ تصاویر بنوا رہے تھے۔ کوئی اس کے قریب آکر مسکرا رہا تھا تو کوئی دعاؤں کے الفاظ دہرا رہا تھا۔

مگر ان سب کے بیچ، عنادل خاموشی سے بیٹھی تھی۔

سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس، جھکی ہوئی پلکوں کے پیچھے اس کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ دل بے چینی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کسی ایک لمحے کی منتظر تھی... اپنے ہم سفر کی آمد کے لمحے کی۔

وہ اسے کبھی پہلے نہیں ملی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا جب وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے والی تھی۔ اور وہ بھی ایک اجنبی کے طور پر نہیں، بلکہ اپنے شوہر کے روپ میں۔

اس کے دل میں ایک عجیب سی کیفیت تھی...

خوشی، جھجک، تجسس۔۔۔۔ سب کچھ ایک ساتھ۔

کیا لمحہ ہوگا وہ... اس نے دل ہی دل میں سوچا،

"جب میں اسے پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی... اپنے ہمسفر کے طور پر۔"

اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی، اس نے ایک بار پھر خاموشی سے اللہ پاک کا شکریہ ادا کیا، جس نے اس کے نصیب میں یہ خوبصورت دن لکھا تھا۔

عنادل نور، بشریٰ بیگم اور اصغر اعجاز کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ایک ایسی بیٹی جو اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ وہ انجینئرنگ کی طالبہ تھی، محض سترہ برس کی عمر میں، مگر سمجھ اور سلیقے میں کسی سے کم نہ تھی۔

اس کے والد اصغر اعجاز، ایک سرکاری کالج میں استاد تھے۔ایک محنتی اور بااصول انسان، جنھوں نے ہمیشہ حلال کمائی کو ترجیح دی اور اپنے گھر کو اسی روشنی میں پروان چڑھایا۔ان کا گھرانہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا، مگر دل کے امیر تھے۔عزت دینا اور محبت بانٹنا ان کی پہچان تھی۔

عنادل کا کوئی بہن بھائی نہ تھا، اسی لیے وہ اپنے والدین کی واحد اور لاڈلی بیٹی تھی۔

اصغر اعجاز کا ایک بھائی بھی تھا۔۔۔سلیمان اعجاز، جو اپنے خاندان کے ساتھ یورپ میں آباد تھا۔

اور ان کی ایک بہن سونیا مرزا بھی تھیں۔وہ شادی شدہ تھیں اور اپنی فیملی کے ساتھ یہی اسلام اباد میں آباد تھیں۔

بشریٰ بیگم کی کزن زریں بیگم، رشتے میں ان سے بڑی تھیں، مگر بشریٰ کے لیے وہ کسی بڑی بہن سے کم نہ تھیں۔بشریٰ بیگم دل سے ان کی عزت کرتی تھیں اور ان کے ہر مشورے کو اہمیت دیتی تھیں۔

اسٹیج پر بیٹھی عنادل کے دل میں ایک نئی دنیا کے دروازے کھلنے کو تھے۔ہر گزرتا لمحہ اسے اس ملاقات کے قریب لا رہا تھا، جس کا وہ صرف خواب دیکھتی آئی تھی۔

اور آج...وہ خواب حقیقت بننے والا تھا۔



زریں بیگم...

پورے خاندان میں یہ نام ایک عجیب سی سرگوشی کے ساتھ لیا جاتا تھا۔جیسے ہی ان کا ذکر آتا، چہروں کے تاثرات بدل جاتے، آوازیں دھیمی ہو جاتیں اور نظروں میں ایک انجانی سی ناگواری اتر آتی۔

وہ خاندان میں ایک مغرور عورت کے طور پر مشہور تھیں۔

اکثر لوگ انہیں اچھی خاتون تصور نہیں کرتے تھے۔ان کے بارے میں رائے دینے والوں کی کمی نہ تھی، مگر سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔

لیکن انہی سب کے بیچ...

بشریٰ بیگم کی رائے سب سے مختلف تھی۔

وہ ہمیشہ اپنے خاندان کی اس سوچ کے خلاف کھڑی رہیں۔

ان کے لیے زریں بیگم صرف ایک رشتے دار نہیں تھیں، بلکہ ایک اعلیٰ ظرف عورت تھیں اور سب سے بڑھ کر، ایک بہن جیسی۔

بشریٰ بیگم کی نظروں میں زریں بیگم کی عزت کسی بھی الزام یا بات سے زیادہ تھی۔

وہ جانتی تھیں کہ ہر کہانی کے دو رخ ہوتے ہیں...اور شاید زرین بیگم کا اصل چہرہ وہ نہیں تھا جو سب کو دکھائی دیتا تھا۔

"تو آخر حقیقت کیا تھی؟"

یہ سوال جیسے فضا میں معلق تھا...

اور اس کا جواب صرف وقت کے پاس تھا۔

زریں بیگم کا تعلق ایک بڑے اور جانے پہچانے خاندان سے تھا۔ان کے تین بھائی تھے۔

سب سے بڑے بھائی مرزا علی تھے، جو اصغر اور سلیمان کی بڑی بہن سونیا بیگم کے شوہر تھے۔اس لحاظ سے زریں بیگم، سونیا بیگم کی نند تھیں۔

دوسرے بھائی محمود علی تھے، جو ایک چھوٹے موٹے صحافی کے طور پر جانے جاتے تھے۔

ان کی زندگی میں استحکام کم، مگر خودداری زیادہ تھی۔

اور تیسرے بھائی رحمت علی تھے، جن کا اپنا کپڑوں کا کاروبار تھا۔ایک سنجیدہ مزاج اور محنتی انسان، جو اپنے کام میں ہی مگن رہتے تھے۔

تینوں بھائی شادی شدہ تھے اور اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تھے۔

یہ خاندان بظاہر جتنا سادہ نظر آتا تھا، اس کے اندر اتنی ہی پیچیدگیاں چھپی ہوئی تھیں۔

اور ان سب کے بیچ...

زریں بیگم ایک ایسا کردار تھیں، جنہیں سمجھنا آسان نہ تھا۔

شاید وقت ہی بتائے گا...

کہ وہ واقعی مغرور تھیں، یا صرف غلط سمجھی گئیں تھیں۔



ویڈیو گرافر نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تو سارا ہال جیسے ایک لمحے کو ٹھہر سا گیا۔

"ابھی دلہا کی انٹری نہیں ہو گی..." اس کی سنجیدہ آواز گونجی،

"پہلے دلہن کا فوٹو شوٹ ہو گا، پھر دلہا آئیں گے... اور اس کے بعد دونوں کا ساتھ۔۔"

لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے، اور کیمرے دوبارہ اپنی جگہ سنبھالنے لگے۔

اس وقت عنادل کا فوٹو شوٹ جاری تھا۔

وہ اسٹیج کے ایک کونے میں، ستون کے ساتھ ہلکی سی ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے نازک ہاتھ آہستگی سے اس کے کانوں میں موجود جھمکوں کو چھو رہے تھے، جیسے وہ کسی انجانی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ سرخ جوڑے کی جھلک روشنیوں میں اور بھی دلکش لگ رہی تھی، اور اس کی پلکوں کی جنبش میں ایک الگ ہی نرمی تھی۔

"اب دلہا پیچھے سے آئیں گے... اور آپ ان کی طرف مڑیں گیں، پھر ہم تصویر لیں گے۔"

فوٹو گرافر نے ہدایت دی۔

یہ سنتے ہی عنادل کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا...

وہ لمحہ...

جس کا وہ کب سے انتظار کر رہی تھی...

آخر آپہنچا تھا۔

"جیسے ہی میں اشارہ دوں گا، آپ پیچھے مڑیں گیں۔" فوٹو گرافر کی آواز ایک بار پھر ابھری۔

عنادل نے خاموشی سے سر ہلادیا۔ اس کی انگلیاں اب بھی ہلکی سی کپکپا رہی تھیں، مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

پھر اگلے ہی لمحے... اشارہ ہوا۔

اور عنادل دھڑکتے دل کے ساتھ آہستہ سے پیچھے مڑی۔

وہ ہیزل گرین آنکھیں... رسٹ براؤن آنکھوں سے جاملیں۔

وہ واقعی خوبصورت تھا... یا شاید اس کی آنکھیں اس سے بھی زیادہ خوبصورت تھیں۔

عنادل کے دل نے دھیرے سے اعتراف کیا۔

اس وقت ہارون گولڈن کاپر رنگ کی شیروانی میں ملبوس تھا۔ روشنی جب اس کے لباس پر پڑتی تو وہ ہلکی سی چمک کے ساتھ اور بھی باوقار دکھائی دیتا۔ اس کی شخصیت میں ایک ٹھہراؤ تھا، ایک سنجیدگی... اور ساتھ ہی ایک عجیب سی کشش۔

اکتیس سالہ مرد...

مگر عنادل کی آنکھوں میں وہ اس لمحے دنیا کا سب سے خوبصورت شہزادہ تھا۔

عنادل کی سانسیں بے ترتیب ہو گئیں۔ اس کے ہاتھ ہلکے سے کانپے، مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ نظریں ہٹانا چاہیں، مگر جیسے وہ نگاہیں اسے اپنی طرف باندھ چکی تھیں۔

اور ہارون...

وہ اسے دیکھ کر دل سے مسکرایا۔

ایسی مسکراہٹ... جو لبوں سے زیادہ آنکھوں میں نظر آتی تھی۔

جیسے اس کی کوئی بڑی خواہش پوری ہو گئی ہو۔

جیسے وہ لمحہ جس کا وہ منتظر تھا، آخر کار اس کے سامنے آکھڑا ہوا ہو۔

اس کی آنکھوں میں ایک سکون تھا...ایک اطمینان، جو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

فوٹو گرافر کی آواز کہیں دور سے آئی،

"Hold it ....perfect!''''

مگر ان دونوں کے لیے وہ لمحہ کسی تصویر سے کہیں بڑھ کر تھا۔

عنادل نے ہلکی سی جھجک کے ساتھ پلکیں جھکا لیں، مگر اس کے ہونٹوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا... مگر اس دھڑکن میں اب گھبراہٹ کم، اور ایک انوکھی سی خوشی زیادہ تھی۔

یہ صرف ایک نظر نہیں تھی...

یہ دو انجان دلوں کے درمیان پہلا خاموش ربط تھا۔



زریں بیگم نے جب پہلی بار بشریٰ بیگم کے سامنے عنادل کے لیے اپنے بیٹے ہارون کا رشتہ رکھا تو کمرے کی فضا جیسے ایک لمحے کو ساکت ہو گئی تھی۔

بشریٰ بیگم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"عنادل ابھی بہت چھوٹی ہے..." انہوں نے آہستہ سے کہا، آواز میں ہلکی سی جھجھک تھی۔

"وہ ابھی اتنی سمجھدار نہیں جتنا ہارون ہے۔ جب وہ کچھ بڑی ہو جائے گی، تب ہم یہ رشتہ کر لیں گے۔" ان کے لہجے میں انکار کم اور ماں کی فکر زیادہ تھی۔

عنادل ان کی آنکھوں کا تارا تھی، اور وہ اتنی کم عمر میں اس پر اتنی بڑی ذمہ داری ڈالنے کے لیے تیار نہ تھیں۔

مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ زریں بیگم کو صاف انکار بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

آخر وہ ان کے لیے بڑی بہن جیسی تھیں...اور بشریٰ بیگم نے ہمیشہ ان کی ہر بات کو اہمیت دی تھی۔

مگر یہ معاملہ مختلف تھا...

یہ ان کی بیٹی کی زندگی کا سوال تھا۔

وہ الجھن میں تھیں...کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔

آخر ہارون عمر میں عنادل سے چودہ سال بڑا بھی تو تھا۔

لیکن زریں بیگم بھی اپنی بات پر قائم رہیں۔

انہوں نے نرمی سے، مگر مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی بات منوانے کی کوشش جاری رکھی...یہاں تک کہ آخر کار وہ بشریٰ بیگم اوران کے شوہر اصغر صاحب، کو راضی کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

خاندان کے اکثر لوگ اس شادی کے سخت خلاف تھے۔ کیونکہ وہ زریں بیگم کو اچھی طرح جانتے تھے...اور ان کے فیصلوں پر آنکھ بند کر کے بھروسا کرنے کو تیار نہ تھے۔

مگر کچھ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو سب کی رائے کے باوجود بھی ہو کر رہتے ہیں۔

رخصتی کے لمحے قریب آرہے تھے۔

بشریٰ بیگم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے عنادل کا چہرہ تھاما، پھر ہارون کی طرف دیکھا۔

"میری بیٹی پھولوں جیسی ہے ہارون، اس کا خود سے بھی زیادہ خیال رکھنا۔" ان کی آواز بھرّا گئی تھی۔

ہارون نے ایک لمحے کے لیے عنادل کی طرف دیکھا، پھر سنجیدگی سے سر ہلایا۔

"آپ فکر نہ کریں خالہ...میں عنادل کو شہزادیوں کی طرح رکھوں گا۔" اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

شادی میں خاندان کے سب افراد شریک نہ ہو سکے تھے۔

صرف فروزہ اور عروج ہی بہن بھائیوں میں سے موجود تھیں۔ باقی بھائی دبئی میں تھے۔ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے کام کو چھوڑ کر نہیں آسکتے۔

زریں بیگم اور مشتاق صاحب کے دور کے کزن، طلعت نوازش، بھی ان کے ساتھ شادی میں شریک تھے۔

بارات کو چکوال جانا تھا۔

اب وہیں عنادل کا گھر تھا...

ہارون اور اس کی فیملی صرف چند دن کے لیے یہاں آئی تھی، محض اس شادی میں شرکت کے لیے۔اس کے بعد انہیں واپس دبئی جانا تھا...اور اس بار عنادل بھی ان کے ساتھ جانے والی تھی۔

چکوال میں وہ سب اپنے کزن طلعت کے گھر قیام پذیر تھے۔

یہ صرف ایک شادی نہیں تھی...

یہ ایک نئی زندگی کی شروعات تھی۔

ایک ایسی زندگی، جس کے بارے میں ابھی بہت کچھ انجان تھا۔



بارات کے ہنگاموں کے بعد ایک دن کا وقفہ تھا۔اگلے دن ولیمے کی تقریب رکھی گئی تھی،اس لیے آج کا دن مہمانوں سے ملنے جلنے کے نام تھا۔

عنادل کو زریں بیگم نے اپنے مہمانوں سے ملوایا۔وہ خاموشی سے سب کے سامنے بیٹھی، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام دعا کرتی رہی۔

وہ ایک حساس لڑکی تھی۔ایسی کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس کے دل کو چھو جاتی،چاہے دوسرے لوگ اسے معمولی کیوں نہ سمجھتے ہوں۔

وہ باقی لڑکیوں سے مختلف تھی...

خاموش، مگر سب کچھ محسوس کرنے والی۔

اس دن اس نے سب سے ملاقات تو کی، مگر ایک چیز اس کے دل میں کھٹک گئی۔ زریں بیگم اور فروزہ کے رویے میں ایک عجیب سی سرد مہری تھی، جو پہلے محسوس نہیں ہوئی تھی۔

وہ مہمانوں کے درمیان بیٹھی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔

"بھئی کھانا تو بے حد بیکار تھا...انہیں پتا ہونا چاہیے تھا کہ ہم دبئی سے آئے ہیں، اور ایسا کھانا نہیں کھاتے... خیر، ان بیچاروں کو کیا پتا ہوگا، جنہوں نے کبھی اچھا کھانا کھایا ہی نہ ہو۔" یہ فروزہ باجی کی آواز تھی۔

عنادل کے ہاتھ جیسے ایک لمحے کو ساکت ہو گئے، دل دھک سے رہ گیا۔

اسی لمحے باہر سے فروزہ اور طلعت کی ہنسی گونجی۔ ہلکی سی، مگر طنز سے بھری ہوئی۔

عنادل کو سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی... کہ وہ کس کھانے کی بات کر رہے تھے۔

"بھئی ہم سب کا پیٹ خراب ہو گیا ہے وہ کھانا کھا کر!"۔۔۔ فروزہ بے تکلفی سے بولتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور عنادل کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

یہ جملہ جیسے سیدھا عنادل کے دل میں جا لگا۔

اس کے چہرے پر شرمندگی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی، مگر اس نے کچھ نہ کہا۔

وہ خاموشی سے بیٹھی رہی... جیسے اپنی ہی ذات میں سمٹ گئی ہو۔

زریں بیگم بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھی تھیں، چہرے پر ناگواری کے تاثرات لیے۔ دوسری طرف ایک مہمان خاتون بیٹھی تھیں، جو ان ہی مہمانوں میں سے ایک تھیں۔

"خالہ، آپ کا بھی پیٹ خراب ہو گیا ہے نا؟"۔۔۔ فروزہ نے اسی خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

انہوں نے ہلکا سا سر ہلا دیا۔

یہ دیکھ کر عنادل کا دل مزید ڈوب گیا۔ شرمندگی جیسے اس کے وجود پر چھا گئی تھی۔

کمرے کی فضا بوجھل ہو گئی تھی...

اور وہ خود کو اس سب کے بیچ اجنبی سا محسوس کرنے لگی۔

بعد میں، فروزہ نے خاص طور پر طلعت صاحب سے کہہ کر اصغر صاحب کو فون کروایا تھا اور یہ پیغام پہنچایا کہ شادی میں بنائے گئے کھانے سے سب کا پیٹ خراب ہو گیا تھا۔

اور اس سب کے دوران...

زریں بیگم، جو ہمیشہ سب کو نصیحتیں دینے میں پیش پیش رہتی تھیں، آج بالکل خاموش بیٹھی رہیں۔

ان کی یہ خاموشی...

عنادل کے دل میں ایک اور سوال چھوڑ گئی تھی۔

شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ کمرے میں اتر رہا تھا۔ کھڑکی سے آتی مدھم روشنی دیواروں پر لمبے سائے بنا رہی تھی۔ عنادل اپنے کمرے کے بستر پر اکیلی بیٹھی تھی۔

نیچے والے پورشن سے لوگوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں، کبھی قہقہے، کبھی برتنوں کی کھنک... مگر اوپر اس کے کمرے میں ایک عجیب سی خاموشی تھی۔

وہ گھٹنوں کو اپنے قریب سمیٹے، بازوؤں میں سر چھپائے بیٹھی تھی۔ جیسے خود کو دنیا سے الگ کر لینا چاہتی ہو۔

خیالات اس کے ذہن میں الجھتے جا رہے تھے۔

"میں نے... ماما... پاپا... اور ہمارے سارے مہمان... سب نے تو وہی کھانا کھایا تھا... پھر ہمیں کچھ کیوں نہیں ہوا؟"

اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"مانا کہ ہمارا مینو ان کی طرح فینسی نہیں تھا... مگر کھانا بُرا تو نہیں تھا... وہ تو اچھا تھا..." اس کے دل میں ایک چبھن سی اٹھی۔

"لیکن مجھے فروزہ باجی کا وہ انداز بالکل اچھا نہیں لگا... جس طرح انہوں نے ہمارے کھانے کا مذاق اُڑایا..."

کچھ لوگ اپنی زبان کی تلخی کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں اور انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا...

اس نے آہستہ سے سر اٹھایا، آنکھوں میں نمی سی جھلک رہی تھی۔ وہ خاموش تھی... مگر اس کے دل میں ایک بوجھ سا ٹھہر گیا تھا۔

یہ تکلیف صرف الفاظ کی نہیں تھی...

یہ احساس کی تھی، کہ کبھی کبھی لوگ انجانے میں نہیں، بلکہ جان بوجھ کر بھی دل دکھا جاتے ہیں۔

یکدم دروازہ کھلا اور ہارون کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی نظر سامنے بیٹھی عنادل پر پڑی تو اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بستر کے قریب آیا اور عنادل کے سامنے بیٹھ گیا۔

عنادل نے چونک کر سر اٹھایا، جیسے اپنے خیالوں سے باہر آئی ہو۔

"کچھ نہیں..." اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سجانے کی کوشش کی۔

"اچھا... تو یہ بتاؤ، تمہیں ہارون۔۔۔ یعنی میں، کیسا لگا؟ پیارا ہوں دیکھنے میں؟" اس نے ذرا شرارت سے پوچھا۔

عنادل کے گال ہلکے سے سرخ ہو گئے۔

"جی..." وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"لیکن... آپ کی آنکھیں سب سے زیادہ پیاری ہیں۔" اس کے لبوں پر ایک سادہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"اچھا؟" ہارون بھی مسکرا دیا۔

پھر عنادل نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا،

"اور... میری آنکھیں؟"

"اوہ، آف کورس اچھی ہیں..." وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر اپنے بال سنوارنے لگا،

"ظاہر ہے، تمہاری آنکھوں کا رنگ خوبصورت ہے۔" اس کا لہجہ بے پرواسا تھا... جیسے ایک رسمی ساجواب دے دیا ہو۔

عنادل کو نہ چاہتے ہوئے بھی برا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے سوال کے جواب میں کچھ اور سوچا تھا... شاید تھوڑی سی توجہ، تھوڑی سی نرمی۔

دل میں ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی۔

شاید وہ واقعی حد سے زیادہ حساس تھی... یا پھر بس سچ کو جلدی محسوس کر لیتی تھی۔

"اچھا..." اس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی۔۔۔ صرف ہارون کے لیے۔

"چلو، میرے ساتھ نیچے چلو۔ باجی بلا رہی ہیں۔" ہارون نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"جی..." عنادل آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔



چکوال کے ایک بڑے اور خوبصورت میرج ہال میں ولیمے کی تقریب سجائی گئی تھی۔ روشنیوں کی چمک، پھولوں کی مہک اور مہمانوں کی چہل پہل نے ماحول کو دلکش بنا رکھا تھا۔

اسٹیج پر ہلکے آسمانی رنگ کی میکسی میں ملبوس عنادل ایک دلہن کی حیثیت سے بیٹھی تھی۔ خاموش، ساکت... جیسے کوئی مجسمہ ہو۔ اس کے ارد گرد مہمانوں اور فوٹو گرافروں کا ہجوم تھا، جو باری باری اس کے ساتھ تصاویر بنوا رہے تھے۔

مگر ان سب کے بیچ، عنادل کی نظریں کسی اور کو تلاش کر رہی تھیں...

اپنی ماں اور باپ کو۔

زریں بیگم، فروزہ، عروج اور طلعت صاحب اپنے مخصوص مہمانوں کے ساتھ مصروف تھے۔ ان کی توجہ صرف ان لوگوں پر تھی جو ان کے لیے اہم تھے۔ جن میں زیادہ تر ان کے دوست یا کاروباری تعلقات کے لوگ شامل تھے۔ ہارون بھی انہی کے ساتھ کھڑا، ان کی پیروی میں مصروف تھا۔

اور عنادل...

وہ ان سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی اکیلی تھی۔

پھر، مہمانوں کے ہجوم سے ذرا دور، ہال کے ایک کونے میں، اس کی نظر ٹھہر گئی۔

وہاں...

اس کے ماں باپ کھڑے تھے۔

خاموش...الگ تھلگ... جیسے اس محفل کا حصہ نہ ہوں۔

عنادل کے دل میں ایک ٹھیس سی اٹھی۔

"انہیں تو یہاں سب سے آگے ہونا چاہیے تھا..."

"یہ تو اس کی زندگی کا سب سے اہم دن تھا..."

مگر وہ...

وہ کسی اجنبی کی طرح دور کھڑے، اپنی بیٹی کو قریب سے دیکھنے کی حسرت لیے ہوئے تھے۔

کسی نے انہیں کسی سے نہیں ملوایا تھا...اور نہ ہی کسی نے انہیں وہ عزت دی، جس کے وہ حقدار تھے۔

یہاں تک کہ زریں بیگم نے اپنے بڑے بھائی اور ان کی فیملی کو بھی وہ مقام دینا ضروری نہیں سمجھا۔

دوسرا بھائی اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھا، مگر سب سے چھوٹا بھائی اس شادی میں آیا ہی نہیں تھا...

کیوں؟

اس کی وجہ ابھی کہانی کے پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔

بشریٰ بیگم کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ وہ بار بار ٹشو سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں، مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ وہ ایک اور بات سے پریشان تھیں۔ اور وہ یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ عنادل ان کی آنکھوں میں یہ اداسی دیکھ لے۔

کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو اچھے سے جانتی تھیں...اگر عنادل نے انہیں روتے ہوئے دیکھ لیا تو وہ بھی ابھی رونا شروع کر دے گی۔

اور آج کا دن...

وہ دن جسے وہ اپنی بیٹی کے لیے سب سے خوبصورت بنانا چاہتی تھیں۔ وہ اسے کسی صورت خراب نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں۔ اور اسی لئے وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں...

مگر کیسے؟

انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی بیٹی کی شادی میں نہیں، بلکہ کسی غیر کی شادی میں آئی ہوں۔

اور اصغر صاحب... وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

ہر رویہ... ہر نظر... ہر خاموشی۔ مگر وہ خاموش تھے۔

کیونکہ وہ جانتے تھے، کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔۔۔ آخر وہ بیٹی والے تھے۔

اور بیٹی والوں کے حصے میں، اکثر صرف خاموشی ہی آتی ہے۔

رشتے کی بات پکی ہونے سے پہلے ایک شام، اصغر صاحب کے گھر کے ڈرائنگ روم میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے زریں بیگم بیٹھی تھیں، ہمیشہ کی طرح پُراعتماد، جبکہ بشریٰ بیگم اور اصغر صاحب کے چہروں پر ہلکی سی الجھن اور سنجیدگی صاف جھلک رہی تھی۔

"دیکھو بشریٰ..." زریں بیگم نے بات کا آغاز کیا۔

"اب مزید دیر کرنا مناسب نہیں۔ ہارون اتنا لمبا انتظار نہیں کرے گا۔"

بشریٰ بیگم نے دھیرے سے اصغر صاحب کی طرف دیکھا، پھر ہمت کر کے بولیں،

"آپ کی بات ٹھیک ہے باجی... مگر ابھی ہمارے حالات ایسے نہیں کہ ہم شادی کے اخراجات برداشت کر سکیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک دو سال کا وقت مل جائے... تاکہ ہم خود اپنی بیٹی کا سب کچھ اپنے ہاتھوں سے کر سکیں۔" ان کے لہجے میں نرمی بھی تھی اور ایک ماں کی خودداری بھی۔

مگر زریں بیگم نے فوراً سر ہلا دیا۔

"نہیں، میں مزید وقت نہیں دے سکتی۔ اور ویسے بھی... اگر اس وقت تمہارے پاس وسائل نہیں ہیں تو میں کس لیے ہوں؟ آخر میں بھی تو تمہاری بہن ہوں۔ ایسے وقت پر بہنیں ہی کام آتی ہیں۔"

کمرے میں ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔

"نہیں باجی، یہ مناسب نہیں ہوگا۔ ہم اپنی بیٹی کا خرچ خود اٹھانا چاہتے ہیں۔" اصغر صاحب نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

بشریٰ بیگم نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھیں... خاص طور پر اپنی بیٹی کے معاملے میں۔

مگر زریں بیگم جیسے پہلے سے تیار بیٹھی تھیں۔

اچھا... اگر تم لوگ یوں نہیں مانتے، تو سنو..." میں تمہیں کچھ رقم دے دیتی ہوں، امانت کے طور پر۔ جب تمہارے پاس وسائل آجائیں، تم وہ رقم مجھے واپس کر دینا۔"

ان کے الفاظ نرم تھے، مگر لہجہ ایسا جیسے وہ کوئی احسان نہیں، بلکہ ایک حل پیش کر رہی ہوں۔

بشریٰ بیگم اور اصغر صاحب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

امانت...

یہ لفظ ان کے لیے معمولی نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ امانت کا حق ادا کرنا کتنا بڑا فرض ہوتا ہے۔

کمرے میں چند لمحے خاموشی کے گزرے...

پھر آخر کار، زریں بیگم کے بار بار اصرار پر، وہ مان گئے۔

"ٹھیک ہے..." اصغر صاحب نے دھیرے سے کہا۔

"جیسے ہی ہمارے پاس وسائل ہوں گے، ہم آپ کی رقم فوراً واپس کر دیں گے۔"

"بس یہی تو چاہتی تھی میں..." زریں بیگم کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

یہ بات صرف چار لوگوں کے درمیان تھی۔

زریں بیگم، ہارون، بشریٰ بیگم اور اصغر صاحب۔۔۔اور زریں بیگم نے ان سے اس بات کو بس اپنے تک ہی رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

مگر... شاید اصغر صاحب اور بشریٰ بیگم حد سے زیادہ سادہ تھے۔

وہ ایک مغرور، تنگ نظر اور کم ظرف عورت کی باتوں میں آ گئے تھے...اور انہیں ابھی اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ فیصلہ آگے چل کر ان کی زندگی میں کیا رنگ لانے والا ہے۔



آج موسم غیر معمولی طور پر خوشگوار تھا۔ باہر فضا میں ٹھنڈی ہواؤں کا بسیرا تھا۔

وہ سب کچھ دیر پہلے ہی ولیمے کی تقریب سے واپس لوٹے تھے، اور اب گھر میں ایک تھکی ہوئی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنے اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا۔

مگر اوپر، اپنے کمرے میں...

عنادل بستر پر لیٹی تھی۔

خاموش...

بے آواز...

اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تکیے میں جذب ہو رہے تھے، جیسے اس کا دکھ بھی اسی میں کہیں چھپتا جا رہا ہو۔

ہارون اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ وہ ہال سے ہی سیدھا اپنے کچھ پرانے دوستوں کے ساتھ باہر چلا گیا تھا، شاید تھوڑی دیر گھومنے کے لیے۔

اور عنادل...

وہ اپنے خیالوں کے ساتھ اکیلی تھی۔ ناچاہتے ہوئے بھی بار بار اسے کچھ دیر پہلے کا منظر یاد آرہا تھا۔

اس کی ماں... بشریٰ بیگم...

وہ لمحہ جب وہ اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

مسکرا رہی تھیں... مگر وہ مسکراہٹ آنکھوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

عنادل جب آخر میں ان سے ملی تھی، تو ایک نظر میں ہی سب سمجھ گئی تھی۔ کہ امی کافی دیر سے رو رہی تھیں۔

اور ابّو...

وہ بھی صرف اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے مسکرا رہے تھے۔ کیوں؟

یہ بات عنادل سے بہتر کون جان سکتا تھا۔

اس کے دل میں ایک شدید کسک اٹھی۔

اسے بہت برا لگا... کہ کس طرح اس کے سسرال والوں نے اس کے ماں باپ کو وہ مقام، وہ عزت نہیں دی... جس کے وہ حقدار تھے۔

اسی لمحے، ایک حقیقت آہستہ آہستہ اس کے دل پر واضح ہونے لگی۔

زریں بیگم...

جنہیں وہ ہمیشہ "آنٹی" کہہ کر عزت دیتی آئی تھی، اور ان کی بیٹیاں...

وہ ویسی نہیں تھیں جیسا اس نے سوچا تھا۔

ان کے رویوں میں خود غرضی تھی... اور ایک عجیب سا غرور۔

اور ہارون...

وہ بھی بس جاتے ہوئے ایک رسمی سی ملاقات کر کے نکل گیا تھا۔ نہ کوئی ٹھہراؤ... نہ کوئی احساس...

بس ایک فرض سا ادا کیا۔

عنادل نے آنکھیں بند کر لیں، مگر آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

اسے معلوم تھا... جس طرح اس کی امی وہاں ہال میں رو رہی تھیں۔ اسی طرح وہ اس وقت بھی گھر کے کسی کونے میں اکیلی بیٹھی خاموش آنسو بہا رہی ہوں گی۔

یہ خیال ہی اس کے لیے کافی تھا... اس کے دل کو بے چین کرنے کے لیے، اسے اندر تک توڑ دینے کے لیے۔

اسی لمحے اسے موبائل فون کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی۔

کاش...

اس کے پاس فون ہوتا۔

وہ ابھی فوراً امی کو کال کرتی...

ان سے بات کرتی...

اپنا دل ہلکا کر لیتی...

مگر اس کے پاس فون نہیں تھا۔

اور اگر اسے گھر فون کرنا ہوتا، تو اسے ہارون یا زریں بیگم سے کہنا پڑتا۔

زریں بیگم اس وقت آرام کر رہی تھیں...

اور ہارون گھر پر نہیں تھا۔

اور وہ کب تک آئے گا...

یہ بھی معلوم نہیں تھا۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی...

اور عنادل...

وہ اسی طرح خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

بغیر آواز کے...

بغیر کسی سہارے کے۔



آج اسے اس گھر میں آئے چوتھا دن تھا۔

نیچے والے حصے میں ہلکی سی دھوپ کھڑکی سے اندر آ رہی تھی، اور کمرے میں ایک مانوس سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ عنادل اس وقت عروج باجی کے پاس بیٹھی تھی، دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی باتیں چل رہی تھیں۔

عروج کے انداز میں ایک نرمی تھی... ایک اپنائیت، جو عنادل نے پہلے دن ہی محسوس کر لی تھی۔ وہ فروزہ سے بالکل مختلف تھیں۔ جہاں فروزہ کے لہجے میں اکثر سختی اور بے رخی ہوتی، وہیں عروج کے الفاظ میں مٹھاس اور خیال رکھنے کا جذبہ جھلکتا تھا۔

"تم تھک تو نہیں گئیں؟" عروج نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں باجی..." عنادل نے دھیرے سے جواب دیا۔

"آپ کے ساتھ بیٹھ کر اچھا لگ رہا ہے۔" عروج باجی عنادل کی بات پر ہلکا سا مسکرا دیں۔ اور عنادل کے دل میں ایک سکون سا اتر گیا۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا، واقعی... یہ مجھے بہنوں کی طرح ٹریٹ کرتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چند ہی دنوں میں عروج کے قریب محسوس کرنے لگی تھی۔

مگر دوسری طرف...

فروزہ کا رویہ اب بھی اس کے لیے ایک الجھن تھا۔ کبھی کبھی ان کے جملوں میں ایک عجیب سی کاٹ ہوتی، جیسے وہ ہر موقع پر اسے یہ یاد دلانا چاہتی ہوں کہ اسے اس گھر میں لا کر اس پر کوئی احسان کیا گیا ہے۔

یہ بات عنادل کے دل کو چبھ جاتی، مگر وہ خاموش رہتی۔

وہ سیکھ رہی تھی، شاید یہی کہ خاموشی کبھی کبھی سب سے آسان راستہ ہوتی ہے۔

مشتاق انکل کا رویہ البتہ اس کے لیے ایک خوشگوار حیرت تھا۔ وہ اسے اپنی بیٹیوں کی طرح پیار کرتے تھے، بغیر کسی بناوٹ کے، سچے دل سے۔ ان کے چند الفاظ ہی عنادل کے دل کو ہلکا کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔

اور زریں بیگم...

عنادل نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔

وہی زریں بیگم، جنہیں وہ کبھی عزت سے "آنٹی" کہتی تھی... اب جیسے ایک بالکل مختلف روپ میں سامنے آئی تھیں۔ ان کے انداز میں اب وہ نرمی نہیں تھی... بلکہ ایک سختی، ایک حکم چلانے والی کیفیت تھی۔

جیسے کسی انڈین ڈرامہ کی کی بری ساس... عنادل نے ایک ہلکی سی سانس لی۔

اور ہارون... اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ تو اسے سب سے زیادہ پیارا تھا۔

آخر وہ اس کا شوہر تھا... اور عنادل کے دل کے مطابق، ہارون اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسی یقین کے سہارے وہ خود کو مضبوط رکھے ہوئے تھی۔

مگر...

کیا واقعی سب کچھ ویسا ہی تھا

جیسا عنادل سمجھ رہی تھی؟

اس کا جواب ابھی وقت کے پردے میں چھپا ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ آج عجیب سی بے چینی کے ساتھ اپنے والد کے گھر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔اس واقعے کو ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا، مگر ہر گزرتا دن اس کے لیے جیسے ایک نیا بوجھ لے آتا تھا۔

اس دن ہسپتال میں کسی نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔۔۔نہ ڈانٹا، نہ سوال کیا تھا۔مگر منصور صاحب کا یوں اس کی طرف دیکھنا تک گوارا نہ کرنا...یہی چیز کیف کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

پہلے وہ ان کے غصے سے ڈرتا تھا...

اور اب ان کی خاموشی اسے اندر سے توڑ رہی تھی۔

وہ خاموشی، جو الفاظ سے کہیں زیادہ سخت تھی۔

اس دن کے بعد سے آج تک منصور صاحب نے نہ اسے بلایا،

نہ اس کی طرف دیکھا تھا، جیسے وہ اس گھر میں موجود ہی نہ ہو۔

اور یہی رویہ...یہی بے اعتنائی،

کیف کے دل پر ہر لمحہ ایک نیا زخم لگا رہی تھی۔

ہسپتال میں اس کی پھوپھو اس کے ساتھ رہی تھیں۔خاموشی سے، مگر پوری توجہ کے ساتھ۔۔باقی سب تو کچھ دیر بعد ہی چلے گئے تھے۔اور منصور صاحب غصے میں وہاں سے نکل گئے تھے۔

کیف پھوپھو کے سامنے بھی خود کو بہت شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔وہ ان کی آنکھوں میں دیکھنے تک کی بھی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

مگر پھوپھو سب سمجھتی تھیں۔وہ جانتی تھیں کہ وہ اپنی غلطی پر واقعی نادم ہے۔اسی لیے انہوں نے بھی اس معاملے پر اس سے کچھ نہ کہا۔

دو دن بعد جب وہ گھر واپس آئے،

تو کیف کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر ہو چکی تھی۔ مگر دل کی کیفیت ویسی ہی تھی، بوجھل اور بے سکون۔

منصور صاحب کے کہنے پر پھوپھو کچھ دنوں کے لیے وہیں رک گئی تھیں، اور کیف بھی۔

مگر اس سب کے باوجود منصور صاحب نے ایک بار بھی اسے بلانا ضروری نہ سمجھا۔

اور آصفہ بیگم... وہ اس خاموش فاصلے پر دل ہی دل میں خوش تھیں۔

آج کیف نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر آج بھی منصور صاحب نے اسے نہ بلایا، تو وہ خود ان کے پاس جائے گا اور ان سے بات کرے گا اور معافی بھی مانگے گا۔

اسی لیے وہ آج بے چینی سے ان کے گھر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

گھر میں اس وقت صرف پھوپھو، عنایہ اور کیف موجود تھے۔

آصفہ بیگم اپنے بچوں کے ساتھ کسی عزیز دوست کی شادی میں گئی ہوئی تھیں، اور دو دن بعد واپس آنے والی تھیں۔

انہوں نے منصور صاحب کو بھی ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ مگر دفتر کی ایک اہم میٹنگ کی وجہ سے وہ نہیں جا سکے تھے۔

کیف بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا، پھر دروازے کی جانب۔

ہر ہلکی سی آہٹ پر اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھتا۔ جیسے اگلے ہی لمحے وہ آ جائیں گے۔

اس کے ہاتھ بے اختیار آپس میں الجھ رہے تھے، اور ذہن میں وہی ایک جملہ بار بار گونج رہا تھا۔

"مجھے آج ان سے بات کرنی ہے۔۔۔"

مگر دل کے کسی کونے میں ایک خوف بھی تھا۔

"اگر انہوں نے میری بات سننے سے بھی انکار کر دیا تو...؟"

یہ سوچ ہی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے خاموشی سے بیٹھا تھا، مگر اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا۔

پچھتاوے کا...

خوف کا...

اور ایک آخری امید کا۔

منصور صاحب آج ایک اہم میٹنگ کی وجہ سے معمول سے کچھ زیادہ ہی دیر سے آئے تھے۔

رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے جب ایک سیاہ BMW اس محل نما گھر کے بڑے سے گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔

گاڑی کے پہیوں کی ہلکی سی آواز نے گھر کی خاموشی کو چیر دیا۔

کیف اپنے کمرے میں بے چینی سے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی اسے گاڑی کی آواز سنائی دی، وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سینے سے باہر نکل آئے گا۔

ہاتھ ہلکے سے کانپ رہے تھے، اور سانسیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا...

جیسے خود کو حوصلہ دے رہا ہو۔

"مجھے آج ان سے بات کرنی ہے..." اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

ڈر تھا... بہت زیادہ ڈر، مگر اس سے بھی زیادہ ایک بوجھ تھا، جو وہ اب مزید اپنے اندر نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ہر قدم جیسے کسی امتحان کی طرف لے جا رہا ہو۔

باہر سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی... اور ساتھ ہی قدموں کی چاپ۔

کیف دروازے کے قریب رک گیا۔ اس کے ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر ٹھہر گئے۔ ایک لمحے کے لیے اس نے آنکھیں بند کیں، گہری سانس لی... اور پھر دروازہ کھول دیا۔

جو بھی ہونا تھا... اب وہ اس سے بھاگنے والا نہیں تھا۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں چند ضروری کاغذات سمیٹ رہے تھے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"آجائیں..." انہوں نے نظریں فائل سے ہٹائے بغیر کہا۔

دروازہ کھلا، اور اگلے ہی لمحے جو اندر آیا، اس کی انہیں توقع نہ تھی۔ وہ چونک کر کھڑے ہو گئے۔

"کوئی کام ہے تو پھوپھو سے کہو..." انہوں نے روکھے لہجے میں کہا۔

"پاپا..." کیف کی مدھم سی آواز کمرے کی فضا میں گم ہو گئی۔

"بولو۔" منصور صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

کیف نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں جھکا لیں، پھر جیسے ہمت سمیٹ کر بولا۔

"پاپا مجھے معاف کر دیں... میں اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوں..." اس کی آواز لرز رہی تھی، اور آنکھوں میں نمی صاف جھلک رہی تھی۔

مگر منصور صاحب خاموش رہے۔ کمرے میں ایک بھاری سی خاموشی پھیل گئی۔

چند لمحوں بعد انہوں نے سرد لہجے میں کہا،

"اپنا سامان تیار کرو۔ اگلے ہفتے تمہاری ترکی کی فلائٹ ہے۔

وہیں جا کر اپنی باقی تعلیم مکمل کرو گے۔" کیف کا دل جیسے ڈوب گیا۔

"پاپا میں ترکی نہیں جانا چاہتا... مجھے آپ کے پاس رہنا ہے..." آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"نہیں..." ان کی آواز میں فیصلہ واضح تھا۔

"اپنے پاس رکھ کر انجام دیکھ چکا ہوں، اسی لیے تمہیں خود سے دور بھیج رہا ہوں۔"

"پاپا پلیز... ایسا نہ کریں... میں واقعی دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروں گا..." اب اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی، اور آنسو بے اختیار بہہ رہے تھے۔

منصور صاحب کا صبر جیسے ٹوٹ گیا۔ انہوں نے فائل میز پر رکھ دی اور سخت لہجے میں بولے۔

"غلطی تم نے نہیں کی، کیف... غلطی میں نے کی ہے، تم پر بھروسا کر کے!" انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تم نے کہا لاہور میں پڑھنا ہے، میں نے مان لیا۔ تم نے کہا یہاں ہمارے ساتھ نہیں رہنا، میں نے مان لیا۔ ہر خواہش پوری کی تمہاری...اور بدلے میں تم نے کیا دیا؟

میرا بھروسا توڑ دیا!" ان کی آواز اب بلند ہو چکی تھی۔

"پتا ہے تمہیں؟ جس کلب میں تم نشہ کرتے ہوئے پائے گئے...وہاں پولیس والوں کا چھاپہ پڑا تھا! وہ تو تمہاری قسمت اچھی تھی کہ کوئی بھلا انسان تمہیں وقت پر ہسپتال لے آیا۔ نہ صرف تمہیں اس منظر سے بچایا بلکہ تمہاری جان بھی بچائی۔

اور جب ڈاکٹر کو پتا چلا کہ تم منصور اعوان کے بیٹے ہو..." انہوں نے ایک لمحے کے لیے رک کر تلخی سے کہا۔

"تمہیں اندازہ بھی ہے مجھے کتنی شرمندگی ہوئی؟ میں ایک عزت دار آدمی ہوں...اور میرا بیٹا ایسی گھٹیا حرکتوں میں ملوث ہو اس سے بڑھ کر میرے لئے اور کیا شرمندگی ہو گی!"

'پاپا...آئی ایم ریلی سوری..." کیف اب ایک بچے کی طرح رو رہا تھا۔

"پاپا میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا...پلیز مجھے معاف کر دیں..."

"بس!" انہوں نے سختی سے روکا۔

"جو کہا ہے وہ کرو اور یہاں سے جاؤ۔ مجھے مزید کچھ نہیں سننا۔" وہ مڑنے لگے۔

مگر اسی لمحے کیف کے لبوں سے ایک جملہ نکل گیا، جو شاید اسے خود سے بھی نہیں کہنا چاہیے تھا۔

"پاپا...آپ سب سے محبت کرتے ہیں، بس کیف سے نہیں کرتے..." منصور صاحب ایک لمحے کو ٹھہر گئے۔ مگر پیچھے مڑے بغیر کہا،

"دفع ہو جاؤ، کیف..."

کیف کی ہچکیاں تیز ہو گئیں۔ آنکھوں سے آنسو بے قابو ہو چکے تھے۔

"اچھا ہوتا۔۔۔ میں وہیں مر جاتا..." وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

اگلے ہی لمحے۔۔۔

منصور صاحب پلٹے، اور ایک زوردار تھپڑ اس کے دائیں گال پر رسید کیا۔ آواز کمرے میں گونج گئی۔

کیف لڑکھڑا گیا...

اور چند قدم پیچھے ہو کر دیوار سے جا لگا۔

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ مگر اس بار یہ خاموشی صرف خاموش نہیں تھی... یہ ٹوٹے ہوئے رشتوں کی گواہی دے رہی تھی۔

"بس... اب یہی دن دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔" ان کی آواز میں تھکن بھی تھی اور ٹوٹا ہوا غرور بھی۔

"تمہیں اپنے پاس اسی دن کے لیے رکھا تھا کہ ایک دن تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ...؟"

کیف کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو چکی تھیں۔ ہونٹ کانپ رہے تھے، مگر دل میں دبے لفظ آج جیسے خود راستہ بنا رہے تھے۔

"اپنے پاس ہی تو نہیں رکھا، پاپا..." یہ جملہ اس کے لبوں سے بے اختیار ادا ہوا۔

منصور صاحب کی آنکھوں میں ایک لمحے کو سختی اور گہری ہو گئی۔

"کیا چاہتے ہو تم؟"

"اپنی اس ماں کی طرح مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟ بولو!" اب ان کی آواز میں صرف غصہ نہیں تھا، ایک پرانا زخم بھی بول رہا تھا۔

کیف کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔ وہ جو برسوں سے دبائے بیٹھا تھا، آج زبان پر آ گیا۔

"آپ کو میری ماں کبھی عزیز نہیں تھی..."

"اور نہ میں..."

"آپ کو صرف آصفہ آنٹی اور ان کی اولاد عزیز ہے۔"

اگلے ہی لمحے، ایک تیز آواز کمرے میں گونجی۔

تھپڑ کی شدت سے کیف کا سر ایک طرف کو جھٹکا کھا گیا۔ مگر اس بار وہ سنبھل نہ سکا۔ اس کی ٹانگوں نے جیسے جواب دے دیا، اور وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔

کمرہ خاموش ہو گیا۔

آنکھوں سے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے،

مگر آواز...

وہ کہیں کھو گئی تھی۔ جیسے لفظ ختم ہو چکے ہوں۔ منصور صاحب نے سرد نگاہ سے اسے دیکھا،

"دفع ہو جاؤ...اور آج کے بعد مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔"

وہ مڑ کر دروازے کی طرف بڑھے۔ پھر ایک لمحے کو رکے، مگر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

"تیاری کر لو...اگلے ہفتے تم ترکی جا رہے ہو۔"

یہ ان کا آخری حکم تھا۔ سخت، بے رحم، اور حتمی۔

دروازہ کھلا...اور پھر بند ہو گیا۔

کمرے میں صرف خاموشی رہ گئی۔ اور زمین پر بیٹھا ایک لڑکا، جو ٹوٹ چکا تھا۔

کیف نے آہستہ سے سر جھکا لیا۔ آنسو اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے زمین پر گر رہے تھے۔ مگر اب وہ رو بھی نہیں رہا تھا۔ کیونکہ بعض اوقات درد اتنا بڑھ جاتا ہے، کہ آنسو بھی بے اثر ہو جاتے ہیں۔

اور ہمیشہ کی طرح، وہ ایک بار پھر اکیلا رہ گیا تھا۔ بلکل اکیلا۔



گھٹنوں میں سر چھپائے، بازوؤں کا دائرہ اپنے گرد بنائے، وہ اسٹور روم کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اور کسی چھوٹے بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

وہ اس وقت بیس سال کا نوجوان نہیں لگ رہا تھا بلکہ وہی گیارہ سال کا معصوم کیف تھا۔ جو ہمیشہ اسی طرح اپنی قسمت پر آنسو بہایا کرتا تھا۔

وہی کونا...

وہی درد...

وہی آنسو...

بس فرق صرف وقت کا آ گیا تھا۔

اور وقت کا کیا ہے وہ تو گزر ہی جاتا ہے، بس درد باقی رہ جاتا ہے۔

اس کی سسکیاں پورے وجود کو ہلا رہی تھیں۔ وہ زور زور سے رو رہا تھا، جیسے برسوں کا دبایا ہوا دکھ آج بہہ نکلنا چاہتا ہو۔

وہ ہمیشہ رونے کے لیے اسی جگہ کو چنتا تھا۔ کیونکہ یہاں اس کی آواز کسی تک نہیں پہنچتی تھی۔ آنکھیں مسلسل رونے سے سوجھ چکی تھیں، ناک سرخ ہو گئی تھی، اور چہرے کی سفیدی زردی میں بدل گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ آنکھوں میں بے بسی، تھکن اور ایک گہرا سوال تھا۔

"آخر میں اتنا بدقسمت کیوں ہوں، اللہ پاک...؟" اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

ہر بار درد مجھے ہی کیوں ملتا ہے؟

کوئی مجھے سمجھتا کیوں نہیں ہے؟

پاپا مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتے؟

وہ ایک لمحے کو رکا۔ سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

"میں... میں اس دنیا میں بہت اکیلا ہوں۔" اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"نہ میرے پاس ماں کا پیار ہے اور نہ باپ کا۔" آنکھوں سے آنسو پھر بہنے لگے۔

"جب میں دوسروں کے ماں باپ کو دیکھتا ہوں تو میرے دل میں درد ہوتا ہے۔ میں بھی تو آپ ہی کا بندہ ہوں اللہ پاک، پھر میرے پاس وہ سب کیوں نہیں...؟" اس کی آواز اب بمشکل سنائی دے رہی تھی۔

آپ کو پتہ ہے اللہ پاک آصفہ انٹی نے مجھے سب بتادیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتادیا تھا کہ میری ماما مر چکی ہیں۔ اللہ پاک آپ مجھے بھی میری ماما کے پاس بھیج دیں۔

"مجھے نہیں رہنا یہاں... مجھے اپنے پاس بلالیں۔ یہاں کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ سب... سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اللہ پاک اپنے کیف کو اپنے پاس بلالیں۔"

کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔ گہری، بوجھل، اور ٹوٹے ہوئے دل کی گواہ۔

وہ وہیں بیٹھا تھا... مگر جیسے اندر سے خالی ہو چکا تھا۔



یہ بات دو ہفتے بعد کی تھی۔

عنادل معمول کے مطابق ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ گھر میں ہلکی ہلکی باتوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، جبکہ ملازمین اِدھر اُدھر مصروف تھے۔

تبھی اس کی نظر زریں بیگم پر پڑی۔

وہ کچھ نئے جوڑے گھر کے ملازمین میں تقسیم کر رہی تھیں۔

عنادل نے پہلے تو خاص دھیان نہیں دیا، مگر اگلے ہی لمحے اس کی نظریں اُن کپڑوں پر جم گئیں۔ وہ چونک گئی۔ یہ وہی جوڑے تھے۔ جو اس کے گھر والوں نے محبت سے ان کے لیے خریدے تھے۔

اس کے دل میں جیسے کسی نے چبھتا ہوا کانٹا اتار دیا ہو۔

وہ چند لمحے خاموش بیٹھی رہی، پھر بے اختیار بول پڑی،

"آنٹی... یہ جوڑا تو امی نے آپ کے لیے بڑے پیار سے خریدا تھا۔" زریں بیگم نے ایک بے پرواہ سی نظر اس پر ڈالی۔

"میری بات سنو عنادل، بندے کو کوئی چیز کسی کو دینے سے پہلے اُس کی حیثیت دیکھنی چاہیے کہ وہ کیا چیز کسے دے رہا ہے۔" عنادل کا دل جیسے ایک لمحے کو رک گیا۔

"بھئی ہم تو اِس طرح کے کپڑے پہننا پسند ہی نہیں کرتے۔"

پیچھے سے آتی فروزہ کی آواز بھی گونجی۔

وہ شاید ہمیشہ کی طرح اُسے خود سے کم تر محسوس کروانا چاہتی تھی۔

عنادل خاموش ہو گئی۔ ہر بار کی طرح۔ اس کے گلے سے اگلا نوالہ نہ اتر سکا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور برتن سمیٹنے لگی۔

بشریٰ بیگم نے عنادل کے سسرال میں سب کے لیے جوڑے خریدے تھے۔ اور ہر جوڑا پانچ ہزار سے اوپر کا تھا۔ شاید وہ اپنے حالات کے مطابق اتنا ہی کر سکتی تھیں۔

مگر وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ، بے عزت لوگوں کو عزت راس نہیں آتی۔ اور اس کی سب سے بڑی مثال...

زریں بیگم اور ان کے بگڑے ہوئے بچے تھے۔

پھر اس واقعے کے دو دن بعد، زریں بیگم اور عروج نے عنادل سے پوچھا کہ اُس نے وہ لہنگا کیوں نہیں پہنا جو انہوں نے اسے دیا تھا۔

خاص طور پر وہ لہنگا۔۔۔

جو فروزہ نے بڑے شوق سے عنادل کے لیے پسند کیا تھا۔

عنادل خاموش ہو گئی۔

وہ لہنگا کسی پرانے زمانے کا بے جان ٹکڑا لگتا تھا۔

جس میں نہ خوبصورتی تھی،نہ نفاست،نہ وہ احساس،جو ایک دلہن اپنے خاص دن پر محسوس کرنا چاہتی ہے۔

عنادل کو آج بھی یاد تھا جب اُس نے وہ لہنگا پہلی بار دیکھا تھا۔

"امی... میں یہ لہنگا نہیں پہن سکتی۔یہ واقعی بہت برا لگ رہا ہے..." وہ دھیرے سے بولی تھی۔اور وہ غلط بھی نہیں تھی۔

آخر وہ اُس کی زندگی کا سب سے خاص دن تھا،وہ اُس دن سب سے پیاری لگنا چاہتی تھی۔

بشریٰ بیگم نے اُسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

زریں آنٹی سے پوچھ لو بیٹا۔اور جب عنادل نے زریں بیگم سے بات کی تھی،تو ان کا جواب صرف یہ تھا۔

"ٹھیک ہے،پھر خود خرید لو۔"اور آخر کار عنادل نے ایسا ہی کیا تھا۔

مگر آج...وہی لوگ اسے طعنے دے رہے تھے۔

"جب کوئی انسان کسی کو کوئی چیز دل سے دیتا ہے،تو اُس میں نقص نہیں نکالنے چاہئیں۔"عروج بولی۔

اسی لمحے عنادل کو وہ کپڑے یاد آئے...

جو اس کی ماں نے دل سے اِن لوگوں کو دیے تھے۔

تو پھر انہوں نے کیا کیا تھا؟

انسان واقعی عجیب ہوتے ہیں وہ اپنی غلطیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں،مگر دوسروں کی ایک چھوٹی سی بات کو جرم بنا دیتے ہیں۔

ہر بات میں وہ اس کی امی کو درمیان میں کیوں لے آتی تھیں؟

کیوں ہر بار اُسے اور اُس کے گھر والوں کو کم تر محسوس کروایا جاتا تھا؟عنادل کو بہت دکھ ہوتا تھا۔

اور دوسری طرف...ہارون کے لیے ہمیشہ صرف اس کی امی اور فروزہ باجی ہی درست تھیں۔اور باقی سب غلط۔،ہمیشہ۔

اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔پھر آخر کار وہ دن بھی قریب آگیا۔جب عنادل نے اپنی امی اور ابو کو الوداع کہا اور اپنے شوہر کے ساتھ دبئی چلی گئی۔

وہ کتنی خوشی سے گئی تھی۔اس امید کے ساتھ کہ شاید وہاں جا کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر، شاید عنادل سے بڑا کوئی بے وقوف نہیں تھا۔



کچھ سال بعد...

استنبول(ترکی)

آج اس شہر میں ایک مختلف ہی جوش و خروش تھا۔

ترکش ڈرفٹ چیمپین شپ کاانعقاد کیا گیا تھا۔جسے TOSFED کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔

ریس ٹریک کے گرد ہر طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ہر طرف شور، جوش اور ایڈرینالین کی لہر دوڑرہی تھی۔

انجنوں کی گرج، ٹائروں کی چیخ اور دھوئیں کے مرغولے...یہ سب مل کر ایک ایسا منظر تخلیق کر رہے تھے جو صرف دیکھا نہیں، محسوس کیا جاسکتا تھا۔

کاریں بجلی کی طرح تیزی سے مڑتی تھیں، سڑک پر پھسلتی ہوئی ایک دوسرے کے قریب سے گزرتیں، جیسے کسی خطرناک رقص میں مگن ہوں۔ ہر ڈرائیور اپنی مہارت کا مظاہرہ کر رہا تھا، ہر موڑ پر خطرہ تھا اور ہر لمحے میں جیتنے کی ضد۔

اسی ہجوم کے درمیان ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب ایک کار نے تیز رفتاری سے گھومتے ہوئے ایسا ڈرفٹ لیا کہ دھواں چاروں طرف پھیل گیا۔ لمحہ بھر کو سب کچھ دھندلا گیا، پھر جیسے ہی دھواں چھٹا، وہ گاڑی بالکل سیدھی کھڑی تھی۔

تماشائیوں کی تالیاں اور نعروں کی آوازیں فضا میں گونج اٹھیں۔

"کمال کر دیا اوزل"

"اوزل میران"

"اوزل میران"

اب اس ڈرفٹر کہ باقی ساتھی خوشی سے اس کے نام کا نعرہ لگا رہے تھے۔

"اس بار تو جیت پکی اوزل کی ہی ہے۔۔۔"اب اس کے باقی فینز بلند آواز میں نعرہ لگا رہے تھے۔

تماشائیوں کا شور اور گاڑیوں کی گرج فضا میں ایک عجیب سا جوش بھر رہی تھی۔ اسی ہجوم کے درمیان ایک چمکتی ہوئی Toyota Supra MK4 اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔

ڈرائیور نے آہستہ سے رفتار بڑھائی...انجن کی گہری آواز ماحول میں گونجنے لگی۔ اگلے ہی لمحے گاڑی تیزی سے آگے بڑھی۔ سب کو لگا کہ وہ عام انداز میں موڑ لے گا، لیکن اچانک منظر بدل گیا۔

اس نے ایک جھٹکے سے اسٹیئرنگ مخالف سمت میں موڑا۔

گاڑی موڑ میں داخل ہونے سے پہلے ہی الٹی سمت میں پھسل گئی۔

یہ تھا Backward Entry Drift کا کمال۔

ٹائروں سے دھواں اٹھا، زمین پر ربڑ کی تیز خوشبو پھیل گئی، اور ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے گاڑی قابو سے باہر ہو مگر حقیقت میں سب کچھ مکمل کنٹرول میں تھا۔

گاڑی کا پچھلا حصہ دیوار کے اتنا قریب سے گزرا کہ جیسے فاصلے کا وجود ہی نہ ہو، تماشائیوں کی سانسیں تھم گئیں۔

اسٹیئرنگ کی ہلکی سی حرکت...رفتار کا نازک توازن...اور وہی ناممکن سا منظر ایک شاہکار میں بدل گیا۔

پھر اچانک ایک نہایت نرم انداز میں گاڑی سیدھی ہوئی اور موڑ مکمل کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پورا میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔

وہ صرف ایک کرتب نہیں تھا۔ وہ مہارت، ہمت اور مکمل قابو کا ایسا مظاہرہ تھا جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

وہ لوگ جو پہلے اوزل کے نام کا نعرہ لگا رہے تھے اب وہ اس دوسرے ڈرائیور کے نام کا نعرہ لگانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ آخر وہ ڈرائیور تھا کون؟ یہ جاننے کے لیے سب لوگ بے تاب تھے۔

"امپاسیبل!"۔۔۔آئی کینٹ بلیو، اس نے تمہیں ہرا دیا۔ اوزل کی ایک ساتھی دوست جو پہلی بار اوزل سے زیادہ کسی اور سے متاثر ہوئی تھی۔

"ڈیم اٹ!" اوزل نے غصے سے اپنے دانت پیسے۔

"Seriously, it was a wild card entry!"

اوزل کا دوسرا دوست اس کی ساتھی دوست کی بات پر متفق ہوتے ہوئے بولا۔

اوزل اپنی ہار سے جل اٹھا، وہ چاہ کر بھی اس ڈرائیور کی ڈرفٹ سے کوئی ایسی غلطی نہ نکال سکا جس پر وہ اس کا مذاق بنا سکتا۔ وہ تھی ہی اتنی پرفیکٹ!

اوزل سمیت وہاں پر موجود تمام لوگ اب اس ڈرائیور کا چہرہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھے، جو اب اس گاڑی سے باہر آنے والا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سپر کار آہستہ سے رکی اور اگلے ہی لمحے اس کا دروازہ کھلا۔

ایک لمحے کی خاموشی...

اور پھر وہ باہر نکلا۔

چھ فٹ سے نکلتا دراز قد، مضبوط اور متوازن جسامت۔ اس کے بال پیشانی پر بے ترتیب بکھرے ہوئے تھے۔ مگر اسی میں ایک عجیب سی کشش تھی۔

اس نے سادہ مگر بے حد اسٹائلش لباس پہن رکھا تھا۔ بلیک سلیو لیس شرٹ، جو اس کی فٹ باڈی کو نمایاں کر رہی تھی اور لائٹ کریم کلر کی لوز پینٹ، جو اسے ایک کیژول مگر ایلیگنٹ لک دے رہی تھی۔ کلائی پر سلور واچ کی ہلکی سی چمک، جیسے اس کے پورے انداز کو مکمل کر رہی ہو۔

وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر ایک لمحے کو رکا...

نگاہیں نیچی، اور ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ۔

بس...

اتنا ہی کافی تھا۔

وہاں موجود ہر لڑکی کی نظریں اسی پر جم گئیں۔ کسی نے بے اختیار سانس تھام لی، کسی نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

"واہ..."

"کون ہے یہ؟"

"او مائی گاڈ..."

سرگوشیاں فضا میں پھیل گئیں۔

کیا باڈی تھی اور کیا خوبصورتی۔

لوگ اسے دیکھتے ہی اس کے نام کی ہوٹنگ کرنے لگے۔شور بڑھتا گیا، جیسے اس کی آمد نے پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔

وہ بے نیازی سے سیدھا کھڑا تھا جیسے یہ سب اس کے لیے معمول ہو۔

اور سچ تو یہ تھا۔آج کے مقابلے کا فاتح کون ہوگا، یہ اعلان کرنے کی شاید کوئی خاص ضرورت ہی نہیں تھی۔

سب جانتے تھے یہ جیت اسی کے نام ہونے والی ہے۔

ٹرافی ہاتھ میں تھامے وہ اب اپنے مداحوں کے ساتھ تصویریں بنوا رہا تھا۔کیمروں کی فلیش لائٹس بار بار چمک رہی تھیں، مگر اس کے چہرے پر ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ تھی نہ زیادہ خوشی، نہ کوئی غرور۔بس ایک پُر سکون اعتماد۔

دور کھڑا اوزل دل میں عجیب سی جلن لیے یہ سب دیکھ رہا تھا۔اس کی نظریں بار بار اسی پر جا کر رک جاتی تھیں۔

"دیکھو تو ذرا... مجال ہے جو ایک بار بھی کھل کر مسکرا دے۔اور ایک ہم ہیں جو ہار کر بھی مسکراتے رہتے ہیں۔"

اس کا اسسٹنٹ سامنے کھڑے اس لڑکے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ جس پر اوزل نے اسے ایسی نظر سے دیکھا کہ وہ فوراً خاموش ہو گیا۔

اوزل نے گہری سانس لی اور پھر اس کی طرف بڑھ گیا۔

"ہائے، میرا نام اوزل میران یلدرز ہے۔"اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، برابر میں کھڑے بُراق نے ہنستے ہوئے کہا۔

"گُڈ... اگر آپ کو بھی تصویر چاہیے تو پیچھے لائن میں لگ جائیں، اپنی باری کا انتظار کریں۔" اس نے وہاں موجود لمبی لائن کی طرف اشارہ کیا۔

وہ لڑکا اب بھی خاموش تھا۔ جیسے اوزل کی موجودگی اس کے لیے کوئی معنی ہی نہ رکھتی ہو۔اس نے اسے مکمل نظرانداز کر دیا تھا

۔

یہ بات اوزل کے لیے کافی تھی۔ غصہ اور شرمندگی، دونوں ایک ساتھ اس کے اندر بھڑک اٹھے۔وہ پلٹا اور واپس اسی جگہ آ گیا جہاں سے آیا تھا۔

اب وہ ایک کار کے پاس کھڑا تھا، جب اس نے دیکھا وہی ڈریفٹر اب اسی کی جانب آ رہا تھا۔اوزل سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔وہ لڑکا اس کے قریب آ کر رکا۔

"ہائے، میرا نام اوزل میران یلدرز ہے۔" اوزل نے ایک بار پھر ہاتھ بڑھایا۔

"تم مجھے یہ بات پہلے بھی بتا چکے ہو۔" وہ اپنے بازو سینے پر باندھے، سامنے کھڑے اس بیس سالہ لڑکے سے مخاطب ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

اوزل کے چہرے پر ناگواری اب واضح تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"کیا میں جان سکتا ہوں تمہارا نام کیا ہے؟" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

"میرا نام کیف منصور ہے۔" اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"اور دوسری بات میں تمہارے بڑے بھائی کی عمر کا ہوں، اس لیے آئندہ مجھے 'تم' کی بجائے 'بھائی' کہہ کر پکارنا۔" اس کے لہجے میں نہ غرور تھا نہ غصہ۔ بس ایک واضح حد تھی، جو اس نے کھینچ دی تھی۔

کیف نے ہلکا سا اشارہ کیا، جیسے اسے راستہ دینے کو کہہ رہا ہو۔

پھر وہ مڑا...

اپنی سپر کار میں بیٹھا...

اور پلک جھپکتے ہی وہاں سے غائب ہو گیا۔

"بھائی مائی فُٹ!" اوزل اس کے جانے کے بعد غصے سے بڑبڑایا۔

اور دوسری طرف، بُراق پوری طرح سے مصروف تھا۔ آس پاس کھڑی لڑکیوں کو مسکراتے ہوئے اپنا فون نمبر دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی صاف جھلک رہی تھی۔



بارش سے بھیگی ہوئی شام میں وہ عمارت دور سے ہی نمایاں نظر آتی تھی۔ نہ بہت بلند، نہ بہت شاندار۔ مگر اپنے اندر ایک عجیب سی سنجیدگی سمیٹے ہوئے تھی۔

"حقیقت پوسٹ" کا دفتر استنبول کے قدیم علاقے بی اوغلو کی ایک تنگ اور پُرانی گلی میں واقع تھا۔

باہر سے دیکھنے پر یہ تین منزلہ، قدرے پرانی عمارت معلوم ہوتی تھی۔ دیواروں پر وقت کے نشان، اور کھڑکیوں کے گرد ہلکی سی زنگ آلود جالیاں موجود تھیں۔

دروازے کے اوپر ایک سادہ سا بورڈ لگا تھا، جس پر سفید حروف میں لکھا گیا تھا۔ "حقیقت پوسٹ "

کوئی چمک دمک نہیں۔۔۔

کوئی نمود و نمائش نہیں...

مگر اندر جانے والے جانتے تھے یہ جگہ خاموش نہیں۔

دروازہ کھولو تو ایک تنگ سا راہداری نما حصہ سامنے آتا تھا۔ جہاں دیواروں پر پرانی خبروں کے تراشے لگے تھے۔ جن میں سے کچھ زرد ہو چکے تھے، اور کچھ مڑ چکے تھے۔

دائیں جانب ایک چھوٹا سا استقبالیہ تھا۔ ایک سادہ سی میز، پرانا کمپیوٹر، اور فائلوں کا ایسا انبار جو بظاہر بے ترتیب تھا مگر در حقیقت اپنی ہی ترتیب رکھتا تھا۔ یہاں آنے والا ہر شخص سب سے پہلے اسی خاموش نظم سے متعارف ہوتا۔

پھر لکڑی کی سیڑھیاں اوپر کی طرف جاتی تھیں۔ ہر قدم کے ساتھ ایک ہلکی سی چرچراہٹ گونجتی تھی۔

اس عمارت کی پہلی منزل پر اصل نیوز روم تھا۔

دروازہ کھلتے ہی ایک اور ہی دنیا سامنے آتی۔ یہاں خاموشی نہیں تھی۔ یہاں زندگی شور کی شکل میں موجود تھی۔ کی بورڈز کی تیز ٹک ٹک، فونز کی مسلسل گھنٹیاں، اور رپورٹرز کی جلدی جلدی باتیں سب کچھ ایک بے قابو مگر منظم ہنگامے میں ڈھلا ہوا تھا۔

ہر میز پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے، لیپ ٹاپس کھلے تھے، اور دیواروں پر بڑے بڑے بورڈ لگے تھے جن پر نقشے، تصاویر اور سرخ دھاگوں سے جڑی ہوئی کہانیاں کسی پیچیدہ راز کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔

کونے میں شیشے کا ایک کیبن تھا۔ آدھا بند، اور آدھا کھلا۔

یہ مراد دمیر کا کمرہ تھا۔ (سینیئر انویسٹیگیٹر)

اندر روشنی کم تھی، مگر موجودگی بھاری۔ دیواروں پر فائلز، رپورٹس اور کیسز کے ڈھیر تھے۔

اسی عمارت کی دوسری منزل پر ایک لمبی خاموش راہداری کے آخر میں ایک دروازہ تھا۔ دروازے پر لگی چھوٹی سی تختی پر نفیس حروف میں لکھا تھا۔

"Kaif Mansoor– junior investigator Reporter.“‘"

یہ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا، مگر اس کی بناوٹ میں ایک عجیب سی ترتیب اور سنجیدگی تھی۔ چار دیواروں میں سے دو ٹھوس تھیں۔ سفید، سادہ، اور بے نقش۔

تیسری دیوار آدھی شیشے کی تھی، جس پر ہلکی سی دھند جمی رہتی تھی، جس وجہ سے باہر کی دنیاد کھائی دیتی بھی تھی اور نہیں بھی۔

چوتھی دیوار پر ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا جو اس کمرے کی اصل روح تھا۔ کمرے کے عین درمیان ایک سادہ مگر مضبوط لکڑی کی میز رکھی تھی، جس پر ضرورت کے مطابق ہی چیزیں موجود تھیں۔

ایک لیپ ٹاپ...

چند فائلیں...

ایک بند نوٹ بک...

اور ایک قلم۔۔۔

جو اکثر اس کی انگلیوں کے درمیان خاموشی سے گھومتا رہتا تھا۔ میز کے پیچھے کرسی اس طرح سے رکھی گئی تھی کہ سامنے والا ہر شخص اس کے عین مقابل ہو۔

دیوار پر لگا بورڈ، وہ سب سے نمایاں چیز تھا۔ اس پر مختلف کیسز کی تصاویر، نام، اور تاریخیں موجود تھیں اور ان سب کو آپس میں جوڑتے سرخ دھاگے۔ اور کچھ جگہیں خالی بھی تھیں

کمرے کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی شیلف تھی جس میں چند کتابیں ترتیب سے رکھی گیئں تھیں۔ جرم، نفسیات، اور انسانی رویوں پر مبنی کتابیں۔

چھت پر لگی ہلکی سی سفید روشنی پورے کمرے کو روشن رکھتی، مگر اصل روشنی ایک چھوٹے سے لیمپ سے آتی تھی

جو رات کے وقت اس کی میز پر جلتا رہتا تھا اور اس مدھم روشنی میں یہ کمرہ مزید سنجیدہ اور گہرا ہو جاتا تھا۔

اور آخر میں ایک کھڑکی کمرے کے ایک طرف تھی جہاں سے شہر کی دور دور تک پھیلی روشنیاں دکھائی دیتیں تھیں۔



ہر طرف مختلف فائلیں میز پر بکھری ہوئی تھیں۔کچھ کھلی ہوئیں، کچھ آدھی بند،اور کچھ پر سرخ مارکر سے نشان لگے ہوئے تھے۔

مراد دیمیر اپنی میز کے سامنے جھکے کسی فائل کا بغور جائزہ لے رہے تھے،جب باہر دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"آجایئے۔"انہوں نے نظریں اٹھائے بغیر مصروف انداز میں کہا۔

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا،اور کیف اندر داخل ہوا۔

"سر آپ نے مجھے بلایا تھا؟"مراد دیمیر نے اب نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاں کیف، شکر ہے تم آگئے۔جو رپورٹ بنانے کا کام دیا تھا،وہ مکمل ہوا یا نہیں؟"

"جی سر،بس چند پوائنٹس باقی ہیں۔آج مکمل کر دوں گا،کل صبح آپ کو مل جائے گی۔"

"گڈ"انہوں نے مختصر جواب دیااور سامنے پڑی کچھ فائلیں سمیٹنے لگے۔

کیف کی نظریں غیر ارادی طور پر ان فائلوں پر چلی گئیں۔ہر فائل پر الگ نام،الگ تصویر۔مگر سب میں ایک عجیب سی سنجیدگی مشترک تھی۔

"سر... یہ کوئی نیا کیس ہے؟"اس نے تجسس سے پوچھا۔

مراد دیمیر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"ہاں کیف اور کافی کمپلیکس بھی ہے۔فی الحال تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔"پھر انہوں نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھو کھڑے کیوں ہو؟"

کیف خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

مراد دیمیر نے ایک فائل کھولی۔ایک قابل پولیس افسر جو دو ہفتے پہلے اپنی فیملی کے ساتھ اٹلی وکیشنز گزارنے کے لیے گیا تھا اسکا کسی نے وہیں بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔اب ان کی آواز سنجیدہ ہو گئی تھی۔

اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ جہاں مرڈر ہوا ہے وہاں سے کسی بھی قسم کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملا۔اٹالین پولیس اب تک بلینک ہے۔کیف اب پوری توجہ سے سن رہا تھا۔

ایک ہفتے کی انویسٹیگیشن کے بعد کل ان کی باڈی ترکی پہنچا دی گئی ہے۔اور پوسٹ مارٹم کے لیے ہاسپٹل منتقل دی گئی ہے۔شاید کل دوپہر تک رپورٹ آجائے۔

انہوں نے فائل بند کی اور تھکے ہوئے انداز میں سانس لی۔اور "یہ کیس انویسٹیگیٹ کرنے کے لیے ہمیں اسائن کیا گیا ہے۔"کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی چھاگئی۔

"اوپر سے پہلے ہی ہم ہماپروین والے کیس میں ابھی تک کوئی خاص ثبوت نہیں ڈھونڈ پائے...

اوراب یہ نیامسئلہ۔"ان کے لہجے میں دبی ہوئی پریشانی صاف محسوس ہورہی تھی۔

"اوراگریہی حال رہانہ توکہیں ریزگنیشن لیٹرنہ مل جائے مجھے!"کیف نے پہلی باران کی آنکھوں تھکن دیکھی۔

"ڈونٹ وری سر۔"وہ نسبتاًنرم لہجے میں بولا۔

میں آج ہی اس کیس کی رپورٹ مکمل کردوں گااورکل سے ہم اپنی پوری توجہ اس نئے کیس پردیں گے۔

"ٹھیک ہے کیف"مراددیمیرنے اپناسراثبات میں ہلایا۔

"اوکے سرا گرآپ اجازت دیں تومیں جاکراپناکام مکمل کرلوں؟"کیف چیئرسے کھڑاہوتے ہوئے بولا۔

"شیور۔"

کیف کرسی سے اٹھااور دروازے کی جانب بڑھا۔اس نے دروازے کی ناب گھمائی ہی تھی کہ پیچھے سے مراد دیمیر کی آواز ابھری۔

"ویسے کیاڈرفٹ ماری تھی تم نے!"کیف ایک لمحے کورکا۔

"میں نے پوری ویڈیودیکھی تھی۔"مراددیمیراب ہلکاسامسکرارہے تھے۔

کیف کے ہونٹوں پربھی مدھم سی مسکراہٹ آئی اور حقیقت یہ تھی کہ وہ بہت کم مسکراتا تھا۔اس لیے اس کا مسکرانا کسی معجزے سے کم نہیں لگتا تھا۔

"تھینک یو، سر۔"

"ایک باریہ کیس سالوہوجائے پھرمجھے بھی تم اپنی جیسی ڈرفٹنگ سکھانا۔"مرادمیرنے بازوباندھتے ہوئے کہا۔

کیف کی آنکھوں میں پہلی بارہلکی سی چمک آئی۔

"شیور، سر۔"

اور پھر وہ خاموش قدموں سے اپنے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔اُسے بالکل اندازہ نہیں تھاکہ یہ نیاکیس اس کی زندگی کارخ بدلنے والاہے۔

کیف اپنے کیبن میں آیا اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا۔ کیف نے اپنے بائیں جانب والی دراز کو ایک مخصوص چابی کی مدد سے کھولا اور اس میں سے دو فائلز نکالیں اور اس دوران کیف کی نظر ھما پروین والی فائل پر بھی گئی جسے وہ الریڈی مکمل کر چکا تھا، یعنی اس نے مراد میر سے جھوٹ بولا تھا کہ فائل ابھی مکمل نہیں ہے۔ لیکن کیوں؟

کیف نے اب اپنی مخصوص ڈائری کھولی اور اس پر کچھ لکھنا شروع کر دیا، اب وہ ان فائلز میں موجود صفحوں کو جانچتے ہوئے پلٹ رہا تھا اور جیسے ہی اسے کوئی خاص پوائنٹ ملتا وہ اسے اپنی ڈائری میں فورا نوٹ کر لیتا۔

ھما پروین استنبول کی ایک مشہور اداکارہ تھیں اور حال ہی میں وہ اپنے اپارٹمنٹ میں مردہ پائی گئیں تھیں۔ میڈیکل رپورٹس کے مطابق انہوں نے سلیپنگ پیلز کی اوور ڈوز لی تھی اور یہی انکی موت کی وجہ ثابت ہوئی تھی یعنی انہوں نے خودکوشی کی تھی۔

لیکن اس کی وجہ کیا تھی؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس کیس کا میڈیا پر بڑا چرچہ ہوا تھا۔ انکی فیملی نے اس کیس سے متعلق کسی بھی طرح کی انویسٹیگیشن سے صاف منع کر دیا تھا، کیونکہ انکا کہنا تھا کہ ھما پہلے ہی انکی مرضی کے خلاف جا کر یہ واحیات پیشہ اختیار کر چکی ہے اور انکی عزت مٹی میں ملا چکی ہے اور اب مزید وہ لوگ اپنی عزت کا تماشہ نہیں بنوانا چاہتے، لہذا اس کیس سے

متعلق وہ کسی بھی طرح کی کوئی کاروائی نہیں چاہتے۔

لیکن سوشل میڈیا پر انکے فینز کو یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے انکو انصاف دلوانے کے لیے آواز اٹھائی۔ اور اس دوران یہ کیس سینئر انویسٹیگیٹر مراد میر کے حوالے کیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنا دن رات ایک کیا اس کیس کو سولو کرنے میں لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا، وہ کوئی خاص ثبوت حاصل نہیں کر پائے اور تب تک وہ لوگ جنہوں نے انکو انصاف دلوانے کے لیے آواز اٹھائی تھی انکی تعداد بھی چند ہی رہ گئی تھی اور وہ چند لوگ بھی بعد میں واپس اپنی زندگیوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ سب کچھ واپس نارمل ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ کیس انویسٹیگیشن بھی روک دی گئی تھی اور ایک سادہ سی رپورٹ کے ساتھ کہ وہ ڈرگز لیتی تھیں اور یہی ڈرگز انکی موت کی وجہ بنے، کیس کلوز کر دیا گیا تھا۔

یہ رپورٹ لکھنے کا آرڈر مراد میر کے سینئر نائب حسین

نے انکو دیا تھا اور مراد میر کو نا چاہتے ہوئے بھی انکی بات ماننی پڑی۔

کیف منصور جونیئر انویسٹیگیٹر تھا، جو اسسٹنٹ کے طور پر سینیئر انویسٹیگیٹر مراد میر کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اسے یہ فیلڈ جوائن کیے ہوئے بس تھوڑا وقت ہی گزرا تھا اور یہ اسکا پہلا کیس تھا۔ بظاہر تو یہ کیس کلوز کر دیا گیا تھا لیکن کیف اب بھی خاموشی سے

اس پر کریٹیکل انویسٹیگیشن کر رہا تھا۔اور اب تک جو خاص بات اسے پتہ چلی تھی وہ یہ تھی کہ ھما کی گردن پر خراشوں کے نشان بھی پائے گئے تھے یعنی اس رات انکے اپارٹمنٹ میں کوئی اور بھی موجود تھا لیکن اس بات کا ثبوت موجود نہیں تھا اور یہ بات کیف ثابت کر سکتا تھا اسے بس ایک بار انکے اپارٹمنٹ میں جا کر انویسٹیگیشن کرنی تھی لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ صرف سینیئر انویسٹیگیٹر کو ہی کرائم پلیسز پر جانے کی اجازت تھی اور اگر کسی صورت میں جونیئر انویسٹیگیٹر کو کرائم پلیسز پر جانا بھی پڑتا تو اس کے لیے اسے سینیئر انویسٹیگیٹر کی پرمیشن کی ضرورت پڑتی ،اور کیف کو یہ سب خاموشی میں کرنا تھا بنا کسی کی نظروں میں لائے یہ کیس سالو کرنا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا وہ قاتل جو کوئی بھی ہے وہ ایک چالاک کھلاڑی ہے،اور وہ اس کیس سے جڑی ہر چیز پر اپنی نظر رکھے ہوئے ہے اور اس سے بھی زیادہ جس چیز کا اسے ڈر تھا وہ یہ کہ کہیں کرائم سین سے ثبوت مٹانہ دیے جائیں اور اگر فی الحال وہ جگہ پولیس کی کسٹڈی میں تھی اور بند تھی، تو یہی سب سے بہتر تھا۔

کیف کی نظر مر روال پر گئی تو اسے سامنے سے آتی ہوئی نیہان نظر آئی۔اگلے ہی لمحے وہ تمام فائلز اسی دراز میں واپس رکھ کر اسے لاک کر چکا تھا۔

نیہان کامران اس پورے آفس کے سینیئر نائب حسین کی اکلوتی پوتی تھی،وہ یہاں کام نہیں کرتی تھی مگر اکثر یہاں آتی رہتی تھی۔اسے اپنے دادا کے آفس اور ان کے کام میں کسی بھی طرح کی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی،وہ بس یہاں اپنے دوست کیف سے ملنے آیا کرتی تھی۔

کیف اور نیہان یہاں ترکی میں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔وہ دونوں ایک ہی ڈیپارٹمنٹ کے طالبعلم رہ چکے تھے اور اتفاق سے کلاس فیلو بھی۔نیہان کو شاید پہلی بار ہی کیف کی سنجیدہ شخصیت اپنی طرف کھینچنے لگی تھی۔

وہ دوسروں سے مختلف تھا۔کم بولنے والا،اپنی ذات میں مگن رہنے والا، مگر دل سے بے حد نرم اور شاید یہی بات نیہان کو اس کی طرف کھینچتی چلی گئی۔

وقت گزرتا گیا،کلاسز بدلتی رہیں، سیمسٹر ختم ہوتے رہے، مگر نیہان کے دل میں موجود وہ احساس کبھی کم نہ ہوا۔مگر اس نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔کیونکہ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں اس کی بات ان کی خوبصورت دوستی کو خراب نہ کر دے۔

اور کیف۔۔۔وہ سب جانتا تھا۔نیہان کی نظروں میں چھپی چاہت،اس کی خاموش فکر،اس کے لہجے کی نرمی،وہ ان سب سے بے خبر نہیں تھا۔مگر اس کے باوجود، کیف کے لیے نیہان صرف ایک اچھی دوست تھی،اور وہ اسے ہمیشہ ایک اچھی دوست کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔نہ اس نے اسے کبھی کوئی جھوٹی امید دی اور نہ ہی اس کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچنے دی۔

نیہان نے کیبن کے باہر کھڑے ہو کر دروازے پر دستک دی۔ کیف جواب دینے کی بھی بجائے ھماپروین والی فائل کو میز کے ایک سائیڈ ڈرا میں رکھ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے لیے ان فائلز کو محفوظ رکھنا زیادہ ضروری تھا۔ اور دوسری بات وہ جانتا تھا کہ پہلی تین دستک کے بعد چوتھی دستک پر وہ خود ہی اندر آجائے گی، کیونکہ نیہان میں بس اتنا ہی صبر موجود تھا۔

اور پھر۔۔۔

"ایک"

"دو"

"تین"

اور چھوتھی دستک دینے کی زحمت کیے بغیر وہ اندر آچکی تھی.

"میں اندر آجاؤں؟"

"تم الریڈی اندر آچکی ہو۔" وہ کیف کی بات پر شرمندگی سے مسکرائی۔

"سوری"... وہ اپنی بے وقوفی پر شرمندہ ہوئی۔

"آؤ بیٹھو۔" کیف نے اسے سامنے موجود چیئر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"چائے یا کافی؟"

"نتھنگ۔" وہ مسکرائی

"تو بتاؤ کیا چیز تمہیں پریشان کر رہی ہے؟" وہ مصروف سے انداز میں سامنے موجود لیپ ٹاپ پر ٹائپنگ کرتے ہوئے بولا۔

ایک لمحے کو وہ دنگ رہ گئی، یہ سوچ کر کہ اسے کیسے پتہ چلا کہ کوئی بات اسے پریشان کر رہی ہے۔ اسے بعض اوقات یوں محسوس ہوتا تھا کہ کیف آنکھیں بھی پڑھ سکتا ہے، بلاشبہ وہ صحیح ہی تھی کیونکہ کیف کے پاس آنکھوں کو پڑھ لینے کا ہنر واقعی موجود تھا۔

"نہیں تو، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور سامنے شیلف پر موجود کتابوں کو دیکھنے لگی۔

"یہ کتاب کس بارے میں ہے؟" اب وہ ایک کتاب کے صفوں کو پلٹتے ہوئے کیف سے پوچھنے لگی۔

"نیہان اسے واپس رکھ دو، وہ تمہارے کام کی نہیں ہے۔" کیف اسے نصیحت کرتے ہوئے بولا۔

"اور یہ؟" اب وہ ایک دوسری کتاب کو پکڑتے ہوئے بولی۔

"آہ... کیف نے ایک گہری سانس لی"

"جس ترتیب سے یہ کتابیں یہاں رکھی تھیں، تم اسی ترتیب سے انہیں واپس رکھ کر جاؤ گی۔"

بس یہ کہنے کی دیر تھی اور وہ ان تمام کتابوں کو چھوڑ کر واپس اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ جب بھی یہاں آتی تھی، ہر بار وہ چیزوں کی ترتیب خراب کر کر چلی جاتی تھی اور پھر بعد میں کیف کو ان چیزوں کو واپس ان کی جگہ پر رکھنا پڑتا تھا۔ وہ اسے ہر بار چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھنے کی نصیحت کرتا تھا، پر ہمیشہ وہ ایک بار بھی نہیں سنتی تھی۔

"ویسے تم نے کیا ڈرفٹنگ کی تھی، میں نے تو وہ ویڈیو گھر میں سب کو دکھائی تھی اور سب تمہاری ڈرائیونگ کے فین ہو گئے تھے۔" وہ پرجوشی سے اسے بتا رہی تھی۔

"ویڈیو؟" اسے حیرانی ہوئی، کیونکہ ایک ویڈیو کا پہلے مراد میر بھی ذکر کر چکے تھے لیکن اس نے تو کوئی ایسی ویڈیو اپلوڈ نہیں کی تھی، یا کسی سے اس چیز کا ذکر نہیں کیا تھا، تو پھر سب کس ویڈیو کی بات کر رہے تھے؟

"ہاں، ویڈیو۔"

"لیکن میں نے تو ایسی کوئی ویڈیو نہیں بنائی؟" وہ حیران ہوا۔

لیکن براق نے تو بنائی تھی اور تمہیں پتہ ہے اس نے تمہاری ویڈیو کو اپنے انسٹا گرام پیج پر اپلوڈ کیا ہے اور تمہاری سوچ بھی نہیں ہے کہ اس پر کتنے لائکس، کمنٹس اور بونس پوائنٹ پہ اس کو کتنے فالوورز ملے ہیں۔

"اچھا"... تو اب اسے سارا قصہ سمجھ آیا۔

"بائی داوے، ہم دونوں نے تمہاری جیت کی خوشی میں کل ایک ڈنر پلان کیا ہے. اس لیے کل تم لازمی آنا اور تمہارا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔"

"اور اگر میں کل نہ آسکا تو؟"

"تو میں اور براق پھر دوبارہ تم سے کبھی بات نہیں کریں گے۔" اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"اٹس اوکے، ڈونٹ وری آئی ول کم۔" وہ مسکرایا۔

"اوکے، میں کل تمہیں لوکیشن سینڈ کردوں گی بس تم وقت پر پہنچ جانا۔"

"اوکے۔" کیف اب دوبارہ ٹائپنگ کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

پھر کچھ دیر تک یوں ہی ہلکی پھلکی سی گفتگو ان دونوں کے درمیان جاری رہی اور پھر نیہان واپس چلی گئی۔ لیکن جانے سے پہلے وہ کیف کے لاکھ منع کرنے کے باوجود شیلف میں موجود ان کتابوں کی ترتیب خراب کر کر گئی تھی۔
ان کتابوں کو واپس ان کی جگہ پر رکھنے کے بعد کیف اب اس نشست کو گھور رہا تھا جس پر کچھ دیر پہلے نیہان بیٹھی تھی، وہ یقیناً اسے کچھ چھپا رہی تھی یہ اس کا اندازہ نہیں بلکہ یقین تھا۔ لیکن وہ کیا چھپا رہی تھی یہ وہ نہیں جانتا تھا۔



(دارُالمرجان)

"مرجانوں کا محل"

رات کی ہلکی سنہری روشنیوں میں نہایا ہوا وہ عالی شان محل نما پیلس دور سے ہی کسی خواب کی مانند دکھائی دیتا تھا۔
سفید سنگِ مرمر سے بنی اُس عظیم الشان عمارت کی دیواریں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ بڑی بڑی شاہانہ شیشے دار کھڑکیاں، جن پر سنہرے فریم لگے تھے، محل کو ایک رعب دار مگر دلکش انداز دے رہی تھیں۔ ہر کھڑکی کے پیچھے نرم زرد روشنی جھلملا رہی تھی، جیسے اندر کوئی پُرسکون شاہی دنیا آباد ہو۔
محل کے مرکزی دروازے تک جانے والا راستہ سفید اور ہلکے سلور رنگ کی مخصوص ٹائلز سے بنایا گیا تھا، دونوں اطراف قطار میں لگے اونچے پام کے درخت ہوا کے ساتھ آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔ سامنے ایک وسیع و عریض باغ تھا۔
رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو فضا میں گھلی ہوئی تھی۔ سفید گلاب، لیونڈر اور نایاب آرکڈز کی قطاریں باغ کو کسی جنت کا منظر دے رہی تھیں۔ درمیان میں بنا خوبصورت فاؤنٹین مسلسل پانی اچھال رہا تھا، اور پانی کی آواز ماحول میں ایک عجیب سا سکون پیدا کر رہی تھی۔
فاؤنٹین کے پیچھے شفاف نیلے پانی والا بڑا سوئمنگ پول تھا، جس کے گرد سفید ریک لائنرز رکھے تھے۔ پول کے اندر لگی انڈر واٹر لائٹس پانی کو نیلگوں چمک دے رہی تھیں، جیسے ستارے پانی میں اتر آئے ہوں۔
محل کے اندر داخل ہوتے ہی شان و شوکت اپنی انتہا پر محسوس ہوتی تھی۔

بڑا اسا رائل ہال، جس کی چھت سے لٹکتا دیوہیکل کرسٹل جھاڑ فانوس ہر طرف روشنی بکھیر رہا تھا۔ دیواروں پر مہنگی آرٹ پینٹنگز آویزاں تھیں، جبکہ فرش پر سفید ماربل اور سنہری ڈیزائن کا امتزاج آنکھوں کو خیرہ کر دیتا تھا۔

ایک جانب جدید طرز کا پرائیویٹ سنیما روم موجود تھا، جہاں مخملی سیاہ نشستیں اور دیوہیکل اسکرین لگائی گئی تھی۔ کمرے کی ہلکی نیلی روشنی اسے مزید پُراسرار بنا رہی تھی۔

دوسری طرف ایک لگژری جِم تھا۔ جدید مشینوں، شیشے کی دیواروں اور ساؤنڈ سسٹم سے آراستہ۔ وہاں ہر چیز نفاست اور دولت کی گواہی دے رہی تھی۔

اوپر کی منزلوں تک جاتی خم دار سیڑھیاں محل کے حسن میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ ریلنگ پر سنہرے نقش و نگار بنے تھے، جبکہ ہر منزل پر شیشے کی بالکونیاں تھیں جہاں سے پورے باغ اور استنبول کا دلکش منظر دکھائی دیتا تھا۔

محل کے ایک حصے میں خاموش لائبریری تھی، جہاں لکڑی کی مہک اور کتابوں کی قطاروں کی ایک الگ ہی دنیا محسوس ہوتی تھی۔ جبکہ پچھلی جانب ایک انڈور گیم ایریا، پرائیویٹ کیفے اور مہمانوں کے لیے شاہانہ سوئٹس بنائے گئے تھے۔

وہ محل طاقت، دولت اور شاہانہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔

ایسا محل جہاں ہر چیز کامل تھی... سوائے ان دلوں کے، جو اس کے اندر رہتے تھے۔

رات کی مدھم روشنیوں میں "دارُالمرجان" کا وہ وسیع و عریض سوئمنگ پول کسی خوابناک منظر کا حصہ لگ رہا تھا۔ نیلے پانی پر پڑتی سنہری لائٹس کی جھلک ماحول کو اور بھی پُراسرار بنا رہی تھی۔

وہ پچھلے بیس منٹ سے اسی لگژری پول میں سوئمنگ کر رہا تھا۔

پانی کی سطح پر اب بھی ہلکی لہریں باقی تھیں، جب وہ آخر کار پول سے باہر نکلا۔ اس کے بھیگے ہوئے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے، جبکہ پانی کے قطرے اس کی مضبوط گردن اور بازوؤں سے پھسلتے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔

وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا سامنے موجود لگژری پول لاؤنجز کی طرف آیا اور ایک پر جا بیٹھا۔

پاس رکھی ٹیبل پر نرم سفید تولیے ترتیب سے رکھے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک اٹھایا اور بے نیازی سے اپنی گردن کے گرد ڈال لیا۔ اس کے انداز میں عجیب سا رعب اور سکون تھا۔

پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی ہلکے سے بلند کی۔

بس اتنا اشارہ کافی تھا۔ پیچھے کھڑے محافظوں میں سے ایک فوراً آگے بڑھا اور نہایت احتیاط سے ایک قیمتی ایپل ٹوبیکو اسموکنگ پائپ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے خاموشی سے وہ پائپ تھاما۔

اگلے ہی لمحے وہ لاؤنج پر نیم دراز ہو گیا۔ ایک ہاتھ اپنی گردن کے پیچھے جمائے، جبکہ دوسرے ہاتھ میں وہ اسموکنگ پائپ تھامے پُرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔

وہ اس وقت سیاہ شارٹس میں ملبوس پول لاؤنج پر نیم دراز تھا۔

سینتیس سال کی عمر کے باوجود اس کی جسمانی ساخت حیران کن حد تک مضبوط تھی۔ چوڑے کندھے، نمایاں مسلز اور سخت ورزش سے بنی سکس پیکس باڈی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ خود کو کس قدر ڈسپلن میں رکھتا تھا۔

اس کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفید بال نمایاں ہونے لگے تھے، مگر وہ سفیدی اس کی شخصیت کو کمزور نہیں، بلکہ مزید پُررعب بنا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں لگتا تھا جو بے وجہ ہنستے ہوں۔

خاموش...

مگر خطرناک حد تک پُراعتماد۔

وہ ایک ہاتھ گردن کے پیچھے جمائے، دوسرے ہاتھ میں ایپل ٹوبیکو اسموکنگ پائپ تھامے دھیرے دھیرے کش لے رہا تھا۔

دھواں اس کے چہرے کے گرد بکھرتا، پھر رات کی ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔

اس کی نظریں سامنے پانی پر تھیں، مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں کھویا ہوا ہو۔

محافظ مناسب فاصلے پر خاموش کھڑے تھے۔ کوئی اس کی خاموشی توڑنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔

کیونکہ وہ عام انسان نہیں تھا۔

وہ یلماز یلدرز تھا...

دارُالمرجان کا بادشاہ۔

وہ لڑکا بڑے سست رویے سے چلتا ہوا یلماز کے پاس آیا اور اس کے ساتھ والے پول لاؤنج پر اس کی جانب رخ کر کے بیٹھ گیا۔

رات کی ٹھنڈی ہوا اب بھی پانی کی سطح کو ہلکے ہلکے ہلا رہی تھی، جبکہ ماحول میں ایپل ٹوبیکو کی مدھم خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

یلماز نے اب تک اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ بدستور نیم دراز انداز میں بیٹھا، اسموکنگ پائپ سے دھواں خارج کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی خطرناک سنجیدگی موجود تھی۔

"جیت کر آئے ہو؟"اس نے بغیر اس کی طرف دیکھے، اسی پر سکون مگر بھاری لہجے میں سوال کیا۔

اوزل خاموش رہا۔

اور یہی خاموشی...

اس کے سوال کا جواب تھی۔

چند لمحوں تک صرف پانی کی آواز سنائی دیتی رہی۔

"بھائی..."آخرکار اوزل شرمندگی سے بس اتنا ہی کہہ سکا۔

یلماز نے دھیرے سے ایک کش لیا، پھر دھواں فضا میں چھوڑا۔

"تم جانتے ہو نہ، مجھے ہارے ہوئے لوگوں سے نفرت ہے۔"

اس کے لہجے میں آواز زیادہ بلند نہیں تھی، مگر پھر بھی وہ جملہ اوزل کے دل پر بوجھ بن کر گرا۔

"بھائی، اس میں میرا قصور نہیں ہے..."اوزل جلدی سے بولا،

"وہاں کیف منصور تھا، پورے استنبول میں اس سے اچھی ڈرفٹنگ کوئی نہیں کر سکتا۔"

اس بار یلماز نے آہستہ سے اپنا چہرہ اس کی جانب موڑا۔

وہ سیاہ اور ہلکے سفید بالوں کے درمیان چھپی اس کی سرد نظریں سیدھا اوزل کی آنکھوں میں اتریں۔

"جو شخص اپنی ہار کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرانا شروع کر دے..."

وہ دھیرے مگر بے رحم لہجے میں بولا۔

"وہ جیتنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔"

اوزل خاموش ہو گیا۔اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔

یلماز نے آخری کش لیا، پھر اسموکنگ پائپ ٹیبل پر رکھا اور آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی شخصیت میں ایسا رعب تھا کہ اس کے قدموں کی دھیمی چاپ بھی ماحول پر حاوی محسوس ہوتی تھی۔

اور پھر...

وہ بنا کچھ کہے وہاں سے چلا گیا۔

جبکہ اوزل وہیں بیٹھا رہ گیا۔اپنی شکست اور یلماز کے الفاظ کے بوجھ تلے۔



وہ تینوں اس وقت پلان کے مطابق استنبول کے ایک پر تعیش ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی، اور شیشے پر گرتے قطروں کی آواز ماحول کو عجیب سا سکون دے رہی تھی۔

"تم ہمیشہ اتنے خاموش کیوں رہتے ہو؟" نہان نے کافی کا مگ تھامتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

کیف نے چند لمحے اسے دیکھا، پھر ہلکا سا مسکرایا۔

"کیونکہ ہر بات بولنا ضروری نہیں ہوتا۔" نہان اس جواب پر دھیرے سے مسکرا دی۔

وہ جانتی تھی...

کیف ایسا ہی تھا۔

خاموش... مگر گہرا۔

نہان کبھی کبھی سوچتی تھی، کاش وہ ایک بار اس کے دل کی بات سمجھ کر خود ہی کچھ کہہ دے۔ مگر پھر وہ خود کو روک لیتی کیونکہ اس کے لیے اس لمحے کی حقیقت ہی کافی تھی، کہ کیف اس کی زندگی میں موجود تھا۔

ایک اچھے دوست کی صورت میں ہی سہی۔

اور شاید... فی الحال وہ اسی لمحے میں جینا چاہتی تھی۔

"یار کیف، تُو نے میری نئی انسٹا آئی ڈی فالو کی ہے؟" بُراق نے بڑے فخر سے موبائل اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

کیف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ایک اور؟"

اس نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"یعنی یہ ساتویں آئی ڈی ہے؟"

بس یار... بُراق نے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔

"جب پرانی آئی ڈی سے بور ہو جاتا ہوں، تو نئی بنا لیتا ہوں۔ اور ویسے بھی، لڑکیاں میرا حسن دیکھنا پسند کرتی ہیں۔" وہ بڑے انداز سے بولا۔ جس پر نیہان بے اختیار ہنس پڑی۔

"لڑکیاں تیرا حسن نہیں دیکھتیں بلکہ وہ یہ چیک کرتیں ہیں، کہ ہر مہینے نئی آئی ڈی بنانے والا بندہ اپنی پریویس آئی ڈیز میں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی...

پھر نیہان کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

"اوہ گاڈ، کیف!" وہ بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

جبکہ بُراق صدمے سے کیف کو دیکھ رہا تھا۔

"بہت فضول انسان ہے تو..." وہ خفگی سے بازو باندھ کر دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔

کیف کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

بُراق کمال، کیف کا ہم عمر اور اس کا خاص دوست تھا۔ ان دونوں کی دوستی بھی اسی یونیورسٹی میں ہوئی تھی، جہاں وہ، کیف اور نیہان ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ مگر ان تینوں میں اگر کوئی سب سے زیادہ شور مچانے والا، ہر وقت ڈرامے کرنے والا اور اپنی ہی تعریفوں کے پل باندھنے والا تھا... تو وہ بُراق ہی تھا۔



چنار ریسٹورنٹ کی شیشے کی دیواروں سے باہر استنبول کی مصروف سڑکیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ شام کا وقت تھا، اور ہلکی بارش کے بعد فضا میں ٹھنڈک گھل چکی تھی۔

ریسٹورنٹ کے ایک کونے میں عنادل اپنی یونیورسٹی کی دوست یارا کے ساتھ بیٹھی تھی۔

عنادل نے بلیک لانگ شرٹ کے ساتھ سادہ ٹراؤزر پہن رکھا تھا، جبکہ اس کے اوپر موجود گرے لانگ کوٹ اسے ایک نفیس اور سنجیدہ انداز دے رہا تھا۔ اس نے اپنے سر کو سیاہ اسٹولر سے ڈھانپا ہوا تھا، اور پاؤں میں موجود بلیک اینڈ وائٹ اسنیکرز اس کی سادہ مگر خوبصورت شخصیت کی عکاسی کر رہے تھے۔

وہ خاموشی سے یارا کی بات سن رہی تھی، جبکہ سامنے رکھی کافی سے ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔

"میں نے اپنے پاپا سے بات کی ہے تمہارے لیے، عنادل۔" یارا خوشی سے اسے بتا رہی تھی۔

عنادل نے فوراً چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تو... کیا کہا انکل نے؟" اس کے لہجے میں بے چینی واضح تھی۔

یارا نے بڑے سکون سے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

"پاپا نے اپنے دوست کے بیٹے سے ان کی کمپنی میں تمہاری جاب کی بات کی ہے۔"

عنادل کے دل کی دھڑکن جیسے ایک لمحے کو رک گئی۔

"پھر... پھر کیا کہا انہوں نے؟"

"انہوں نے کہا ہے کہ تم اس ہفتے ان کے آفس آؤ اور انٹرویو دو۔"

عنادل کے چہرے پر ایک لمحے کو امید کی روشنی ابھری، مگر اگلے ہی پل فکر نے اسے گھیر لیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر اگر میرا انٹرویو اچھا نہ ہوا تو؟"

یارا ہلکا سا مسکرائی۔

"تب بھی تمہاری جاب پکی ہے... یہ یارا کا وعدہ ہے تم سے۔"

عنادل کی آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔

"بہت شکریہ یارا..." وہ دھیرے سے بولی۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر پھر پریشانی اتر آئی۔

"مگر ایک اور مسئلہ بھی ہے۔"

"کیا؟"

"اگر مجھے یہ جاب مل بھی گئی، تو یونیورسٹی اور جاب دونوں ایک ساتھ کیسے مینیج کروں گی؟"

یارا نے بے فکری سے جواب دیا۔

"تم عام دنوں میں یونیورسٹی مت آیا کرو۔ صرف جس دن ایگزام ہو، اسی دن آ جانا۔"

"لیکن میری اٹینڈنس؟"

"اس کی ٹینشن مت لو۔ وہ میں لگوادوں گی۔ آخر کلاس کے سی آر سے میری اچھی دوستی ہے۔"

یہ سن کر عنادل نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ اس کے دل سے ایک اور بوجھ کم ہو گیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں ایک بار پھر یارا کا شکریہ ادا کیا۔

تئیس سالہ عنادل نور استنبول کی ایک انجینئرنگ کی یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ وہ ہمیشہ سے ذہین اور قابل طالبہ رہی تھی، اور اسی قابلیت کی وجہ سے اسے اسکالرشپ پر ترکی میں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔

یونیورسٹی کے آخراجات حکومت ادا کرتی تھی، مگر رہائش اور روزمرہ زندگی کا خرچ اسے خود اٹھانا پڑتا تھا۔ وہ استنبول میں کرائے کے ایک چھوٹے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اسے ترکی آئے دو سال ہو چکے تھے، اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ پہلے ایک کیفے میں جاب بھی کرتی تھی۔ مگر کچھ عرصہ پہلے وہ کیفے بند ہو گیا، اور تب سے وہ نئی جاب کی تلاش میں تھی۔

یارا اس کی کلاس میٹ تھی۔ وہ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی، جہاں تقریباً سب ہی ڈاکٹرز تھے۔ مگر یارا کو ہمیشہ سے اس پیشے میں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایک قابل انجینئر بننا چاہتی تھی۔ اور اسی ضد، اسی خواب نے اسے یہاں تک پہنچایا تھا۔

وہ دونوں لڑکیاں اس وقت ریسٹورنٹ کی تیسری منزل پر موجود تھیں۔ جب اچانک یارا کے موبائل پر کوئی کال آئی، چونکہ تیسری منزل پر صحیح سے سگنل نہیں آرہے تھے اسی لیے وہ عنادل کو یہیں بیٹھنے کا بول کر خود نیچے پارکنگ ایریا میں کال ریسیو کرنے چلی گئی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد یارا نے عنادل کو کال کی کہ اسے کسی ضروری کام سے ابھی گھر جانا ہے، اس لیے وہ بھی جلدی سے پارکنگ ایریا میں آجائے۔

عنادل اپنا پرس اٹھاتی، نیچے جانے والی لفٹ میں داخل ہو گئی تھی۔



کیف، براق اور نہان باتوں میں مصروف تھے کہ جب کیف کے موبائل پر رنگنگ ہوئی، یہ مراد دمیر کی کال تھی۔ کیف نے کال اٹھائی مگر دوسری طرف سے آواز صاف نہیں آرہی تھی، جس کی وجہ سے اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ سر؟ آپ کی آواز بریک ہو رہی ہے۔" اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

مگر جواب میں صرف بے ترتیب سی آوازیں سنائی دیں۔اس نے فوراً موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی تو وہاں واضح طور پر "نو سگنل" لکھا ہوا تھا۔

"گریٹ۔۔۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

یہ مراد میر کی کال تھی، وہ انہیں زیادہ دیر ویٹ بھی نہیں کروا سکتا تھا۔اسی لیے اس نے اپنے دوستوں کی طرف مڑ کر مختصراً کہا۔

"تم لوگ بیٹھو، میں ابھی آیا۔"

"کہاں جا رہا ہے؟" براق نے فوراً پوچھا۔

"سگنل ڈھونڈنے جا رہا ہوں ورنہ مجھے بھی تیری طرح ہر دو دن بعد نئی کنیکشن آئیڈنٹٹی بنانی پڑے گی۔" کیف نے خشک لہجے میں کہا۔

نیہان ہنس دی جبکہ براق نے خفگی سے منہ بنایا۔

"ایک دن میں واقعی تیرے خلاف سائبر کرائم میں رپورٹ کر دوں گا۔"

کیف نے بغیر جواب دیے ہلکا سا ہاتھ ہلایا اور تیز قدموں سے

کوریڈور پار کرتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

چمکتی ہوئی خاموش راہداری میں اس کے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔اس نے لفٹ کا بٹن دبایا اور چند لمحوں بعد دروازے کھلتے ہی اندر داخل ہو گیا۔

لفٹ کے دروازے بند ہوئے تو ایک لمحے کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔

اس نے دوبارہ موبائل دیکھا۔ابھی بھی نو سگنل۔وہ بے صبری سے انگلیاں اسکرین پر مارتا رہا۔

لفٹ تیسرے فلور پر آ کر رکی اور اگلے ہی لمحے ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔

کیف نے سر اٹھا کر اسے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

وہ اب بھی اپنے موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔دوسری طرف عنادل نے خاموشی سے گراؤنڈ فلور کا بٹن دبایا اور ایک مناسب فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔

لفٹ کے دروازے بند ہوئے ہی تھے کہ اچانک ایک زوردار جھٹکا لگا۔کیف بے اختیار دائیں جانب لڑکھڑا گیا۔

خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے فوراً پاس کھڑی لڑکی کے بازو کا سہارا لیا، اور اسی کوشش کے دوران عنادل کا اسٹولر سر سے پھسل کر کندھوں تک آ گرا۔

اور بس...

اگلے ہی لمحے...

"تھپ!" ایک زوردار تھپڑ کیف کے چہرے پر پڑا۔

"بدتمیز!" عنادل کی غصے سے کانپتی آواز لفٹ میں گونجی۔

کیف کو ایک لمحے کے لیے اپنا گال سن ہوتا محسوس ہوا۔

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے ہی والا تھا کہ، اچانک لفٹ کی لائٹس بند ہو گئیں۔

چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اور لفٹ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ چند لمحوں کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔

پھر اندھیرے میں عنادل کی تیز سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔ اس کے ہاتھ بے اختیار کانپنے لگے۔ بند جگہیں ہمیشہ سے اسے گھٹن کا احساس دلاتی تھیں۔ ایسے لمحوں میں اس کی سانس اکھڑنے لگتی تھی...اور وہ شدید پینک میں چلی جاتی تھی۔ اور اس وقت بھی بالکل یہی ہو رہا تھا۔

"یہ...یہ لفٹ رک کیوں گئی ہے؟"

وہ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بولی۔

"اور اندھیرا کیوں ہو گیا ہے...؟" اس کی آواز میں واضح خوف تھا۔

کیف، جو چند لمحے پہلے اس پر غصہ کرنے والا تھا، اب یکدم خاموش ہو گیا۔

اندھیرے میں وہ اس کا چہرہ تو نہیں دیکھ پا رہا تھا، مگر اس کی کانپتی آواز ہی کافی تھی یہ سمجھنے کے لیے کہ وہ بری طرح پینک کر رہی ہے۔

اور نجانے کیوں، اس ایک لمحے میں اس کا غصہ پیچھے رہ گیا۔

وہ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گئی اور پھر اگلے ہی لمحے رونے لگی۔ بے اختیار اسے سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔

وہ بند اپارٹمنٹ...

وہ کمرہ...

وہ خوف...

"پلیز... کسی بھی طرح اسے کھول دو" وہ کانپتی آواز میں بولی۔

کیف نے فوراً اپنے موبائل کی ٹارچ آن کی اور اسے نیچے ایک طرف رکھ دیا۔ مدھم سی روشنی لفٹ میں پھیل گئی۔

اب پہلی بار اس نے اُس لڑکی کی طرف غور سے دیکھا۔

روشنی اتنی تیز نہیں تھی کہ وہ اس کا چہرہ مکمل طور پر دیکھ پاتا، مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ اس کی آنکھوں میں پھیلا خوف واضح محسوس کر سکتا تھا۔

"دیکھیں... آپ روئیں مت۔ شاید کوئی ٹیکنکل ایشو ہو گیا ہے۔ بس تھوڑا انتظار کریں، لفٹ کھل جائے گی۔"

وہ ایک مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔ مگر عنادل اب بھی اسی روانی سے رو رہی تھی۔ کیف نے دوبارہ موبائل اسکرین دیکھی۔ ابھی بھی کوئی سگنل نہیں تھا۔ وہ کسی کو کال بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"میرا دم گھٹ رہا ہے..."

عنادل روتے ہوئے بولی۔

"پلیز... کھول دو اسے..."

اب اس کی سانسیں مزید اکھڑنے لگی تھیں۔

"لِسن... لمبے لمبے سانس لیں۔ بس ابھی یہ کھل جائے گا۔"

کیف نے خود کو پر سکون رکھتے ہوئے کہا۔

مگر اگلے پانچ منٹ تک ہی عنادل خود پر قابو رکھ سکی۔

پھر وہ پہلے سے زیادہ پینک کرنے لگی۔

"میں ابھی مرنا نہیں چاہتی..." وہ ٹوٹی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولی۔

کیف کے دل میں جیسے کچھ چبھا۔

"دیکھیں خود کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔" یہ الفاظ بے اختیار اس کے لبوں سے ادا ہوئے۔

شاید پہلی بار...

اس نے کسی اجنبی کے لیے اتنی فکر محسوس کی تھی۔

وہ فوراً کھڑا ہوا اور پوری طاقت سے لفٹ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

مگر بے فائدہ۔

آخر کار وہ واپس آ کر ایک فاصلے پر نیچے بیٹھ گیا۔

"جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کریں۔"

عنادل بمشکل اس کی بات سن پا رہی تھی۔

"Inhale and exhale your breath slowly"

اب عنادل وہی کرنے لگی۔

"آنکھیں بند کریں اور اُس چیز کے بارے میں سوچیں جسے آپ سب سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔" کیف نے اسے مینٹلی ریلیکس کرنے کی کوشش کی، تاکہ وہ فی الحال کہیں اور متوجہ ہو۔

عنادل نے آنکھیں بند کیں۔

اور اگلے ہی لمحے... ہارون کا چہرہ اس کی بند آنکھوں کے سامنے ابھرا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

بعض اوقات انسان اپنی ساری محبت اُس شخص پر لٹا دیتا ہے،

جو بدلے میں اُسے صرف درد دیتا ہے۔

کیف کی نظر اُس کے کانپتے ہاتھوں پر گئی۔ اس نے خاموشی سے اپنی جیکٹ اتاری، اسے اپنے ہاتھوں پر پھیلایا اور پھر آہستگی سے عنادل کے کانپتے ہاتھ تھام لیے۔ اگلے ہی لمحے عنادل نے اُس جیکٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"مجھے بچا لو..."

اس کی آواز اتنی کمزور تھی کہ جیسے وہ ٹوٹ رہی ہو۔

"میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔" کیف نے اُس کی بند آنکھوں کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

پھر اگلے ہی لمحے باہر سے کسی نے لفٹ کا دروازہ کھولا۔

لفٹ رکنے پر باہر موجود لوگوں نے فوراً سیکیورٹی کو اطلاع دی تھی، اور پھر ایک ٹیکنیشن بلا کر دروازہ کھلوایا گیا تھا۔

دروازہ کھلا تو باہر کئی لوگ کھڑے تھے۔ جن میں یارا بھی پریشان کھڑی تھی۔

"تم ٹھیک ہو عنادل؟"

یارا فوراً لفٹ کے اندر داخل ہوئی اور اسے سہارا دے کر باہر لے گئی۔

اور کیف... وہ واپس نیچے اپنی جیکٹ اور موبائل اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ اچانک اسے سامنے ایک ڈائری گری ہوئی نظر آئی۔ یقیناً وہ عنادل کے بیگ سے گری تھی۔

اس نے خاموشی سے وہ ڈائری اٹھائی اور باہر نکلا۔

مگر تب تک، وہ دونوں لڑکیاں وہاں موجود نہیں تھیں۔

پھر اچانک کیف کو یاد آیا کہ وہ کس کام سے نیچے آیا تھا، اب وہ پارکنگ ایریا کی جانب چلا گیا۔



{باب:3}

دارُالمرجان کے وسیع میدانوں میں اُس وقت صرف گھوڑے کے سموں کی آواز گونج رہی تھی۔ ہوا تیز تھی، اور سبز میدانوں کے درمیان ایک سیاہ گھوڑا پوری شان سے دوڑ رہا تھا۔ جبکہ اُس کی پشت پر بیٹھا شخص یلماز یلدرز تھا۔

وہ سیاہ فٹڈ ٹی شرٹ، بلیک رائیڈنگ پینٹ، لمبے لیدر بوٹس اور ہاتھوں میں سیاہ گلوز پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر موجود بلیک گلاسز اور پُراعتماد انداز اُس کی شخصیت کو مزید پُر رعب بنا رہے تھے۔ مگر اصل حسن اُس کے نیچے دوڑتے اُس شاہانہ گھوڑے کا تھا۔

سیاہ رنگ کا وہ طاقتور گھوڑا، جس کی لمبی ریشمی ایال ہوا میں لہرا رہی تھیں، کسی بادشاہ کے خواب جیسا لگ رہا تھا۔ اُس کے مضبوط جسم پر پڑتی دھوپ عجیب سی چمک پیدا کر رہی تھی۔ اُس گھوڑے کا نام "شاہباز" تھا۔

اور واقعی وہ کسی شاہی پرندے کی طرح آزاد اور مغرور لگتا تھا۔ یلماز اور شاہباز کے درمیان تعلق عام مالک اور جانور جیسا نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو محسوس کرتے تھے۔

جیسے برسوں کی خاموش رفاقت نے انہیں ایک دوسرے کا حصہ بنا دیا ہو۔

یلماز کے ہاتھوں کی معمولی جنبش پر شاہباز فوراً ردِ عمل دیتا، اور جب وہ رفتار بڑھاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے گھوڑا نہیں، سیاہ آندھی میدان میں دوڑ رہی ہو۔

اُس کی رائیڈنگ اسکلز واقعی قابل دید تھیں۔

دارُالمرجان کے ملازمین اکثر کہا کرتے تھے۔

"دارُالمرجان یلماز کا دل ہے اور شاہباز اُس کی روح۔"

دارُالمرجان کے وسیع اصطبل میں اس وقت گھوڑوں کی ہلکی آوازیں اور ہوا کی مدھم سرگوشیاں گونج رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر پہلے یلماز نے اپنی رائیڈنگ مکمل کی تھی۔اب وہ شاہباز کے قریب کھڑا اُس کے چمکتے سیاہ جسم پر نرمی سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔

شاہباز نے جیسے اُس کے لمس کو پہچان لیا ہو۔اس لیے وہ خاموشی سے اپنا سر جھکائے کھڑا تھا، جبکہ اس کی لمبی سیاہ ایال ہلکی ہوا کے ساتھ لہرا رہی تھیں۔

یلماز کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح سنجیدگی موجود تھی، مگر شاہباز کے قریب اُس کے انداز میں عجیب سا سکون آ جاتا تھا۔ایسا سکون، جو شاید اسے دنیا کے کسی انسان کے پاس محسوس نہیں ہوتا تھا۔

"گڈ بوائے"

وہ دھیرے سے بولا اور شاہباز کی گردن تھپتھائی۔شاہباز نے ہلکی سی ہنہناہٹ کی، جیسے اپنے مالک کی بات سمجھ گیا ہو۔

تبھی پیچھے سے قدموں کی آواز ابھری۔

"سر..."

صفدر، جو یلماز کا پرسنل اسسٹنٹ تھا، ادب سے اس کے قریب آ کر رکا۔

"نیازی بیگ آ گیا ہے۔"

یلماز نے کوئی فوری ردِ عمل نہیں دیا۔

وہ بدستور شاہباز کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتا رہا، جیسے اُس لمحے اُس کے لیے باقی دنیا کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

"کچھ دیر تک انتظار کرنے دو اُسے..."

اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ صفدر خاموشی سے سر جھکا گیا۔اور پھر یلماز شاہباز کی لگام تھامے اُسے اصطبل کی جانب لے جانے لگا۔

شاہباز بھی مکمل فرمانبرداری سے اُس کے ساتھ چل رہا تھا۔

وہ منظر عجیب حد تک پُراثر تھا۔

ایک مغرور بادشاہ...

اور اُس کی خاموش روح۔

دارُالمرجان کے وسیع ہال میں خاموشی کا راج تھا۔ قیمتی فانوسوں کی روشنی سفید سنگِ مرمر پر پھیل رہی تھی، جبکہ ہال کے بیچوں بیچ موجود شاہانہ کرسی پورے ماحول کو ایک عجیب سا رعب دے رہی تھی۔

اگلے ہی لمحے یلماز بڑے وقار اور رعب کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

اس کے قدم دھیمے تھے مگر اُس کی موجودگی ہی کافی تھی ماحول پر حاوی ہونے کے لیے۔

وہ آکر اپنی شاہانہ کرسی پر بیٹھ گیا۔اسی دوران نیازی بیگ فوراً ادب سے کھڑا ہوا، پھر یلماز کے اشارہ دینے پر دوبارہ بیٹھ گیا۔

"کہاں تھے تم اتنی دیر؟" نیازی نے قدرے ناراضی سے سوال کیا۔

"شاہباز کے پاس۔"

یلماز نے اسی روانی سے جواب دیا۔

"وہ گھوڑا مجھ سے زیادہ ضروری تھا؟"

"ہے..." یلماز نے بے نیازی سے اُس کا جملہ درست کیا۔

نیازی کے چہرے کے تاثرات سخت ہوئے، وہ واضح طور پر غصے میں آچکا تھا۔

"خیر... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ کام کروں گا۔اور میں نے دوسری کمپنیز کو ریجیکٹ کر دیا ہے۔"

"لیکن میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ میں تمہارے ساتھ کام کروں گا یا نہیں۔"

یلماز کی سرد آواز پورے ہال میں گونجی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" نیازی کا پارہ ہائی ہوا۔

"وہی جو تم سننا نہیں چاہتے۔"

نیازی نے دانت پیسے۔

"تم مجھے، نیازی بیگ کو ٹھکرا رہے ہو؟"

اس بار یلماز ذرا سا آگے جھکا۔

اس کی سیاہ آنکھوں میں خطرناک سرد مہری تھی۔

"تم نے میرے ساتھ غداری کی ہے، نیازی۔"

وہ دھیرے مگر زہر بھرے لہجے میں بولا۔

"جو پروجیکٹ تم مجھے دینے والے تھے، وہ تم نے چند پیسوں کی خاطر کسی اور کو بیچ دیا۔"

نیازی خاموش ہو گیا۔

"تمہیں تو میرا شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں نے ہماری پرانی دوستی کا بھرم رکھتے ہوئے تمہاری جان بخش دی۔ ورنہ آج تم اِس طرح میرے سامنے بیٹھے اپنی گندی زبان چلانے کے قابل نہ ہوتے۔"

نیازی نے فوراً لہجہ بدلا۔

"میرے پاس اور بھی کئی پروجیکٹس ہیں، ہم اُن کے لیے بات کر سکتے ہیں۔"

"ناٹ انٹرسٹ ٹیڈ"

مختصر...

سرد...

اور فیصلہ کن جواب۔

"دیکھو یلماز، میں مانتا ہوں میں پیسوں کی لالچ میں آ گیا تھا..."

نیازی مصنوعی افسردگی سے بولا۔

"مگر سچ میں، مجھے آج بھی تمہاری اتنی ہی قدر ہے جتنی پہلے تھی۔ اگر تم کہو تو میں ہماری دوستی کے لیے اپنی جان بھی دینے کو تیار ہوں۔"

اگلے ہی لمحے، یلماز کا بلند قہقہہ ہال میں گونجا۔

ایسا قہقہہ، جس میں طنز بھی تھا اور تحقیر بھی۔

نیازی خاموش ہو گیا۔

"میں نے کئی کتوں کے ساتھ کام کیا ہے،"

یلماز اب بے حد پر سکون لہجے میں بولا۔

"مگر تمہارا درجہ سب سے اول ہے۔"

یہ جملہ نیازی کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔ مگر وہ پھر بھی اپنے چہرے پر بناوٹی شرافت سجائے بیٹھا رہا۔

"تم جا سکتے ہو۔"

یلماز اب کھڑا ہو چکا تھا۔

"یلماز تم مجھے ٹھکرا کر پچھتاؤ گے۔"

نیازی بھی غصے سے کھڑا ہوا۔

یلماز اُس کے قریب سے گزرتے ہوئے رکا، پھر اُس نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

"میں اُن لوگوں میں سے نہیں، جو سانپوں کو دوبارہ آستین میں جگہ دیتے ہیں۔"

اور پھر وہ اُسی رعب اور وقار کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔

جبکہ نیازی بیگ غصے سے اُسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

ہال کے باہر خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ لمبے قد والے مسلح گارڈز پوری چوکسی کے ساتھ کھڑے تھے، جبکہ صفدر چند قدم کے فاصلے پر سر جھکائے منتظر کھڑا تھا۔

اگلے ہی لمحے...

بھاری دروازہ کھلا۔

اور یلماز باہر نکلا۔

سیاہ لباس میں ملبوس وہ شخص ہمیشہ کی طرح پُر رعب لگ رہا تھا۔ اُس کے قدم نہ تیز تھے نہ سست مگر اُس کی موجودگی ہی کافی تھی لوگوں کے دلوں میں خوف اتارنے کے لیے۔

فوراً صفدر ادب سے اُس کے قریب آیا۔

"سر"

یلماز نے چلتے چلتے اپنی مضبوط کلائی پر بندھی بے حد قیمتی اور شاہانہ گھڑی پر نظر ڈالی۔

پھر بغیر کسی جذبات کے بولا۔

"صرف پانچ منٹ ہیں تمہارے پاس۔"

صفدر پوری توجہ سے سن رہا تھا۔

"نیازی کے ہاتھ اور پاؤں دونوں توڑ دو..."

وہ لمحہ بھر رکا۔

پھر انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

"اور اُس کی زبان کتوں کو کھلا دو۔"

ایک پل کو ماحول مزید خوفناک ہو گیا۔ مگر صفدر کے چہرے پر کوئی حیرت نہیں آئی، جیسے یہ اُس کے لیے کوئی نئی بات نہ ہو۔

"اوکے سر"

یلماز کے لبوں پر ہلکی سی اطمینان بھری مسکراہٹ آئی۔

"ویری گڈ"

اور پھر وہ بغیر پیچھے دیکھے آگے بڑھ گیا۔



کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف اُس کی دبی دبی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ بیڈ پر بیٹھی تھی، دونوں بازو اپنی ٹانگوں کے گرد جمائے، جبکہ اُس کا سر گھٹنوں میں گرا ہوا تھا۔ آنسو خاموشی سے اُس کے چہرے سے بہہ رہے تھے۔

آج کا واقعہ شاید اُس کے اندر دفن کسی پرانے زخم کو پھر سے زندہ کر گیا تھا۔

وہی زخم...

جسے وہ بڑی مشکل سے وقت کی مٹی تلے دبا چکی تھی۔

"ہارون...دروازہ کھولیں پلیز...میرا سانس بند ہو رہا ہے..."

وہ پاگلوں کی طرح ڈور ہینڈل گھماتے ہوئے رو رہی تھی۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔

ہزار کوششوں کے باوجود جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں موجود کھڑکی کے پاس آئی، مگر وہ بھی ہمیشہ کی طرح لاک تھی۔

اُس نے لرزتے ہاتھوں سے اُسے کھولنے کی ناکام کوشش کی۔

مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

آنکھوں سے بہتے آنسو اُس کی بینائی دھندلا رہے تھے، پھر بھی وہ کھڑکی سے باہر دکھائی دینے والی لمبی عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔

دور...

بہت دور تک...

صرف بلند و بالا عمارتیں تھیں۔

اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ کے لیے دبئی میں قید کر دی گئی ہو۔ جیسے واپسی کا ہر راستہ بند ہو چکا ہو۔

اب اُس میں کھڑے رہنے کی بھی سکت نہ بچی تھی۔ وہ بے اختیار گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئی۔ اُسے شدت سے اپنے ماں باپ یاد آئے۔

"ماما...پلیز مجھے یہاں سے لے جائیں..."

وہ بچوں کی طرح روئی۔

"یہ لوگ مجھے پاگل کر دیں گے..."

"میں مر جاؤں گی ماما..."

وہ پوری طاقت سے چیخی۔

کافی دیر رونے اور چیخنے کے باعث اُس کا گلا بیٹھ چکا تھا۔ آنسو بھی خشک ہو چکے تھے، مگر اپارٹمنٹ کا دروازہ اب بھی لاک تھا۔

وہ اس وقت اپنی یادوں میں کہیں کھو گئی تھی، کچھ دیر بعد اُس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور آستین سے اپنے آنسو صاف کیے۔ پھر خاموشی سے وضو کرنے چلی گئی۔ اب وہ جائے نماز پر بیٹھی تھی۔

نماز مکمل ہونے کے بعد اُس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے، اور پھر اپنے اللہ سے باتیں کرنے لگی۔ جیسے ہمیشہ کرتی تھی۔

جب بھی اُس کا دل ٹوٹتا یا جب بھی کوئی تکلیف اُسے اندر سے زخمی کرتی، تو وہ سب سے پہلے اپنے اللہ سے بات کرتی تھی۔

"اللہ پاک... وہ شخص مجھے کیوں نہیں بھولتا؟"

اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اُس نے میرے ساتھ اتنا برا کیا، لیکن پھر بھی مجھے اُس سے نفرت نہیں ہوئی... آخر کیوں؟"

"جبکہ میرا دل اُس شخص کے لیے مر چکا ہے... میں اُسے دیکھنا نہیں چاہتی... اُسے سننا نہیں چاہتی... لیکن پھر بھی اُس سے نفرت نہیں کر پائی..."

وہ دوبارہ رو پڑی۔

"اللہ پاک... آپ کو پتا ہے آپ کے بندے بالکل بھی اچھے نہیں ہیں۔ آپ کے بندے، آپ کے دوسرے بندوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور انہیں آپ سے ڈر بھی نہیں لگتا۔"

اُس کی آواز ٹوٹ گئی۔

"آپ کو پتا ہے اللہ پاک... ہارون نے جو میرے ساتھ کیا... اُسے اُس کا پچھتاوا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اُسے لگتا ہے وہ ہمیشہ ٹھیک تھا اور میں ہمیشہ غلط..."

کچھ لوگ اپنے ظلم کو ظلم مانتے ہی نہیں، وہ دوسروں کے زخموں کو معمولی سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی خاموش ضرور رہتی ہے، پر اندھی نہیں ہوتی۔

انسان آج جو درد کسی اور کے حصے میں لکھتا ہے، کل وہی درد وقت کے ساتھ گھوم کر اُس کے اپنے دروازے پر دستک دیتا ہے۔



یلدرز گروپ آف انڈسٹریز کی بلند و بالا عمارت ہمیشہ کی طرح اپنی شان و شوکت کے ساتھ کھڑی تھی۔اندر موجود ماحول پُرسکون ضرور تھا، مگر اگلے چند لمحوں میں وہ سکون بکھرنے والا تھا۔

شیشے کے خودکار دروازے زور سے کھلے۔اور پھر غصے سے بھرا ایک شخص لمبے لمبے قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا۔

وہ سیدھا کانفرنس روم کی جانب بڑھا۔

"کہاں ہے تمہارا باس؟ بلاؤ اُسے!"

وہ تقریباً دھاڑتے ہوئے بولا۔

باہر موجود گارڈز فوراً اُس کے راستے میں آئے۔

"سر، آپ اندر نہیں جا سکتے"

"ہٹو میرے راستے سے!"

اُس کی بلند آواز کانفرنس روم کے اندر تک پہنچ چکی تھی۔اندر موجود لوگ چونک کر کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے تو کبھی دروازے کی طرف۔

مگر ہیڈ آف دی ٹیبل پر بیٹھا یلماز مکمل سکون سے فائل بند کر رہا تھا۔

"آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"

وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

"باقی باتیں ہم کل ڈسکس کر لیں گے۔"

سب لوگ فوراً احترام سے اُسے سلام کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"اندر آنے دو اُسے۔"

یلماز نے باہر کھڑے گارڈز کو اشارہ کیا۔

اگلے ہی لمحے، حیدر غصے سے بھرا اندر داخل ہوا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بھائی کے ساتھ ایسا کرنے کی؟!"

وہ پوری قوت سے چلایا۔

"بھونکنا بند کرو، حیدر۔"

یلماز کی رعب دار آواز فضا میں گونجی۔

"یہ میرا آفس ہے...

یہاں آوازیں نہیں، صرف میرے فیصلے بلند ہوتے ہیں۔"

حیدر کے چہرے پر غصہ مزید نمایاں ہوا۔

"تم مجھے ابھی جانتے نہیں ہو، یلماز!"

وہ انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔

یلماز ہلکا سا مسکرایا۔

"واقعی..."

وہ انتہائی پُرسکون انداز میں اپنے تھری پیس سوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے کھڑا ہوا۔

"تم ابھی مجھے نہیں جانتے۔"

اب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا حیدر کے قریب آیا۔

"میں یلماز یلدرز ہوں..."

وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"بندے کو دوسری سانس کا موقع نہیں دیتا۔"

پھر اُس نے حیدر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اگر تمہیں اپنی جان اور سانسیں عزیز ہیں، تو خاموشی سے وہاں واپس چلے جاؤ جہاں سے آئے تھے۔"

یلماز کی آواز میں ایسا خوف اور رعب تھا کہ حیدر بے اختیار خاموش ہو گیا۔

کمرے میں چند لمحوں کے لیے مکمل سناٹا چھا گیا۔ پھر یلماز اُس کے کان کے قریب جھکا اور دھیرے سے بولا۔

اور ایک بات یاد رکھنا...

"میں دشمنوں کو معاف نہیں کرتا، صرف دفن کرتا ہوں۔"

حیدر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ناچاہتے ہوئے بھی اُسے اپنے قدم پیچھے ہٹانے پڑے۔ وہ خاموشی سے پلٹا اور باہر نکل گیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی یلماز دوبارہ اپنی جگہ کی جانب مڑا۔

"صفدر۔"

"یس سر"

"کیا کنڈیشن ہے نیازی کی؟"

"سر، وہ صدمے کی وجہ سے کومے میں جا چکا ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔

پھر یلماز کے لبوں پر خطرناک مسکراہٹ ابھری۔

"اچھا ہے..."

وہ سرد لہجے میں بولا۔

"کم از کم اب وہ اپنی زبان سے غداری تو نہیں کر پائے گا۔"



کیف اپنے کیبن میں بیٹھا تھا۔ رات کافی گزر چکی تھی،

اور پورے دفتر میں اب پہلے جیسا شور باقی نہیں رہا تھا۔

صرف کہیں کہیں کی بورڈ کی مدھم آوازیں اور گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔

بیوگلو کی اُس پرانی عمارت کی دوسری منزل پر موجود اس چھوٹے سے کیبن میں اس وقت صرف ایک چیز زندہ تھی۔

اور وہ تھا...

کیف کا تجسس۔

اس کی میز پر دونوں کیسز کی فائلیں کھلی ہوئی تھیں۔

ایک طرف ہما پروین کا کیس...

اور دوسری طرف اٹلی میں قتل ہونے والے اے-ایس-پی کی تصاویر اور رپورٹس۔

کیف کی نظریں بار بار ایک ہی تصویر پر جا کر رک رہی تھیں۔

اے ایس پی کی گردن پر بنا وہ عجیب سا نشان۔

باریک...

مگر انتہائی صفائی سے بنایا گیا۔ جیسے قاتل نے جلد پر کوئی پیغام لکھا ہو۔

کیف نے تصویر کو مزید قریب کیا۔اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"یہ اتفاق نہیں ہو سکتا..."

وہ آہستہ سے خود سے بولا۔

"کوئی عام قاتل ایسا نہیں کرتا"

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور گہری سانس لی۔

"پہلے بے رحمی سے قتل کرنا...

پھر اتنے سکون سے ایک مخصوص نشان بنانا۔"

اس کی نظریں اب بھی تصویر پر جمی تھیں۔

"یہ یقیناً کوئی سائیکو کلر ہے..."

کمرے میں خاموشی مزید گہری ہو گئی۔

"ورنہ کوئی انسان...

اتنے دردناک طریقے سے قتل کر کے، اتنے اطمینان سے اپنی نشانی کیوں چھوڑے گا؟"

کیف نے اپنی ڈائری کھولی۔

سیاہ روشنائی والا قلم اس کی انگلیوں میں آیا اور وہ ایک ایک اہم نکتہ لکھنے لگا۔

Victim selection unusual

No clear evidence

Symbolic neck mark

Controlled murder pattern

Killer psychologically stable... but emotionally detached

وہ لکھتے لکھتے رکا۔

پھر اس نے نیچے ایک جملہ الگ سے لکھا۔

"He wants to be noticed."

کیف کچھ لمحے اُس جملے کو دیکھتا رہا، جیسے وہ صرف اندازہ نہیں، بلکہ کسی حقیقت کے قریب پہنچ رہا ہو۔

اسی لمحے...

ٹھک... ٹھک... دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجایئے۔"

وہ اسی مصروف انداز میں بولا، نظریں اب بھی ڈائری پر تھیں۔

دروازہ کھلا۔

سر، دیمیر سر آپ کو اپنے کیبن میں بلا رہے ہیں۔

یہ دفتر کا ایک ورکر تھا۔

کیف نے مختصر سا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"او کے... تم جاؤ، میں آتا ہوں۔"

وہ شخص خاموشی سے گردن ہلا کر واپس چلا گیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی کیف نے دوبارہ اپنی ڈائری کی طرف دیکھا۔

پھر آہستہ سے اے ایس پی کی تصویر اٹھائی۔

اس کی نظریں ایک بار پھر اُس نشان پر جا ٹھہریں۔

"سر، آپ نے مجھے بلایا تھا؟"

کیف نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ مراد دیمیر اس وقت اپنی میز پر جھکے کچھ ڈاکیومنٹس دیکھ رہے تھے۔

کمرے میں ہلکی سی کافی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی،

جبکہ باہر نیوز روم کا شور اب کافی مدھم پڑ چکا تھا۔

"ہاں کیف، آؤ... بیٹھو۔"

انہوں نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

کیف خاموشی سے آکر بیٹھ گیا۔

مراد دیمیر نے ہاتھ میں پکڑی فائل بند کی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

کل میں ایک ضروری کام سے باہر جارہا ہوں، اس لیے آفس نہیں آسکوں گا۔

کیف خاموشی سے سن رہا تھا۔

"لیکن یار، تم میرا ایک کام کر دینا۔"

"کون سا کام، سر؟"

"کل نائب سر کی طرف سے ایک لڑکی انٹرویو کے لیے آئے گی۔ اُس کا انٹرویو لینا ہے۔"

وہ ایک لمحے کو رکے، پھر معنی خیز انداز میں بولے۔

"اور ہر حال میں اُس کا انٹرویو کلئیر کرنا ہے، یہ اوپر سے آرڈر ہے۔"

کیف کی بھنویں ہلکی سی سکڑ گئیں۔

"جب وہ پہلے ہی سفارش پر آرہی ہے، تو پھر انٹرویو کی کیا ضرورت ہے؟"

اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

مراد دیمیر ہلکا سا مسکرائے، جیسے وہ اس سوال کی توقع پہلے سے رکھتے ہوں۔

"بس... سمجھا کرو، اوپر سے آرڈر ہیں۔"

کیف نے چند لمحے خاموش رہ کر میز پر پڑی فائلوں کی طرف دیکھا، پھر مختصر سا جواب دیا۔

"اوکے، سر۔"

مراد دیمیر نے دوبارہ ایک فائل کھولی۔

اور ہاں اے ایس پی والے کیس پر ابھی انویسٹیگیشن جاری ہے۔ لیکن تم بھی اس کیس کو ہر زاویے سے دیکھو۔"

ان کی آواز سنجیدہ ہو گئی۔

"ممکن ہے ہمیں کوئی نئی انفارمیشن مل جائے۔"

کیف نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

"شیور، سر۔"

مراد دیمیر نے ہلکا سا سر ہلایا۔

"اوکے، تم جا سکتے ہو۔"

کیف کرسی سے اٹھا اور خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھولتے ہوئے اُس کی نظر ایک لمحے کے لیے دوبارہ میز پر پڑی اے ایس پی کی فائل پر گئی۔

وہی تصویر...

وہی عجیب نشان۔

اگلے ہی لمحے وہ اپنے کیبن کی طرف بڑھ چکا تھا۔



بی اوغلو کی وہ صبح حد درجہ دلکش تھی۔ ہلکی سنہری دھوپ پرانی عمارتوں کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھی، جبکہ ٹھنڈی ہوا بوسفورس کی سمت سے چلتی ہوئی پورے علاقے میں ایک عجیب سی تازگی بکھیر رہی تھی۔

سڑکوں پر معمول کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ کہیں کیفے کے باہر لوگ کافی لیے بیٹھے تھے، تو کہیں دکان دار اپنے شٹرز کھول رہے تھے۔ فضا میں کافی، بارش زدہ سڑکوں، اور تازہ صبح کی ملی جلی خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

اور انہی مصروف گلیوں کے درمیان، ایک لڑکی جلدی جلدی قدم بڑھا رہی تھی۔

ہاتھوں میں فائلز اور ہینڈ بیگ پکڑے، ہلکے پنک رنگ کی لانگ فراک پہنے، بال نیٹلی ٹائی کیے ہوئے، اور کریم وائٹ کلر کا سٹالر گردن کے گرد لپیٹے ہوئے، وہ تقریباً بھاگتی ہوئی چل رہی تھی۔

آج اس کا انٹرویو تھا...

اور وہ بری طرح لیٹ ہو چکی تھی۔

اور اس بار قصور عنادل کا نہیں تھا، بلکہ اُس ٹیکسی ڈرائیور کا تھا جس کی گاڑی راستے میں خراب ہو گئی تھی۔

"یا اللہ خیر..." وہ بے اختیار بڑبڑائی اور قدم مزید تیز کر دیے۔

بالآخر وہ "حقیقت پوسٹ" کی عمارت کے سامنے پہنچ گئی۔

چند لمحوں کے لیے اس نے گہری سانس لی، پھر وقت ضائع کیے بغیر اندر داخل ہو گئی۔

"مجھے اگلے گھنٹے تک وہ رپورٹ چاہیے علی۔"

"اوکے، سر"

اُدھر دوسری منزل پر اپنے کیبن میں بیٹھا کیف آج معمول سے زیادہ مصروف تھا۔ کیونکہ مراد دیمیر آج آفس نہیں آئے تھے، لہٰذا اُن کے حصے کا کام بھی آج کیف ہی سنبھال رہا تھا۔

وہ اپنی میز پر جھکا کچھ اہم ڈاکومنٹس پر پیپر ورک کر رہا تھا، جب نیچے ریسیپشن پر عنادل کی آواز ابھری۔

"میرا نام عنادل نور ہے...

اور میں آج انٹرویو کے لیے آئی ہوں۔

آپ پلیز سر کو انفارم کر دیں۔"

کاؤنٹر پر بیٹھی خاتون نے مختصر سا سر ہلایا اور سامنے رکھا ٹیلی فون اٹھا لیا۔

"سر عنادل نامی ایک لڑکی انٹرویو کے لیے آئیں ہیں۔"

"بھیج دیں آپ اُنہیں۔" دوسری طرف سے کیف کی سنجیدہ آواز ابھری۔

"اوکے، سر"

ریسیپشنسٹ نے عنادل کو مخصوص آفس روم کا راستہ بتایا۔

عنادل نے ہلکے سے شکریہ ادا کیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

"علی مجھے اے ایس پی کے بیک گراؤنڈ کی تمام انفارمیشن آج شام تک چاہیے۔"

"اوکے، سر" علی سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

کیف اب بھی اپنے کام میں مصروف تھا، جب دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس"... وہ بغیر سامنے دیکھے، اسی مصروف انداز میں بولا۔

اگلے ہی لمحے عنادل اندر داخل ہوئی۔

"وہ سر، آج میرا انٹرویو تھا۔" وہ آہستہ سے بولی۔

کیف کے ہاتھ ڈاکیومنٹس پر رُک گئے۔

اس نے اپنی کلائی پر بندھی واچ پر نظر ڈالی۔

10:30...

جبکہ انٹرویو کا وقت 8:30 تھا۔

اس نے غصے سے دانت پیسے۔

"بیٹھیں۔"

وہ بغیر اوپر دیکھے بولا۔

عنادل خاموشی سے بیٹھ گئی۔

کیف ایک ڈاکیومنٹ اٹھائے اس کے صفحات پلٹنے لگا۔

"کیا آپ نہیں جانتیں کہ انٹرویو کا ٹائم کیا دیا گیا تھا؟"

وہ اسی مصروف انداز میں بولا۔

"سوری سر، ایکچولی میرے ٹیکسی ڈرائیور کی کار راستے میں خراب ہو گئی تھی۔"

"ایک تو آپ پہلے ہی سفارش پر یہاں آئی ہیں..."

اس کی آواز میں واضح طنز تھا۔

"اور اوپر سے جھوٹ بھی بول رہی ہیں۔"

اگلے چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ کیف نے پہلی بار سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔

وہ لڑکی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے، مس؟"

عنادل نے آہستہ سے چہرہ اوپر اٹھایا اور جیسے ہی کیف کی نظر اُس کی آنکھوں پر پڑں، تو وقت چند لمحوں کے لیے تھم سا گیا۔

وہی ہیزل گرین آنکھیں، وہ انہیں کیسے بھول سکتا تھا؟

پچھلے چند عرصے میں اگر کوئی چیز اس کے ذہن میں واضح رہی تھی... تو وہ یہی آنکھیں تھیں۔

عنادل کی نم آنکھوں سے ایک آنسو نکل کر گال پر بہہ گیا۔

"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا..."

وہ دھیمی آواز میں بولی۔

کیف اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا... مگر اُس کی نظریں ایک لمحے کو بھی اُن آنکھوں سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔

عنادل اُس کی نظروں میں الجھ سی گئی۔

پھر اچانک کیف کی نظریں اُس کے نازک ہاتھوں کی طرف گئیں۔

"جو تھپڑ آپ نے اُس دن مجھے رسید کیا تھا..."

وہ اُسی سنجیدہ انداز میں بولا۔

"واقعی قابلِ دید تھا۔"

عنادل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔اب اسے سمجھ آئی کہ سامنے بیٹھا شخص،وہی لفٹ والا بدتمیز لڑکا تھا۔

تو کیف بالآخر اُسے پہچان ہی گیا تھا۔

عنایہ واقعی سچ کہتی تھی...

کیف کے پاس تیسری آنکھ بھی موجود ہے۔

اچانک اُس کے ذہن میں وہ منظر گونجا۔

"بدتمیز!"

"تھپڑ!"

عنادل نے شرمندگی سے فوراً نظریں جھکا لیں۔

اور دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

"بدتمیز..."



رات کا سایہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ آج کی رات معمول سے مختلف تھی۔ ہوا میں عجیب سی سرد مہری بسی ہوئی تھی، جبکہ سنسان سڑکوں پر پھیلی خاموشی دل میں انجانا خوف اتار رہی تھی۔ دور کہیں بادلوں کی گرج سنائی دیتی، پھر سب کچھ دوبارہ خاموش ہو جاتا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے شہر جاگتے ہوئے بھی کسی ڈراؤنے خواب میں قید ہو۔ نیون لائٹس کی مدھم روشنیوں میں وہ لمبے قد والا شخص مسلسل کلب بار کے باہر چکر لگا رہا تھا۔ اُس نے اپنے چہرے کو سیاہ کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔

صرف اُس کی پراسرار آنکھیں نمایاں تھیں۔

وہ آنکھیں... جن میں عجیب سا سکون بھی تھا اور خطرناک بے چینی بھی۔ وہ بظاہر ایک عام شخص کی طرح واک کرتا دکھائی دے رہا تھا، مگر حقیقت اس سے کہیں مختلف تھی۔

اُس کا ہر قدم ناپا تلا تھا۔ ہر نظر حساب شدہ۔

اور ہر سانس... کسی مخصوص لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔

رات کے ٹھیک ڈھائی بجے، کلب بار کا دروازہ کھلا۔

اور وہاں سے ایک پُر رعب آدمی لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ باہر نکلا۔ وہ ڈی ایس پی تھا۔ نشے میں اس قدر دھت کہ اپنے قدم تک سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ شاید اُس شخص کی خوش قسمتی تھی کہ آج ڈی ایس پی کے ساتھ کوئی سیکیورٹی موجود نہیں تھی۔ یا شاید... یہ سب پہلے سے طے شدہ تھا۔

وہ سایہ نما شخص خاموشی سے اُس کے پیچھے چلنے لگا۔

اتنے فاصلے... سے کہ شک بھی نہ ہو۔

مگر اتنا قریب... کہ شکار اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکے۔

ڈی ایس پی بے خبری میں چلتا ہوا پارکنگ ایریا کی جانب بڑھا۔ اُسے ذرا احساس نہ تھا کہ اُس کے پیچھے چلنے والا شخص اُسے مسلسل دیکھ رہا ہے، شکار پر نظریں جمائے ہوئے۔

اگلے ہی لمحے... پیچھے چلنے والے اُس شخص کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھری۔

ایسی مسکراہٹ... جو انسان کے نہیں، کسی خطرناک ارادے کے پورا ہونے کی خبر دیتی ہے۔ جیسے وہ اب اپنے اصل مقصد کے بہت قریب پہنچ چکا ہو۔



ارزروم کی سرد ہوائیں ہر سو پھیلی ہوئی تھیں۔ گزشتہ رات ہونے والی شدید برف باری نے پورے شہر کو سفید چادر میں لپیٹ دیا تھا۔ سڑکوں، گلیوں اور گھروں کی چھتوں پر جمی برف صبح کی مدھم دھوپ میں چمک رہی تھی۔

درختوں کی شاخوں پر ٹھہری برف یوں لگ رہی تھی جیسے کسی نے روئی کے نرم گالے سجادیے ہوں۔

فضامیں عجیب سی خاموشی تھی...

سرد...

پرسکون...

اور کسی حد تک اداس بھی۔

چند لوگ موٹے کوٹ پہنے احتیاط سے برف پر چل رہے تھے، جبکہ دور کہیں بچوں کے قہقہے سنائی دے جاتے جو برف سے کھیلنے میں مصروف تھے۔

مگر اس خوبصورت صبح کے برعکس، اربش کے گھر کے اندر ماحول مکمل مایوسی میں ڈوبا ہوا تھا۔

زلیخہ اور اربش کافی دیر سے خاموشی کے ساتھ کاؤچ پر بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں تقریباً ہر ممکن طریقہ آزما چکی تھیں۔

انسٹا گرام...

فیس بک...

اور وہ تمام ایپس جہاں یوسف سے متعلق کوئی معلومات ملنے کا معمولی سا امکان بھی تھا۔ مگر ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ پھر بھی زلیخہ نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

وہ گھر سے ساجدہ بیگم سے چھپا کر ایک کانٹیکٹ ڈائری اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ ساجدہ بیگم کو نمبرز یاد رکھنے میں مشکل ہوتی تھی، اسی لیے وہ ہر نمبر نام کے ساتھ اس مخصوص ڈائری میں لکھ لیا کرتی تھیں۔

زلیخہ نے بچپن سے وہ ڈائری اُن کے پاس دیکھی تھی۔

مگر شاید پہلی بار اُسے اُس ڈائری کے ہونے کا فائدہ ہوا تھا۔

ڈائری میں بے شمار نمبرز درج تھے۔ کچھ اُن لوگوں کے جنہیں زلیخہ جانتی تھی، اور کچھ ایسے، جن کے نام تک اُس کے لیے اجنبی تھے۔ چند نمبرز تو بغیر کسی نام کے لکھے ہوئے تھے۔

پھر اربش اور زلیخہ نے باری باری اُن نمبرز پر کال کرنا شروع کی۔ اس دوران اربش اپنی شناخت بدل کر بات کرتی۔

"کیا آپ کا نام یوسف ہے؟"

کچھ لوگ فون اٹھا لیتے...

اور کچھ نہیں۔

اور چند نمبرز تو ویسے ہی بند جا رہے تھے۔

جنہوں نے کال اٹھائی بھی، اُن کا جواب نفی میں تھا۔

اتنی محنت...

اتنا وقت...

اور نتیجہ پھر بھی صفر۔

اب دونوں تھک چکی تھیں۔ مایوسی جیسے آہستہ آہستہ اُن کے وجود میں اتر رہی تھی۔

"او کے اربش... اب میں چلتی ہوں۔ امی سے شام تک آنے کا بول کر آئی تھی۔"

زلیخہ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا اور کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے... مگر سوری یار، میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکی۔" اربش نے افسردگی سے اُسے گلے لگا یا۔

"اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے، اربش۔"

زلیخہ ہلکا سا مسکرائی۔

"البتہ تم نے میری بہت مدد کی ہے... اُس کے لیے بہت شکریہ تمہارا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر دھیرے سے بولی۔

"باقی اگر اُس سے ملنا میری قسمت میں ہوا، تو میں ضرور ملوں گی۔"

اُس کی مسکراہٹ بے حد پھیکی تھی۔

جیسے امید اب بھی باقی ہو...

مگر تھک چکی ہو۔

پھر وہ الوداعی کلمات کہہ کر گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔ باہر اب بھی برفانی ہوا چل رہی تھی...

اور زلیخہ کے دل میں بھی۔



رات ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مزید گہری اور سرد ہوتی جارہی تھی۔ داڑالمرجان کے وسیع باغ میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی، جبکہ ٹھنڈی ہوا درختوں کی شاخوں کو آہستگی سے ہلا رہی تھی۔ آسمان پر موجود چاند کی مدھم روشنی پورے ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔

اصطبل کے قریب...

یلماز شاہباز کے پاس کھڑا اُس کے سر پر بے حد محبت سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ شاہباز خاموشی سے اپنی بڑی سیاہ آنکھوں کے ساتھ اپنے مالک کو دیکھ رہا تھا، جیسے اُس کے لمس میں چھپا ہر احساس سمجھتا ہو۔

"تمہارے بال پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئے ہیں، شاہباز۔"

یلماز دھیرے لہجے میں اُس سے بات کر رہا تھا۔ جیسے ہمیشہ کرتا آیا تھا۔

شاہباز نے آہستگی سے اپنا سر ہلایا، پھر اگلے ہی لمحے اُس نے محبت سے اپنا چہرہ یلماز کے کندھے کے قریب کر دیا۔

یوں... جیسے وہ بھی اپنے مالک کو چاہتا ہو۔ وہ منظر عجیب حد تک پُرسکون تھا۔

ایک ایسا شخص...

جس سے پوری دنیا خوف کھاتی تھی۔

اور ایک ایسا جانور...

جو اُس کے اندر چھپے طوفان کو خاموشی سے محسوس کرتا تھا۔

کچھ فاصلے پر کھڑے ایک ملازم کو یلماز نے اشارہ کیا۔

اگلے ہی لمحے وہ آگے بڑھا اور شاہباز کو اصطبل سے باہر لے آیا، پھر احترام سے واپس جا کر باقی گارڈز کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اب یلماز پُر سکون انداز میں دارُالمرجان کے وسیع باغ میں چل رہا تھا۔

جبکہ شاہباز مکمل فرمانبرداری سے اپنے مالک کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"پتا ہے شاہباز... آج اوزل نے مجھ سے کیا کہا؟"

یلماز کی آواز میں ہلکی سی تھکن تھی۔

"اُس نے کہا، بھائی آپ شادی کر لیں اب۔ کیا آپ ساری زندگی ہما کی موت کا غم مناتے رہیں گے؟"

وہ چند لمحے خاموش ہوا۔

"میں نے اُسے کچھ نہیں کہا... بس ڈانٹ کر خاموش کروا دیا۔"

سرد ہوا ایک بار پھر چلی۔

"تمہیں پتا ہے شاہباز..." اب اُس کی آواز پہلے سے زیادہ سرد ہو چکی تھی۔

"میں ہما کو پسند کرتا تھا۔ اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا، مگر اُس نے مجھے دھوکہ دیا۔"

شاہباز خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔

"اُس نے میری محبت کا سہارا لے کر، خود میرے دوست نیازی کے ساتھ افیئر چلا لیا۔"

یلماز کے چہرے پر خطرناک سکون ابھر آیا۔

"اور تم تو مجھے جانتے ہو نا شاہباز..." وہ رک گیا۔

"میں غداری معاف نہیں کرتا... کیونکہ جو شخص ایک بار وفا بیچ دے، وہ دوبارہ انسان کہلانے کے قابل نہیں رہتا۔"

چند لمحوں بعد اُس نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔

"اس لیے میں نے اُسے ختم کر دیا۔"

اُس کے قدم بے اختیار رکے۔ وہ مڑا اور شاہباز کی طرف دیکھنے لگا۔ چاند کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

میں بہت پہلے اپنے دل کو مار چکا ہوں...

اب میرے اندر دھڑکن نہیں، صرف سرد پتھر باقی ہے۔

پھر اُس نے نرمی سے شاہباز کی پشت سہلائی۔ شاہباز نے آہستگی سے اپنی گردن اُس کے قریب جھکا دی۔

یلماز اُس کے کان کے قریب جھکا اور دھیرے سے بولا۔

تم میرے رازدار ہو اور مجھے بہت خاص ہو۔

کیونکہ تم اُن انسانوں جیسے نہیں ہو، جو محبت کے نام پر زہر پلائیں۔

پھر وہ خاموشی سے اُسے واپس اصطبل کی جانب لے جانے لگا۔ رات اب پہلے سے کہیں زیادہ سرد ہو چکی تھی... مگر یلماز کے اندر اس سے کئی گنا زیادہ سردپن موجود تھا۔



کیفے کا اندرونی ماحول بے حد دلکش تھا۔

ہلکی سنہری روشنی پورے کیفے میں پھیلی ہوئی تھی جبکہ چھت سے لٹکتی وارم لائٹس ماحول کو نہایت پُرسکون بنا رہی تھیں۔

ایک جانب شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں موجود تھیں جن کے پار استنبول کی مصروف سڑکیں اور سرد موسم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کافی بینز کی خوشبو ہر طرف رچی ہوئی تھی، جبکہ آہستہ مدھم میوزک ماحول کو مزید

خوبصورت بنا رہا تھا۔

کچھ لوگ اپنے لیپ ٹاپس کھولے بیٹھے تھے، کچھ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے، جبکہ چند لوگ خاموشی سے کافی انجوائے کر رہے تھے۔

اربش اور عنادل کھڑکی کے قریب موجود ایک کارنر ٹیبل پر بیٹھی تھیں۔

"تو اب پھر ٹریٹ کب دے رہی ہو اپنے انٹرویو کلیئر ہونے کی خوشی میں؟" اربش نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

"جب کہو گی دے دوں گیں۔"

عنادل کافی کا سیپ لیتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اربش نے غور سے اُس کے چہرے کو دیکھا۔

"کیا ہوا ہے عنادل؟ تمہارا موڈ آف لگ رہا ہے۔"

عنادل چند لمحے خاموش رہی، پھر دھیرے سے بولی۔

"تمہیں وہ لڑکا یاد ہے جس نے لیفٹ میں میری مدد کی تھی؟"

"ہاں ہاں... بڑا کوئی نیک انسان تھا بیچارہ، تم نے آویں ہی اُسے تھپڑ جڑ دیا۔"

اربش نے کافی کا کپ تھامتے ہوئے کہا۔

"وہی میرا باس ہے۔"

اگلے ہی لمحے اربش کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

"سیریسلی؟" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

عنادل نے معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا۔

"خیر ہے یار، ٹینشن لینے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تم سوری کر لینا اُس سے... باقی اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو ایک اور تھپڑ رسید کر دینا۔" اربش اپنی ہنسی دباتے ہوئے بولی۔

"اب تم میرا مذاق تو نہیں بناؤ۔"

عنادل شرمندگی سے بولی۔

"ارے میں مذاق کر رہی تھی، چھوڑو کچھ نہیں ہوتا۔"

عنادل بھی آخر کار مسکرا دی۔

"اور ہفتے کو یونیورسٹی آنا مت بھولنا، ایک بہت بڑا ایونٹ ہے۔"

"کون سا ایونٹ؟"

"چیرٹی ایونٹ ہے، اور پتا ہے؟ استنبول کے مشہور بزنس مین یلماز یلدرز چیف گیسٹ کے طور پر آرہے ہیں۔"

اربش پر جوش انداز میں اُسے بتا رہی تھی۔

"یلماز یلدرز؟"

عنادل نے یہ نام پہلی بار سنا تھا۔

"تمہیں نہیں پتا؟"

اربش حیرانی سے بولی۔

عنادل نے نفی میں سر ہلایا۔

''یلماز یلدرز ترکی کے سب سے امیر لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، اور پتا ہے؟ میں نے تو جب سے اُن کا محل دیکھا ہے، میں تو اُن کی دیوانی ہو گئی ہوں۔ کیا عالی شان محل ہے..."

وہ پر جوش لہجے میں بولی، پھر فوراً موبائل نکال کر انٹرنیٹ پر دارُالمرجان کی تصاویر کھول لیں۔

عنادل بھی اب دلچسپی سے سکرین دیکھ رہی تھی۔

سنگِ مرمر سے بنا وہ وسیع پیلس واقعی کسی خواب جیسا لگ رہا تھا۔

"اللہ دیکھنا ذرا... یہ سینتیس سال کا کہاں سے لگتا ہے؟ کتنا ہینڈسم ہے۔"

اربش نے سکرین پر موجود یلماز کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا، جس میں وہ بلیک تھری پیس سوٹ پہنے اپنی شاہانہ کرسی پر بے حد رعب سے بیٹھا تھا۔

اُس کی سنجیدہ آنکھیں...

پُراسرار خاموشی...

اور شخصیت میں موجود عجیب سا خوف۔

وہ واقعی عام انسان نہیں لگتا تھا۔

عنادل اربش کی بہکی بہکی باتیں سن کر اب ہنس رہی تھی۔

"تمھیں ہر ہینڈسم انسان پسند آجاتا ہے۔"

"کیونکہ دنیا میں خوبصورتی اپریشیٹ کرنی چاہیے، میڈم."

اربش نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ جس پر عنادل بے اختیار ہنس پڑی۔



وہ یوں ہی اُداس سی گھر پہنچی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اُس نے ترکی کے عام گھروں کی طرح دروازے کے پاس اپنے جوتے ایک طرف ترتیب سے اتارے، پھر دیوار کے ساتھ لگے لکڑی کے ریک سے گھر والے نرم سلیپرز اٹھا کر پہن لیے۔ اُس نے اپنا سرمئی کوٹ اُتارا اور دروازے کے قریب لگے ہوکس میں سے ایک پر احتیاط سے لٹکا دیا۔

گھر کے اندر حسبِ معمول ہلکی سی چائے اور تازہ بیکڈ بریڈ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، جبکہ ہیٹر کی گرمائش سرد موسم کے باوجود ماحول کو پُرسکون بنا رہی تھی۔

وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی ہی تھی کہ اندر سے کسی عورت کے قہقہے اور مسلسل باتوں کی آواز سنائی دی، اور آواز پہچانتے ہی اُس نے منہ کا عجیب سا زاویہ بنایا۔

"یا اللہ... یہ پھر آ گئیں۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

وہ نسرین آنٹی تھیں۔ بچپن میں وہ ان کی پڑوسی ہوا کرتی تھیں، پھر اُن کے شوہر کی ٹرانسفر استنبول ہو گئی تھی اور وہ سب وہاں شفٹ ہو گئے تھے۔

نسرین آنٹی کی ایک بیٹی تھی... ہرا۔

اور نسرین آنٹی کا ماننا تھا کہ دنیا کی تاریخ میں ہرا جیسی قابل، حسین، سمجھدار، بااخلاق، نفیس، ذہین، شریف، اور تقریباً فرشتہ صفت لڑکی شاید دوسری پیدا ہی نہیں ہوئی۔

اگر کوئی پانچ منٹ اُن کے پاس بیٹھ جائے تو اُسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے ہرا نے بچپن میں ہی ناسا کا نظام سنبھال لیا تھا۔

"میں آ گئی ہوں امی!"

وہ ڈرائنگ روم کے قریب جاتے ہوئے بلند آواز میں بولی، مگر اگلے ہی لمحے پلٹ کر واپس اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

لیکن تبھی ساجدہ بیگم کی آواز آئی۔

"آ جاؤ اندر، دیکھو کون آیا ہے۔"

بس اُس لمحے زلیخہ نے دل ہی دل میں اپنی زبان کو لاکھ کلمات سے نوازا۔ اگر وہ خاموش رہتی تو اُسے نسرین آنٹی کے چہرے کا طواف نہ کرنا پڑتا۔

"السلام علیکم آنٹی۔" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"وعلیکم السلام بیٹا، کیسی ہو؟" نسرین آنٹی نے زبردستی اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"میں ٹھیک ہوں آنٹی..." وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہماری زلیخہ کا اتاترک یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہو گیا ہے،

بس تب سے بڑی خوش ہے۔"

ساجدہ بیگم فخر سے بتا رہی تھیں۔

زلیخہ نے فوراً نظروں سے ساجدہ بیگم کو اشارہ کیا کہ کیا ضرورت تھی انھیں بتانے کی؟

مگر ساجدہ بیگم نے بھی باقی ماؤں کی طرح اُلٹا اُسے گھور کر دیکھا، جیسے کہہ رہی ہوں۔

"کیوں نہ بتاؤں؟ آخر میری بیٹی نے اتنی بڑی یونیورسٹی میں اپنی محنت سے داخلہ لیا ہے، محلے والوں کو ڈھنڈورا نہ پیٹوں تو اور کیا کروں؟"

پھر اگلے پورے دو گھنٹے...

نسرین آنٹی نے ہرا کے بچپن سے لے کر اب تک کی کامیابیوں کی ایسی داستانیں سنائیں کہ زلیخہ کو لگا شاید وہ کسی موٹیویشنل سیمینار میں پھنسی ہوئی ہے۔

"پھر جب ہرا صرف تین سال کی تھی نا... تبھی اُس نے انگلش بولنا شروع کر دی تھی۔"

"اور پتا ہے؟ نرسری میں سب بچے کریونز سے کھیلتے تھے جبکہ میری ہرا شیپس بنا رہی تھی۔"

"ارے ایک بار تو پرنسپل نے خود مجھے بلا کر کہا کہ نسرین صاحبہ، آپ کی بیٹی عام بچوں جیسی نہیں ہے۔"

زلیخہ دل میں بولی۔

"ہاں، یہ بات تو اب پورے ترکی کو پتا چل چکی ہے۔"

جب بھی وہ بیچ میں "اللہ اللہ" کرتے ہوئے اٹھنے لگتی، نسرین آنٹی فوراً اُس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا لیتیں۔

"ارے بیٹھو تو... ابھی تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ پھر کیا ہوا تھا!"

زلیخہ اپنی ذات پر عظیم صبر کیے اُنہیں سنتی رہی۔ بالآخر وہ خاموش ہوئیں اور سامنے لگی کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اللہ اللہ، زاہد نے کہا بھی تھا آٹھ بجے تک آ جانا... دیکھو ذرا نو بج گئے ہیں، اب میں چلتی ہوں۔"

"اچھا بیٹا تمھیں بہت بہت مبارک ہو، تم نے..."

وہ یونیورسٹی کا نام بھول گئیں۔

"اتاترک یونیورسٹی..."زلیخہ نے فوراً یاد کروایا۔

آخر دو گھنٹے اپنے کان قربان کرنے کے بعد اتنا حق تو بنتا تھا۔

"ہاں وہی...ویسے وہ اُکاشہ کا بیٹا کیا نام تھا اُس کا..."

"یوسف..."زلیخہ فوراً بولی۔

"ہاں ہاں، یوسف۔ میں نے سنا ہے وہ بھی وہیں پڑھتا ہے۔"

یہ جملہ زلیخہ کے لیے کسی شفا سے کم ثابت نہ ہوا۔ پورے دن کی تھکن ایک لمحے میں ختم ہو گئی۔اُس کی آنکھوں میں فوراً چمک آگئی۔

اُس نے واقعی اُس لمحے کا شکر ادا کیا جب وہ نسرین آنٹی کے پاس آکر بیٹھی تھی۔اُسے یوں لگا جیسے دو گھنٹے کی اذیت کا اجر اچانک مل گیا ہو۔

وہ خوشی سے نسرین آنٹی کو دروازے تک چھوڑنے گئی، پھر اُن کے جاتے ہی بھاگتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔

اُسے فوراً اربش کو یہ خوشخبری دینی تھی۔

کہ شاید...

وہ بالآخر یوسف سے مل سکتی تھی۔



ایمبولینس کی تیز آواز...

سرخ اور نیلی روشنیاں اندھیرے میں بار بار چمک رہی تھیں۔

کسی کی گھبرائی ہوئی آوازیں...

مشینوں کی بیپ...

اور اس سب کے درمیان...

اسٹریچر پر پڑا ایک بے جان وجود۔

اُسے اپنے سینے میں اٹھتا ہوا وہ شدید درد دوبارہ محسوس ہونے لگا۔ سانس جیسے حلق میں اٹک رہی تھی۔

اس نے دھندلی نظروں سے اپنے برابر بیٹھے اُس شخص کو دیکھنے کی کوشش کی، مگر چہرہ واضح نہیں تھا۔

بس ایک سایہ...

ایک دھندلا سا وجود۔

”Kaif...! Stay awak!“

کسی کی مدھم آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے دوبارہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی، مگر ہر چیز مزید دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ سینے میں درد شدت اختیار کر گیا۔

اور اگلے ہی لمحے...

وہ یکدم اٹھ بیٹھا۔

ہانپتی سانسیں...

تیز دھڑکتا دل...

اور پیشانی پر ابھرتے پسینے کے ننھے قطرے۔

کمرے کی تاریکی میں چند لمحے اُسے یہی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اُسے احساس ہوا، وہ اپنے ہی کمرے میں تھا۔

اس نے بے ترتیبی سے سانس لیتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"پھر... وہی خواب..."

وہ تھکی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔

یہ خواب جیسے اب اُس کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔

اُس ڈر گزوالے حادثے کے بعد سے... وقفے وقفے سے یہی منظر بار بار اُس کے ذہن میں لوٹ آتا تھا۔

ایمبولینس...

دھندلا چہرہ...

اور سینے میں اٹھتا وہ ناقابل برداشت درد۔

کیف نے بے چینی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھا جگ اٹھایا اور گلاس میں پانی ڈالا۔

اُس کے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ وہ خاموشی سے پانی پینے لگا، جب اچانک موبائل کی رنگنگ پورے کمرے میں گونجی۔

اس نے فوراً ساتھ پڑا فون اٹھایا۔ سکرین پر نام دیکھتے ہی اُس کے چہرے کے تاثرات سنجیدہ ہوئے۔

Murad Demir Calling...

اس نے فوراً کال رسیو کی۔

"کیف، جلدی سے اس لوکیشن پر پہنچو میں تمہیں سینڈ کر رہا ہوں۔"

دوسری طرف مراد دیمیر کی آواز غیر معمولی حد تک سخت اور سنجیدہ تھی۔

"ڈی ایس پی کا قتل ہو گیا ہے۔"

کیف کی پیشانی پر بل نمایاں ہوئے۔

"میں آ رہا ہوں، سر۔"

کال ختم ہوتے ہی کمرے میں دوبارہ خاموشی چھا گئی۔

"ایک اور قتل..." وہ دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔

پھر اس کی نظر سامنے دیوار پر لگی کلاک پر گئی۔

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔

باہر ابھی مکمل اجالا نہیں ہوا تھا۔ شہر نیند اور بیداری کے درمیان معلق تھا۔

کیف نے گہری سانس لی، پھر بستر سے اٹھ کر جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔

پارکنگ ایریا اس وقت مکمل طور پر سیل کیا جا چکا تھا۔

چاروں طرف پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی سرخ اور نیلی روشنیاں مسلسل چمک رہی تھیں، جبکہ فضا میں عجیب سی سنجیدگی اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

کرائم سین کے گرد زرد رنگ کی ٹیپیں لگائی گئی تھیں، جن پر سیاہ حروف میں بار بار لکھا تھا۔

"CRIME SCENE – DO NOT CROSS"

بارش شاید کچھ دیر پہلے ہی رکی تھی۔

زمین اب بھی ہلکی گیلی تھی اور پارکنگ کی کونکریٹ سرفس پر پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے چمک رہے تھے۔

اسی گیلی زمین پر، ایک جگہ سفید چاک سے ٹریس کی گئی تھی۔ وہ انسانی جسم کا خاکہ تھا۔

سر...

بازو...

اور بے جان جسم کی پوری ساخت۔

چند آفیسر زارد گرد ایویڈنس کلیکٹ کرنے میں مصروف تھے۔

کوئی تصاویر لے رہا تھا، کوئی زمین پر جھک کر بلڈ سٹینز ایگزیمن کر رہا تھا۔ فضا میں فورینسک کیمیکلز اور گیلی مٹی کی ملی جلی بو پھیلی ہوئی تھی۔

کیف تیز قدموں سے وہاں پہنچا۔ اس نے سیاہ ہوڈی کے اوپر ڈارک کوٹ پہنا ہوا تھا جبکہ ہاتھ میں کیس فائل موجود تھی۔ اُس کے چہرے پر معمول کی سنجیدگی نمایاں تھی۔

کرائم سین کے داخلی حصے پر کھڑے پولیس آفیسر نے فوراً اسے روک لیا۔

"Excuse me, sir. Restricted area."

کیف نے خاموشی سے اپنی جیب سے لیدر کارڈ ہولڈر نکالا۔

پھر اپنا آئی ڈینٹیفیکیشن کارڈ اُس کی طرف بڑھایا۔

کارڈ پر واضح حروف میں لکھا تھا۔

Kaif Mansoor

Junior Investigator – Haqeeqat Post

آفیسر نے کارڈ کو غور سے دیکھا، پھر فوراً ایک طرف ہٹ گیا۔

"آپ جا سکتے ہیں, سر۔"

کیف نے مختصر سا سر ہلایا اور ٹیپ کے اندر داخل ہو گیا۔

اندر مراد دیمیر پہلے سے موجود تھے۔اُن کے ہاتھ میں کچھ فوٹو گرافس تھیں جبکہ چہرے پر واضح تھکن اور الجھن موجود تھی۔

"شکر ہے کیف تم آ گئے۔"

کیف اُن کے قریب آ کر رکا۔

مراد دیمیر نے زمین پر بنے چاک آؤٹ لائن کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی...آخر یہ کلر چاہتا کیا ہے۔"

کیف خاموشی سے جھکا۔اس نے اپنی جیب سے سفید گلوز نکالے اور آہستہ سے ہاتھوں میں پہن لیے۔

پھر وہ انتہائی غور سے اُس جگہ کا جائزہ لینے لگا جہاں کچھ دیر پہلے ڈی ایس پی کی ڈیڈ باڈی موجود تھی۔

اُس کی نظریں زمین پر موجود باریک نشانات، بلڈ ڈراپس، اور باڈی پوزیشن کو ابزرو کر رہی تھیں۔

مراد دیمیر نے اسی دوران کچھ فوٹوز اُس کی طرف بڑھائیں۔

"یہ ڈی ایس پی کی باڈی کی تصاویر ہیں۔"

کیف نے تصاویر ہاتھ میں لیں۔اگلے ہی لمحے اُس کی نظریں ایک تصویر پر جا کر رک گئیں۔

گردن پر وہی عجیب سا نشان۔

بالکل ویسا ہی...جیسا اے ایس پی کی گردن پر تھا۔

مراد دیمیر کی آواز دوبارہ ابھری۔

"اس کی گردن پر بھی وہی مارک ہے...جو اے ایس پی کی گردن پر بنایا گیا تھا۔"

کیف اب پوری توجہ سے تصاویر دیکھ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں اب پہلے جیسی حیرت نہیں تھی، بلکہ ایک خطرناک قسم کی سنجیدگی اترتی جا رہی تھی۔ جیسے اُس کے ذہن میں بکھرے ہوئے ٹکڑے آہستہ آہستہ آپس میں جڑنے لگے ہوں۔

وہ چند لمحے خاموش رہا۔

پھر اُس نے تصویر سے نظریں ہٹائے بغیر دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ رینڈم مڈررز نہیں ہیں..."

مراد دیمیر فوراً اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیف کی نظریں اب بھی اُس نشان پر جمی تھیں۔

"یہ کلر کوئی پیغام دے رہا ہے۔"



کیف اپنے کیبن میں وال بورڈ کے پاس کھڑا تھا۔

پورے بورڈ پر مختلف مقتولین کی تصاویر ایک خاص ترتیب سے لگی ہوئی تھیں، جنہیں سرخ دھاگوں کی مدد سے آپس میں جوڑا گیا تھا۔ کہیں کرائم سین کی تصویریں پن تھیں، کہیں پوسٹ مارٹم رپورٹس، اور کہیں مشتبہ افراد کے نام۔

کمرے کی مدھم روشنی میں وہ سرخ دھاگے کسی الجھی ہوئی تقدیر کی لکیروں جیسے محسوس ہو رہے تھے۔

کیف کے ہاتھ میں ایک سرخ مارکر تھا۔ وہ گہری سنجیدگی سے بورڈ کو دیکھ رہا تھا، جیسے ہر تصویر اُس سے کوئی راز کہنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اگلے ہی لمحے اُس نے دو تصویروں پر مارکر سے نشان لگایا۔ پھر اُن دونوں تصویروں سے نکلتے سرخ دھاگوں کو اُس ایک تصویر کے ساتھ جوڑ دیا جس میں ایک عجیب سا نشان بنا ہوا تھا۔

وہی پراسرار نشان... جو دونوں مقتولین کی گردن پر پایا گیا تھا۔ وہ زیرِلب بڑبڑایا۔

"Same mark... same pattern..."

وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور پورے بورڈ کو دوبارہ دیکھنے لگا۔

ایک تفتیش کار کی نظر سے۔ جیسے کسی پیچیدہ شطرنج کے کھیل میں اصل مہرہ تلاش کر رہا ہو۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف دیوار پر لگی گھڑی کی ٹِک ٹِک اور اے سی کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔

کیف اب مڑ کر اپنی میز کی طرف آیا۔

میز پر مختلف فائلیں، تصاویر، فرانزک رپورٹس اور کافی کے خالی مگز بکھرے پڑے تھے، جو صاف بتا رہے تھے کہ وہ کئی گھنٹوں سے اسی کیس میں الجھا ہوا تھا۔

اُس نے ایک موٹی فائل اٹھائی۔

جس میں ان دونوں مقتولین کی پوری بیک گراؤنڈ انفارمیشن موجود تھی۔

غیر قانونی کاروبار...

منی لانڈر نگ...

ڈرگ کنیکشنز...

اور کئی دوسرے جرائم۔

وہ خاموشی سے صفحات پلٹتا رہا۔ پھر اُس نے اپنی وہ مخصوص ڈائری اٹھائی جس میں وہ اس کیس سے متعلق ہر ابزرویشن لکھتا تھا۔

کیف نے قلم کھولا اور لکھنا شروع کیا۔

یہ قاتل صرف اُن لوگوں کو نشانہ بنا رہا ہے جن کا ماضی صاف نہیں...

ایسے لوگ جو دو نمبری میں ملوث تھے...

حرام کمانے والے...

اور جن کے نام کے ساتھ گناہوں کی ایک لمبی فہرست جڑی ہوئی ہے۔

وہ چند لمحے رکا۔ پھر ڈائری بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

اُس نے اپنی گردن کرسی کی پشت سے ٹکائی اور گہری سانس لی۔

تھکن اب اُس کے چہرے پر صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"آخر میں اب تک کیا پوائنٹ مس کر رہا ہوں...؟"

وہ اپنی پیشانی انگلیوں سے مسلتے ہوئے بولا۔

"جو مجھے اُس قاتل تک پہنچا دے گا..."

اُس نے آہستگی سے اپنا سر ایک جانب موڑا۔

اور کیبن کی شیشے سے بنی ہاف وال کے پار باہر دیکھا۔

پورا آفس اپنے معمول کے مطابق مصروف تھا۔

کوئی فائلیں ترتیب دے رہا تھا...

کوئی کمپیوٹر پر ٹائپنگ میں مصروف تھا...

اور کوئی کالز اٹینڈ کر رہا تھا۔

مگر اُن سب کے درمیان... اُس کی نظر جا کر عنادل پر ٹھہر گئی۔

وہ اپنی ڈیسک پر بیٹھی کسی فائل میں محو تھی۔اُس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح سادگی تھی،اور عجیب بات یہ تھی کہ... کیف کے ذہن میں چلتے خطرناک اور پراسرار خیالات کے شور میں بھی،وہ لڑکی اُسے ایک لمحے کے لیے سکون محسوس کروا رہی تھی۔

اب وہ بڑے غور سے عنادل کو دیکھ رہا تھا۔عنادل اپنی ڈیسک کے پاس کھڑی کچھ فائلز ارینج کر رہی تھی،جب علی اُس کے قریب آیا۔

"مس عنادل،دیکھ لیں... آپ کا آج پہلا دن تھا اور آج ہی آفس کا پورا دن اتنا ہیڈک بن گیا۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

عنادل بے اختیار ہنس پڑی۔

"واقعی...مجھے نہیں پتا تھا یہاں اتنا کام ہوتا ہے۔"

علی نے مصنوعی افسوس سے سر ہلایا۔

".Welcome to Haqeeqat Post"

دونوں بس کولیگز ہونے کے ناطے معمول کی گفتگو کر رہے تھے۔مگر دور اپنے کیبن میں بیٹھا کیف،خاموشی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

اور نہ جانے کیوں،اُس کی آنکھوں میں ناگواری سی اتر آئی۔

اُس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ میز پر رکھا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کیا۔

اگلے ہی لمحے کال اٹھالی گئی۔

"یس،سر؟"

دوسری جانب زوبی(جو ہیڈ آف کولیگز تھی)،کی آواز ابھری۔

"عنادل کو فوراً میرے کیبن میں بھیجیں۔"

کیف نے مختصر اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اوکے،سر۔"

کال ڈسکنیکٹ ہوتے ہی کیف دوبارہ اپنے موبائل سکرین پر نظریں جمائے بیٹھ گیا۔

چند لمحوں بعد...

ٹھک... ٹھک...

"کم ان۔"

دروازہ کھلا، اور عنادل اندر داخل ہوئی۔

"سر... آپ نے مجھے بلایا تھا؟"

وہ سامنے کھڑی مؤدبانہ انداز میں بولی۔

"جی۔" کیف نے نظریں موبائل سے ہٹائے بغیر کہا۔

"آپ نے وہ فائل کی رپورٹ کمپلیٹ کر لی ہے؟"

"بس ہاف رہ گئی ہے سر، باقی آلموسٹ ڈن ہے۔"

"تو باتوں کی بجائے اپنے کام پر فوکس کریں۔"

وہ اسی مصروف انداز میں موبائل کی سکرین پر انگلیاں چلاتے ہوئے بولا۔

"مراد سر کو وہ فائل آج ہی چاہیے۔ اس لیے جتنا جلدی ہو سکے کمپلیٹ کریں۔"

عنادل چند لمحے اُسے دیکھتی رہی۔ اُسے واقعی سمجھ نہیں آیا تھا کہ آخر کیف کہنا کیا چاہ رہا ہے۔

"سر، مجھے ایک بات بھی کرنی تھی..."

وہ اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔

اب کیف نے پہلی بار سر اٹھایا۔

"بولیں۔"

سر... مجھے اس ہفتے کی لیو چاہیے۔"

"کس لیے؟"

"ایکچولی ہماری یونیورسٹی میں ایک چیرٹی ایونٹ ہے، بس اُسی وجہ سے..."

"No leave."

اُس کا جواب فوراً آیا۔

"You can go."

لہجہ اتنا سرد اور دو ٹوک تھا، کہ مزید بات کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ چند لمحے وہ خاموش کھڑی رہی، پھر بنا کچھ کہے واپس مڑ گئی۔
وہ غصے اور شرمندگی کے ملے جلے تاثرات لیے تیز قدموں سے باہر نکلی۔
اس کے قدموں کی چاپ پورے فلور میں سنائی دے رہی تھی۔ پھر جاتے ہوئے اس نے دروازہ اس زور سے بند کیا کہ شیشے کی دیواروں والا پورا آفس چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گیا۔ سب کی نظریں بے اختیار کیف کے کیبن کی طرف اٹھ گئی تھیں۔
زوبی نے حیرت سے پلکیں جھپکیں۔ علی کے ہاتھ میں پکڑا کافی مگ وہیں رک گیا۔ اور باقی کولیگز ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔
اس آفس میں آج تک کسی نے کیف منصور کے کیبن کا دروازہ اس انداز میں بند کرنے کی جرات نہیں کی تھی۔
کیونکہ آفس میں کیف منصور کے نام کا ایک عجیب سا رعب موجود تھا۔ لوگ اُس سے بحث تو دور، اونچی آواز میں بات کرنے سے بھی کتراتے تھے۔
مگر آج... ایک نئی لڑکی اُس کے کیبن کا دروازہ اس زور سے بند کر کے گئی تھی۔ اور سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ کیف نے کوئی ردِ عمل نہیں دیا۔ وہ بس خاموشی سے چند لمحے بند دروازے کو دیکھتا رہا۔
وہ اپنی سیٹ پر آ کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر خفگی صاف نمایاں تھی۔
"کیا ہوا؟" علی نے دھیرے سے پوچھا جو سامنے اپنی کرسی پر بیٹھا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"کچھ نہیں۔" عنادل نے مختصر جواب دیا مگر اس کے لہجے کی ناراضی چھپی نہ رہ سکی۔
علی ہلکا سا مسکرایا۔
"لگتا ہے کیف سر نے پہلے ہی دن اچھی خاصی کلاس لے لی۔"
عنادل نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولی۔
"میں نے صرف ایک دن کی چھٹی مانگی تھی۔"
"اوہ..." علی نے لمبا سانس لیا۔
"تو پھر واقعی مسئلہ سنگین ہے۔"
وہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ عنادل مزید منہ پھلا کر کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ادھر شیشے کی دیوار کے اُس پار، کیف اب بھی خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اسے غصہ کیوں آیا تھا۔

علی صرف ایک کولیگ تھا۔ ایک عام سا لڑکا جو آفس میں سب سے ہنس کر بات کرتا تھا۔ پھر جب اس نے عنادل کو اُس کے ساتھ مسکراتے دیکھا تو اس کے اندر عجیب سی ناگواری کیوں اتری؟

کیف نے اپنی گردن کرسی کی پشت سے ٹکائی اور آنکھیں چند لمحوں کے لیے بند کر لیں۔

"Ridiculous..." وہ خود سے بڑبڑایا۔

"خود کو سمجھتا کیا ہے آخر؟" وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

"چھٹی مانگی تھی، کوئی جرم تو نہیں کیا تھا..."

وہ غصے میں فائل کے صفحات پلٹنے لگی۔

علی نے دھیرے سے اس کے قریب آ کر پوچھا۔

"مس عنادل... سب ٹھیک ہے؟"

"جی بالکل۔" اس نے بنا اس کی طرف دیکھے مختصر جواب دیا۔

علی کچھ اور بولنے ہی والا تھا کہ زوبی تیزی سے وہاں آ گئی۔

"مسٹر علی، آپ کی میٹنگ روم تھری میں کال آئی ہے۔"

"اوہ... اوکے۔" وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔

زوبی نے ایک نظر عنادل کو دیکھا پھر دھیرے سے بولی۔

"آپ نئی ہیں اس لیے شاید آپ کو اندازہ نہیں... سر کو فضول باتیں پسند نہیں۔"

عنادل نے سر اٹھایا۔

"میں نے فضول بات نہیں کی تھی۔"

اس کے لہجے میں دبی ہوئی ناراضی تھی۔

زوبی چند لمحے خاموش رہی پھر ہلکا سا مسکرائی۔

"ہاں... مگر سر کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ بھی وہاں سے چلی گئی۔

عنادل نے بے اختیار کیف کے کیبن کی طرف دیکھا۔ شیشے کی دیوار کے اُس پار وہ اب بھی اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔

ایک ہاتھ اس کی کنپٹی کے پاس ٹکا ہوا تھا جبکہ دوسرا ہاتھ میز پر پڑی فائل کے صفحات پلٹ رہا تھا۔

بظاہر وہ اپنے کام میں مصروف تھا... مگر حقیقت میں اس کی نظریں بار بار شیشے کے اُس پار بیٹھی عنادل کی طرف اٹھ رہی تھیں، اور ہر بار اسے وہی لفٹ والی لڑکی یاد آ رہی تھی۔

وہی کانپتی ہوئی آواز۔

وہی خوف سے بھری آنکھیں۔

وہی وجود جو اندھیرے میں سمٹ گیا تھا۔

کیف نے اپنی گردن کرسی کی پشت سے ٹکائی اور گہری سانس لی۔

"عجیب لڑکی ہو تم..."

وہ زیرِ لب بولا۔

"پہلے تھپڑ مارتی ہو پھر دروازے۔"

اس کے لبوں پر بے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ ابھری... وہ مسکراہٹ جو اس کے چہرے پر بہت کم آتی تھی۔



ارزروم کی یخ بستہ فضاؤں میں ایستادہ اتاترک یونیورسٹی دور سے ہی کسی عظیم علمی سلطنت کا منظر پیش کرتی تھی۔

برف سے ڈھکی ہوئی بلند و بالا عمارتیں، وسیع و عریض سڑکیں، اور ہر سمت پھیلا ہوا خاموش مگر باوقار ماحول۔

صبح کی نرم دھند ابھی مکمل طور پر چھٹی نہیں تھی۔

یونیورسٹی کے داخلی دروازے پر لگے بڑے سنہری حروف "Atatürk Üniversitesi" سرد دھوپ کی کرنوں میں چمک رہے تھے۔

زلیخہ یونیورسٹی کے مرکزی گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔

اس کی گردن بے اختیار اوپر اٹھی۔

سامنے موجود وہ شاندار عمارت اپنے وسیع ستونوں، بلند شیشے دار کھڑکیوں، اور جدید و قدیم طرزِ تعمیر کے حسین امتزاج کے باعث کسی شاہی محل کا گمان دے رہی تھی۔

یونیورسٹی کے بیچوں بیچ ایک کشادہ اسکوائر موجود تھا جہاں سفید برف کی تہہ بچھی ہوئی تھی۔

چند طالبعلم ہاتھوں میں کتابیں تھامے جلدی جلدی اپنی کلاسز کی طرف بڑھ رہے تھے، جبکہ کچھ کیفیٹیریا کے باہر کھڑے گرم کافی کے کپوں سے اٹھتی بھاپ میں سردی کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

یونیورسٹی کی عمارتیں الگ الگ بلاکس میں تقسیم تھیں۔

انجینئرنگ فیکلٹی کی عمارت خاص طور پر بے حد شاندار تھی۔ وسیع شیشے کے دروازے، اندر داخل ہوتے ہی لمبی روشن راہداریاں، دیواروں پر لگے جدید پراجیکٹس اور ترک سائنسدانوں کی تصاویر... ہر چیز وہاں موجود طلبہ کو یہ احساس دلاتی تھی کہ وہ کسی عام درسگاہ میں نہیں بلکہ خوابوں کی تعمیر گاہ میں موجود ہیں۔

راہداریوں میں ہلکی ہلکی کافی اور نئی کتابوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی کھڑکیوں سے باہر نظر آنے والے برف پوش پہاڑ اس منظر کو اور بھی سحر انگیز بنا رہے تھے۔

لائبریری یونیورسٹی کا شاید سب سے پُرسکون حصہ تھی۔

اونچی چھت، لکڑی کی خوبصورت شیلفیں، ہزاروں کتابیں، اور خاموشی میں ڈوبا ہوا ماحول۔

کیمپس کے ایک حصے میں وسیع گراؤنڈ تھا جہاں ہر موسم میں طلبہ کی رونقیں لگی رہتی تھیں۔ کہیں برف پر چلتے ہوئے قہقہے گونجتے، تو کہیں بینچوں پر بیٹھے طالبعلم مستقبل کے خوابوں پر گفتگو کرتے نظر آتے۔ اور ان سب کے درمیان کھڑی اتاترک یونیورسٹی... صرف ایک یونیورسٹی نہیں لگتی تھی، بلکہ ہزاروں خواب دیکھنے والوں کی ایک الگ دنیا محسوس ہوتی تھی۔

زلیخہ آج سیاہ رنگ کے ڈھیلے عبائے میں ملبوس تھی، جس کے نیچے ہلکے کریم رنگ کی لمبی شرٹ اور وائٹ ٹراؤزر جھلک رہے تھے۔ اس کے سر پر خوبصورتی سے جما ہوا سیاہ حجاب اس کے نرم نقوش کو مزید نفاست دے رہا تھا۔

ہاتھ میں پکڑا بیج رنگ کا بیگ اور پاؤں میں سفید اسنیکرز اسے ایک سادہ مگر بے حد دلکش لک دے رہے تھے۔

آج زلیخہ کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔ اور آج وہ بہت خوش تھی۔ یا شاید اس کی خوشی کی سب سے بڑی وجہ نئی یونیورسٹی نہیں... بلکہ یوسف تھا۔

وہی یوسف جسے اس نے برسوں پہلے آخری بار دیکھا تھا۔

بچپن کی چند دھندلی یادیں، چند ادھورے لمحے، اور ایک چہرہ... بس یہی کچھ تو تھا اس کے پاس۔

مگر پھر بھی اسے یقین تھا۔ اگر یوسف اس کے سامنے آجائے، تو وہ اسے ہزاروں لوگوں میں بھی پہچان لے گی۔

سرد ہوا کے جھونکے اس کے عبائے کے کناروں کو ہلکا سا لہرا رہے تھے جبکہ وہ اتاترک یونیورسٹی کے وسیع و عریض کیمپس میں کھڑی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

ہر سمت طلبہ کی چہل پہل تھی۔ کوئی ہاتھوں میں کتابیں لیے تیزی سے گزر رہا تھا، کوئی دوستوں کے ساتھ کھڑا ہنس رہا تھا، جبکہ کہیں دور کیفیٹیریا کے باہر کافی کے کپوں سے اٹھتی بھاپ سرد موسم میں گھل رہی تھی۔

زلیخہ نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا دل عجیب بے چینی سے دھڑک رہا تھا۔

"یا اللہ... بس ایک بار ملوا دیں..."

وہ دل ہی دل میں بولی۔ پھر وہ اپنے مخصوص بلاک کی طرف بڑھ گئی۔ شروع میں اسے راستے سمجھنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ کبھی وہ کسی راہداری میں غلط مڑ جاتی تو کبھی کسی اور فلور پر پہنچ جاتی۔ بالآخر چند طلبہ سے مدد لینے کے بعد وہ اپنی کلاس تک پہنچ ہی گئی۔

کلاس روم کا دروازہ دھیرے سے کھولتے ہی اس کی نظریں اندر کے ماحول پر جم گئیں۔

وسیع و کشادہ کلاس... اونچی چھت، سفید دیواریں، اور سامنے لگی بڑی ڈیجیٹل اسکرین ماحول کو نہایت جدید بنا رہی تھی۔

لمبی شیشے دار کھڑکیوں سے باہر برف سے ڈھکے درخت صاف دکھائی دے رہے تھے جبکہ اندر ہیٹر کی ہلکی گرمائش سردی کا احساس کم کر رہی تھی۔

کمرے میں قطار در قطار جدید ڈیسک رکھے تھے۔ چند طلبہ پہلے ہی آچکے تھے۔ جن میں سے کوئی لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا، کوئی نوٹس دیکھ رہا تھا، جبکہ کچھ لوگ آہستہ آواز میں گفتگو میں مصروف تھے۔ ہوا میں نئی کتابوں، کافی، اور ہلکے پرفیومز کی ملی جلی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

زلیخہ آہستہ سے چلتی ہوئی پچھلی جانب ایک خالی نشست پر جا بیٹھی، مگر اس کی نظریں اب بھی بے اختیار کلاس میں موجود ہر چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

شاید... شاید یوسف بھی اسی یونیورسٹی کی کسی راہداری میں موجود ہو۔ شاید وہ آج ہی اسے دیکھ لے، اور یہی خیال اس کے دل کی دھڑکن مزید تیز کرنے کے لیے کافی تھا۔

پہلی کلاس کا آغاز ہوا تو پروفیسر نے سب سے پہلے طلبہ کو اتاترک یونیورسٹی کی تاریخ سے روشناس کروایا۔ ان کی پُرسکون مگر باوقار آواز پورے کلاس روم میں گونج رہی تھی۔ کبھی وہ یونیورسٹی کے قیام کا ذکر کرتے، کبھی ان عظیم شخصیات کا جنہوں نے یہاں سے تعلیم حاصل کی تھی۔

پورا لیکچر تاریخ پر مشتمل تھا مگر حیرت انگیز طور پر کوئی بھی بور نہیں ہو رہا تھا۔ سب طلبہ بے حد دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

زلیخہ بھی خاموشی سے بیٹھی سنتی رہی، مگر اس کا دل بار بار کسی اور ہی خیال کی طرف بھٹک جاتا۔

یوسف...

کیا وہ واقعی اسی یونیورسٹی میں ہو گا؟

اور اگر ہو گا... تو کیا وہ اسے پہچان پائے گا؟

پہلا لیکچر ختم ہوا تو دوسرا پروفیسر کلاس میں آیا۔ انہوں نے مختصر سا اپنا تعارف کروایا اور پھر تھوڑا بہت پڑھانا شروع کر دیا۔

شاید پہلا دن ہونے کی وجہ سے آج پڑھائی کا خاص دباؤ نہیں تھا۔ طلبہ بھی نسبتاً ریلیکس دکھائی دے رہے تھے۔

بالآخر دوسرا لیکچر بھی ختم ہو گیا۔

"ہائے، میرا نام جولی ہے... اور آپ کا؟"

اپنے ساتھ بیٹھی لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ دوستانہ انداز میں بولی۔

"میرا نام زلیخہ ہے۔"

زلیخہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا۔

اور پھر دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں اجنبیت کی دیوار گرنے لگی تھی۔ جولی بے حد باتونی اور خوش مزاج لڑکی تھی جبکہ زلیخہ خاموش طبیعت کی ہونے کے باوجود اس کی کمپنی انجوائے کر رہی تھی۔

تیسرا لیکچر فری تھا، اس کے بعد ایک چھوٹا لیکچر اور پھر بریک تھی۔

زلیخہ اور جولی ابھی باتوں میں مصروف تھیں کہ اچانک کلاس روم کا ماحول یکسر بدل گیا۔

دروازہ کھلا... اور ایک پُررعب شخصیت اندر داخل ہوئی۔

نیوی بلیو شرٹ، جس کے دونوں کف بازوؤں تک فولڈ کیے ہوئے تھے، سفید پینٹ، پاؤں میں کالے لیدر لوفرز، اور دائیں کلائی پر بندھی سلور کرونوگراف واچ... بالوں کو نفاست سے جیل کے ذریعے سیٹ کیے وہ سیدھا ڈائس کی جانب بڑھا۔

ڈائس پر نصب اونچے مائیک کے سامنے آکر وہ رکا۔

اس کی شخصیت میں ایسا رعب تھا کہ پورا کلاس روم لمحے بھر میں خاموش ہوگیا۔ جو طلبہ ابھی ہنس رہے تھے، فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

اور لڑکیاں... وہ تو اسے دیوانگی سے دیکھ رہی تھیں۔ دیکھنے میں وہ بمشکل پچیس سال کا لگتا تھا۔ لمبا قد، مضبوط جسم، کشادہ کندھے، اور وہ سنجیدہ چہرہ... اس کی شخصیت میں عجیب سی کشش تھی۔ حالانکہ حقیقت میں وہ اکتیس سال کا تھا۔

زلیخہ اور جولی ابھی تک آپس میں مصروف تھیں کہ انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ پروفیسر کلاس میں آچکے ہیں۔

".You two, stand up"

اس نے مائیک کو ہلکا سا درست کرتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آواز اتنی رعب دار تھی کہ پوری کلاس فوراً مکمل خاموش ہوگئی۔

زلیخہ اور جولی نے حیرت سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر سامنے کھڑے شخص کو، اور پھر وہ دونوں کھڑی ہوگئیں۔

مگر زلیخہ... وہ تو جیسے ساکت رہ گئی تھی۔

اس کی نظریں حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ سامنے کھڑے شخص پر جمی تھیں۔

"یوسف..." وہ بے اختیار زیرِ لب سرگوشی کر بیٹھی۔

"اگر آپ دونوں کی باتیں اتنی ضروری ہیں، تو آپ کلاس چھوڑ کر جا سکتی ہیں۔"

وہ اسی رعب دار لہجے میں بولا۔

زلیخہ کو لگا شاید اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

یہ... یہ وہ بچپن والا یوسف کسی زاویے سے نہیں لگ رہا تھا۔

"Sorry sir..." جولی شرمندگی سے بولی۔

".Okay, sit down. And don't make that mistake again"

دونوں واپس بیٹھ گئیں۔ مگر زلیخہ کی نظریں اب بھی اسی پر جمی تھیں۔

"میرا نام اخفا یوسف ہے۔"

وہ پوری کلاس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن آپ مجھے پروفیسر یوسف بھی بلا سکتے ہیں۔"

اسی دوران اس کی نظر زلیخہ پر پڑی جو مبہوت سی اسے دیکھ رہی تھی۔ مگر اس نے اسے مکمل نظر انداز کیا اور مڑ کر پیچھے لگی بڑی ڈیجیٹل اسکرین کی طرف دیکھنے لگا۔

پھر اس نے لیکچر شروع کر دیا۔

اور واقعی اس کے پڑھانے کا انداز غیر معمولی تھا۔ وہ صرف ایک پروفیسر نہیں لگتا تھا، بلکہ ایسا شخص محسوس ہوتا تھا جو اپنے علم پر مکمل گرفت رکھتا ہو۔ اس کی آواز، اس کی باڈی لینگویج، ہر چیز میں اعتماد جھلکتا تھا۔

لڑکیوں کے لیے تو وہ کلاس کا سب سے خوبصورت منظر بن چکا تھا۔

بالآخر کلاس ختم ہوئی۔ طلبہ ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔ یوسف اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا جب زلیخہ ہمت کر کے اس کے قریب آئی۔

"یوسف..."

وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اگلے ہی لمحے یوسف اس کی طرف مڑا، اور اس کی گہری نیلی آنکھیں زلیخہ کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔

وہ آنکھیں، جو سمندر کی گہرائی جیسی محسوس ہوتی تھیں۔

ٹھنڈی، پُراسرار، اور بے حد گہری۔ ایسا لگتا تھا جیسے انسان ان میں اترتا چلا جائے اور پھر واپس نہ آ سکے۔

زلیخہ کو ہمیشہ سے یوسف کی آنکھیں سمندر جیسی محسوس ہوتی تھیں، اور واقعی... اس میں کوئی شک نہیں تھا۔

"پروفیسر یوسف۔"

یوسف نے اس کے لفظوں کی تصحیح کی اور پھر بنا ایک لمحہ رکے وہاں سے چلا گیا۔ جبکہ زلیخہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

حیران۔

خاموش۔

اور کسی انجانی کسک میں گھری ہوئی۔



داڑلمر جان کے اُس پُر شکوہ محل میں یلماز یلدرز کا کمرہ کسی بادشاہ کے خواب کی تعبیر محسوس ہوتا تھا۔ وسیع و عریض کمرے کی دیواریں ہلکے سیاہ اور سنہری رنگ کے امتزاج سے مزین تھیں، جن پر ترکی طرز کے نفیس نقش و نگار کندہ تھے۔ چھت سے لٹکتا عظیم الشان کرسٹل فانوس مدھم روشنی بکھیر رہا تھا، مگر اس وقت کمرے میں جان بوجھ کر نیم اندھیرا رکھا گیا تھا۔

سامنے دیوار بھر پر پھیلی فل سائز شیشے کی کھڑکیوں کے پار استنبول کی رات خاموشی سے سانس لے رہی تھی۔ دور باغ میں موجود فواروں کی آواز اس خاموشی میں عجیب سا سحر گھول رہی تھی۔

کمرے کے ایک کونے میں مہنگی کتابوں سے بھری عظیم لائبریری تھی، جبکہ دوسرے کونے میں سیاہ ماربل سے بنا فائر پلیس جل رہا تھا۔ فرش پر بچھا ایرانی قالین اور درمیان میں رکھی شاہانہ کرسٹل ٹیبل اُس کمرے کی ہیبت میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

اور انہی سب کے بیچ، اپنی مخصوص میجسٹک چیئر پر بیٹھا یلماز یلدرز کسی شکستہ بادشاہ کی مانند لگ رہا تھا۔

پورے کمرے میں اس وقت نیم اندھیرا تھا، اور ہلکے سے گانے کی مدھم سرگوشی گونج رہی تھی۔

وہ کمرے میں موجود اپنی میجسٹک چیئر پر بیٹھا تھا، ٹانگیں آگے رکھے چھوٹے سائز کے ٹیبل پر لمبی کیے، اور سر چیئر کے ساتھ ڈھلکائے۔ وہ اس وقت سیاہ رنگ کے ریشمی نائٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔

"دکھ اور سکھ کے راستے..."

اب اُس نے اپنے پاس رکھا اسموکنگ پائپ اٹھایا۔

"بنے ہیں سب کے واسطے..."

اُس نے اسموکنگ پائپ کو اپنے ہونٹوں کے درمیان رکھا۔

"جو غم سے ہار جاؤ گے..."

اب وہ خاموشی سے پائپ کے کش لگا رہا تھا۔

"تو کس طرح نبھاؤ گے..."

اب اُس نے ایک گہرا کش لیا۔

"خوشی ملے ہمیں کہ غم..."

"جو ہوگا بانٹ لیں گے ہم..."

اُس نے تھکی سانس کے ساتھ دھواں چھوڑا۔

"مجھے تم آزماؤ تو..."

"ذرا نظر ملاؤ تو..."

اُس نے اپنی آنکھیں بند کیں۔

"یہ جسم دو سہی مگر..."

اُسے بے اختیار ہما یاد آئی۔

"دلوں میں فاصلہ نہیں..."

اُس کی آنکھیں نم ہوئیں۔

"جہاں میں ایسا کون ہے..."

"کہ جس کو غم ملا نہیں..."

اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلا اور چہرے سے ہوتا ہوا اُس کے نائٹ سوٹ میں جذب ہو گیا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ۔"

وہ اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا، اور میوزک بھی بند کر چکا تھا۔

"بھائی..." اوزل اندر داخل ہوا۔

"یہاں آؤ۔" وہ اب سیدھا ہو کر بیٹھ چکا تھا۔

"آپ ابھی تک ناراض ہیں؟" اوزل یلماز کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

یلماز نے سر نفی میں ہلایا اور مسکراتے ہوئے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

"کھانا کھایا ہے تم نے؟"

"نہیں بھائی... بھوک نہیں تھی۔"

"بھوک نہ بھی ہو پھر بھی کھایا کرو۔ شکل دیکھی ہے اپنی؟ کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ بس فضول سی ایکٹیویٹیز میں لگے رہتے ہو، خود پر بھی دھیان دیا کرو۔" یلماز اُسے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"بھائی... آپ ناراض ہیں؟" اوزل نے ایک بار پھر پوچھا۔

"نہیں... بس تمہیں یہ پتا ہونا چاہیے کہ تم یلماز یلدرز کے بھائی ہو۔"

اوزل یلماز کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔

"انسان کی اصل بہادری اپنی غلطیوں سے بھاگنے میں نہیں، بلکہ اُنہیں اپنی روح پر لکھ کر اُن کا بوجھ اٹھانے میں ہوتی ہے۔ بزدل لوگ ہمیشہ اپنی ناکامیوں کا جنازہ دوسروں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔"

اوزل شرمندہ ہوا۔

"سوری بھائی..." اوزل بس اتنا ہی بول پایا۔

یلماز مسکرایا۔

"چلو آؤ، تمہیں کھانا کھلاؤں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

اوزل کی آنکھیں نم ہوئیں۔ وہ کھڑا ہوا اور یلماز کے گلے لگ گیا۔

"سوری بھائی... میں آئندہ ایسے نہیں کروں گا۔"

یلماز مسکرایا۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ اوزل کے سر کو چومتے ہوئے بولا۔

یلماز نے اوزل کو بچپن سے سنبھالا تھا، اور اوزل اُس کے لیے اُس کے بیٹوں جیسا تھا۔

پھر وہ دونوں خاموشی سے کمرے سے باہر کی جانب بڑھ گئے، جبکہ پیچھے رہ جانے والے اُس نیم تاریک کمرے میں اب بھی ہلکی سی تمباکو کی خوشبو اور اداس موسیقی کی بازگشت موجود تھی۔



وہ اپنی فائل مکمل کر کے مراد میر کے پاس لے آئی تھی۔

اُس وقت مراد میر اپنے کشادہ اور نہایت نفیس کیبن میں موجود تھے۔ لکڑی کی مہنگی میز پر مختلف فائلیں ترتیب سے رکھی تھیں جبکہ ایک جانب کافی کی ہلکی خوشبو فضا میں گھلی ہوئی تھی۔

مراد میر نے اُس کی فائل بغور دیکھی، پھر عینک اتار کر میز پر رکھی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی جانب دیکھا۔

"واقعی آپ محنت اور لگن سے کام کرتی ہیں۔"

وہ اُس کی قابلیت کو سراہتے ہوئے بولے۔

"شکریہ سر۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔

اسی دوران دروازہ کھلا اور کیف اندر داخل ہوا۔ جیسے ہی اُس کی نظر سامنے کھڑی عنادل پر پڑی، اُس کے قدم لمحہ بھر کو رکے، پھر وہ خاموشی سے ایک جانب آکر کھڑا ہو گیا۔

مراد میر نے دونوں کو دیکھا تو معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

"میں نے سنا ہے، عنادل آپ کو لیو چاہیے تھی؟"

وہ مصروف سے انداز میں ہاتھ میں موجود فائل پر سائن کرتے ہوئے بولے۔

عنادل نے ایک نظر کیف کو دیکھا پھر بولی۔

"یس سر، لیکن کیف سر نے صاف منع کر دیا۔" وہ روانی سے بولی۔

"تو آپ مجھ سے آکر پوچھتیں، یہاں کا ہیڈ میں ہوں کیف نہیں۔"

وہ اُسی مصروف انداز میں بولے۔

کیف حیرانی سے اب مراد سر کو دیکھ رہا تھا۔

"کب کی لیو چاہیے؟" مراد سر بولے۔

"اس ہفتے کی سر۔" وہ یکدم خوش ہوئی۔

"اوکے، آپ اپنی لیو رُوبی کو سبمٹ کروا دیجیے گا۔" وہ عنادل کو دیکھتے ہوئے بولے۔

عنادل بے حد خوش ہو گئی۔

"آپ کا بہت شکریہ سر۔"

کیف کو لگا اُس کی موجودگی اس وقت وہاں کوئی معنی نہیں رکھتی۔

"ارے کیف تم کھڑے کیوں ہو، بیٹھو۔" وہ کیف کو کھڑا دیکھتے ہوئے بولے۔

کیف دل میں بڑبڑایا، پھر ہلکے طنزیہ انداز میں بولا۔

"جی سر، ابھی بیٹھ جاتا ہوں... آخر اس کیبن میں میری اتنی تو عزت باقی ہونی چاہیے کہ کم از کم کرسی مل جائے۔"

پھر وہ خاموشی سے آکر بیٹھ گیا۔

مراد میر بے اختیار ہنس پڑے جبکہ کیف سنجیدہ سا چہرہ بنائے اُنہیں دیکھ رہا تھا، جیسے اُس نے کوئی بہت بڑی مظلومانہ بات کر دی ہو۔

"اوکے عنادل آپ جاسکتی ہیں۔"

"اوکے سر۔" وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔

دروازہ بند ہوا تو مراد میر اب کیف کی جانب متوجہ ہوئے۔

"ہاں بولو کیف۔"

"سر... آج آپ نے پہلی بار میرے بجائے کسی اور کی فیور کی ہے۔" کیف نے شکوہ ظاہر کیا۔

مراد میر مسکرائے۔

"کم آن کیف... وہ ابھی بچی ہے، اتنا چلتا ہے۔ اور ویسے بھی تمہارے چہرے پر صاف لکھا تھا کہ تم نے ضد میں لیو ریجیکٹ کی تھی۔"

کیف نے بے اختیار کھانسا اور نظریں چرالیں۔

"سر، میں ضد نہیں کرتا۔"

مراد میر ہنس پڑے۔

"ہاں ہاں، تم تو بہت معصوم ہو۔ پورا آفس جانتا ہے تمہاری سنجیدگی کے پیچھے کتنا خطرناک بچہ چھپا ہوا ہے۔"

کیف نے ہلکی سی مسکراہٹ دبائی، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔

"سر، کیس سے متعلق کچھ نئی انفارمیشن ملی ہے۔"

اگلے ہی لمحے دونوں دوبارہ اُس پیچیدہ کیس کی گفتگو میں مصروف ہو چکے تھے، مگر کیف کے ذہن کے کسی کونے میں اب بھی عنادل کے غصے سے دروازہ بند کرنے کی آواز گونج رہی تھی۔



یلدرز گروپ آف انڈسٹریز کی اُس عظیم الشان کانفرنس ہال میں اس وقت ترکی کے بڑے بڑے بزنس مین موجود تھے۔
وسیع ہال کی دیواریں سیاہ اور سنہری رنگ کے شاہانہ امتزاج سے مزین تھیں جبکہ درمیان میں رکھی لمبی ماربل ٹیبل اپنی چمک سے ہیبت پیدا کر رہی تھی۔ ہر کرسی کے سامنے کمپنی کا لوگو اور فائلیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔
ہال میں موجود ہر شخص کی نظریں بار بار دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ کیونکہ وہ سب اُس انسان کا انتظار کر رہے تھے جس کی ایک "ہاں" کئی کمپنیوں کو آسمان تک پہنچا سکتی تھی، اور ایک "نہ" اُنہیں زمین پر گرا سکتی تھی۔
اگلے ہی لمحے کانفرنس ہال کے دروازے کھلے۔
کالے رنگ کے بے حد مہنگے تھری پیس سوٹ میں ملبوس یلماز یلدرز اندر داخل ہوا۔ اُس کے مضبوط قدموں کی آواز پورے ہال میں گونج رہی تھی۔
سیاہ بالوں میں شامل چند سفید لٹیں اُس کی شخصیت کو مزید رعب دار بنا رہی تھیں۔ اُس کی کلائی پر بندھی رائل واچ اور چہرے پر موجود ٹھنڈا غرور ہی اُس کی طاقت کا اعلان کر رہا تھا۔
تمام لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ یلماز خاموشی سے چلتا ہوا اپنی مخصوص چیئر پر آکر بیٹھا۔ اُس نے میز پر پڑی فائل کھولی اور بغیر کسی تمہید کے بولا۔
"شروع کریں۔"
اگلے ہی لمحے ایک بزنس مین کھڑا ہوا۔
"مسٹر یلماز، ہماری کمپنی آپ کے نئے پراجیکٹ میں سرمایہ کاری کرنا چاہتی ہے۔ اگر ہم پارٹنرشپ کر لیں تو..."
"میں نقصان کے سودے نہیں کرتا۔"
یلماز نے اُس کی بات کاٹ دی۔

پورا ہال خاموش ہو گیا۔

وہ شخص ہلکا سا گھبرایا مگر پھر بھی بولا۔

"لیکن سر، ہماری کمپنی ترکی کی ٹاپ کمپنیز میں شمار ہوتی ہے۔"

یلماز نے آہستہ سے فائل بند کی، پھر اپنی گہری نظریں اُس پر جما دیں۔

"ترکی کی ٹاپ کمپنی ہونا اور یلماز یلدرز کے معیار تک پہنچنا، دونوں الگ چیزیں ہیں۔"

وہ شخص خاموش ہو گیا۔

اسی دوران ایک اور بزنس مین بول پڑا۔

"مسٹر یلماز، بزنس میں کبھی کبھی رسک لینا پڑتا ہے۔"

یلماز ہلکا سا مسکرایا۔

"رسک وہ لیتے ہیں جنہیں اپنی طاقت پر یقین نہ ہو۔ میں فیصلے کرتا ہوں، اور میرے فیصلے دوسروں کی قسمت بدل دیتے ہیں۔"

ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

پھر ایک نسبتاً عمر رسیدہ شخص بولا۔

"آپ کے ساتھ کام کرنا آسان نہیں مسٹر یلماز۔ لوگ کہتے ہیں آپ بے حد سخت انسان ہیں۔"

یلماز نے اپنی کرسی سے ٹیک لگائی۔

"لوگوں کو ہمیشہ وہی انسان سخت لگتا ہے جو اُنہیں اُن کی اصل اوقات یاد دلا دے۔"

کچھ لوگ بے اختیار ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

اسی لمحے ایک نوجوان بزنس مین طنزیہ انداز میں بولا۔

"ہر انسان کو کبھی نہ کبھی کسی کی ضرورت پڑتی ہے مسٹر یلماز۔"

یلماز کی آنکھوں میں خطرناک سی چمک ابھری۔

"شیر کبھی بھیڑوں کے سہارے سلطنت نہیں چلاتے۔"

وہ خاموش ہوا، پھر میز پر انگلی سے ہلکی دستک دیتے ہوئے بولا۔

"میں اُن لوگوں میں سے نہیں جو میز پر بیٹھ کر ڈیل مانگتے ہیں۔ میں وہ انسان ہوں جس کے سامنے لوگ اپنی بقا مانگتے ہیں۔"

ہال پر ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ تہہ میں کھڑا اصفدر خاموشی سے سب کے چہروں کے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا...

یلماز یلدرز صرف بزنس نہیں کرتا تھا، وہ لوگوں کے غرور توڑتا تھا۔



رات کافی ہو چکی تھی۔ ارزروم کی سرد ہوائیں کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا کر مدھم سی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ زلیخہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی، کندھوں پر گرم شال لیے، جبکہ اُس کے ہاتھ میں موجود موبائل کال پر تھا۔

کمرے کی ہلکی زرد روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی جہاں اس وقت عجیب سی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔

"اور وہ یوسف تمہارے ساتھ پڑھتا ہے؟"

دوسری جانب سے اربش نے پُرجوش انداز میں پوچھا۔

زلیخہ چند لمحے خاموش رہی، پھر کھڑکی سے باہر گرتی برف کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔

"وہ میرے ساتھ پڑھتا نہیں..."

وہ رکی۔

"پڑھاتا ہے مجھے۔"

اُس کی آواز میں ہلکی سی مایوسی شامل تھی۔

"کیا؟!" اربش تقریباً چیخی۔

"یعنی وہ تمہارا پروفیسر ہے؟"

"ہاں..."

زلیخہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"اوہ ہو... پھر تو مزے ہیں تمہارے۔ بچپن کا کرش اب پروفیسر بن کر سامنے آ گیا۔" اربش ہنس رہی تھی۔

مگر زلیخہ خاموش رہی۔ اربش فوراً سمجھ گئی کہ بات کچھ اور ہے۔

"کیا ہوا؟"

زلیخہ نے گہری سانس لی۔

"اُس نے مجھے پہچانا ہی نہیں..."

یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز بے اختیار دھیمی ہو گئی۔

"بلکہ..." وہ ہلکا سا ہنسی، مگر وہ ہنسی دکھ سے بھری تھی۔

"یوں لگا جیسے وہ پہچاننا ہی نہیں چاہتا۔"

اربش اب خاموش تھی۔

زلیخہ کی نظریں اب بھی باہر جمی ہوئی تھیں جہاں سفید برف آہستہ آہستہ زمین پر گر رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے اربش..." وہ آہستگی سے بولی۔

"میں نے اُسے ہزاروں لوگوں میں بھی پہچان لیا تھا۔ وہ آنکھیں... وہ آواز... وہ انداز... میں کیسے بھول سکتی تھی؟"

اُس کی آنکھیں نم ہوئیں۔

"لیکن اُس نے..." وہ رک گئی۔

"اُس نے تو میرا نام تک نہیں پوچھا۔"

اربش نے فوراً ماحول ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

"ارے ہو سکتا ہے پروفیسر والا رعب ڈال رہا ہو۔ کچھ لوگ یونیورسٹی میں زیادہ ہی سنجیدہ بنتے ہیں۔"

زلیخہ ہلکا سا مسکرائی۔

"نہیں... اُس کی آنکھوں میں عجنبیت تھی، ایسی عجنبیت جو انسان صرف غیروں کے لیے رکھتا ہے۔"

کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

پھر اربش بولی۔

"اور اگر واقعی وہ تمہیں بھول گیا ہو تو؟"

زلیخہ نے فوراً نفی میں سر ہلایا، جیسے خود کو بھی یقین دلانا چاہتی ہو۔

"نہیں، کچھ لوگ بھلائے نہیں جاتے اور یوسف... وہ تو میری پوری بچپن کی یاد تھا۔"

یہ کہتے ہوئے اُس کی نظریں پھر کہیں دور کھو گئیں، شاید ماضی کے اُن دنوں میں... جہاں ایک چھوٹا سا لڑکا ہمیشہ اُس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔



وہ ڈائننگ ٹیبل پر خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ اپارٹمنٹ میں مدھم سی وارم لائٹ پھیلی ہوئی تھی، جبکہ باہر استنبول کی رات آہستہ آہستہ مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سامنے میز پر کھانا موجود تھا، مگر اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ صرف پیٹ بھرنے کے لیے کھا رہا ہے... دل سے نہیں۔

اسی دوران اُس کے موبائل پر رنگنگ ہوئی۔

کیف نے بے دلی سے موبائل سکرین کی طرف دیکھا، اور اگلے ہی لمحے اُس کے ہونٹوں پر بے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"Phupo Calling..."

جیسے کسی نے اُس کی تھکی ہوئی روح کو چند لمحوں کے لیے سکون دے دیا ہو۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

ایک ہاتھ سے نوالہ توڑتے ہوئے، جبکہ دوسرا ہاتھ موبائل کو کان کے ساتھ لگائے ہوئے تھا، وہ ہلکا سا ایک جانب جھک گیا۔

"کیسے ہو کیف؟" فوزیہ پھوپو کی محبت بھری آواز ابھری۔

کیف کے چہرے کی سختی ذرا نرم پڑی۔

"آپ کو بہت مس کرتا ہوں..." وہ نوالہ لیتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

"اچھا؟ تو پاکستان آجاؤ ملنے۔"

یہ سن کر کیف آہستہ آہستہ نوالہ چبانے لگا۔ مگر اس بار اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور فوزیہ پھوپو اُس کی خاموشی کی وجہ بخوبی سمجھ چکی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے بات دوبارہ نہیں دہرائی۔

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ نرمی سے بولیں۔

"میں یہاں تمہارے پاپا کے پاس ہی آئی ہوں... بات کرواؤں اُن سے؟"

کیف کے ہاتھ چند لمحوں کے لیے رکے۔

اُس کے چہرے پر ایک لمحاتی امید ابھری...

بہت مدھم سی۔

"جی... کروادیں۔" وہ آہستہ سے بولا۔

فوزیہ پھوپو نے موبائل اپنی جانب بیٹھے منصور صاحب کی طرف بڑھایا۔ مگر انہوں نے دور سے ہی بات کرنے سے انکار کر دیا۔

چہرہ حسبِ معمول سنجیدہ تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ خاموشی سے اٹھے اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

فوزیہ پھوپو نے چند لمحے بند ہوتے دروازے کو دیکھا، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے دوبارہ فون کان سے لگایا۔

"وہ... تمہارے پاپا کی کوئی ضروری کال آ گئی ہے، اس لیے وہ اٹینڈ کرنے چلے گئے ہیں۔" انہوں نے مصنوعی معمولی پن سے کہا۔

کیف خاموش رہا۔

وہ سمجھ گیا تھا، پھوپو جھوٹ بول رہی تھیں۔ پاپا نے اُس سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

یہ احساس اُس کے اندر کہیں بہت گہرائی میں جا کر لگا۔ اُس نے آہستہ سے ہاتھ میں پکڑا نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

بھوک جیسے یکدم ختم ہو گئی تھی، اور جو نوالہ پہلے سے اُس کے منہ میں موجود تھا، نہ جانے کتنی مشکل سے اُس نے اپنے حلق سے نیچے اتارا تھا۔

جیسے کھانا نہیں...

کوئی تکلیف نگل رہا ہو۔

"پھوپو... میری ایک امپورٹنٹ کال آ رہی ہے، میں بعد میں کال کرتا ہوں۔"

اُس نے اپنی آواز کو معمول پر رکھنے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے، اللہ خوش رکھے تمہیں..."

فوزیہ پھوپو نے دعا دیتے ہوئے کہا، اور پھر کال بند ہو گئی۔

کال ختم ہونے کے بعد بھی وہ کافی دیر موبائل سکرین کو خاموشی سے دیکھتی رہیں۔

وہ جانتی تھیں، یہ کال اب دوبارہ نہیں آئے گی۔

ادھر کیف نے بے دلی سے میز پر رکھا باقی کھانا سمیٹا۔ پھر خاموش قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کے اندر دبی ہوئی تکلیف جیسے دوبارہ جاگ اٹھی۔

وہ بستر کے کنارے بیٹھ گیا،اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی آنکھوں میں آنسو اُبھر آئے۔ایک بار پھر پرانے زخم تازہ ہو گئے تھے۔

وہی احساسِ تنہائی...

وہی محرومی...

وہی باپ کی بے رخی۔

کیف نے فوراً چہرہ دوسری طرف موڑا اور جلدی سے آنسو صاف کیے۔

"میں اب نہیں روؤں گا..."

وہ بھاری آواز میں خود سے بولا۔

جیسے یہ جملہ کسی اور سے نہیں...اپنے ٹوٹتے ہوئے دل سے کہہ رہا ہو۔

پھر اگلے ہی لمحے وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا،کیونکہ شاید وہ جانتا تھا...اگر وہ مزید چند لمحے وہاں بیٹھا رہا،تو اُس کی آنکھیں ایک بار پھر اُس بچپن والے کیف کی طرح بہنے لگیں گی...

جو آج بھی اُس کے اندر کہیں زندہ تھا۔



کمرے میں ہلکی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر استنبول کی رات خاموشی سے اپنے سائے پھیلا رہی تھی جبکہ اندر صرف ٹی وی کی آواز گونج رہی تھی۔ عنادل صوفے کے ایک کونے میں بیٹھی تھی، گھٹنوں کو اپنے بازوؤں میں لیے، اور نظریں ٹی وی اسکرین پر جمائے ہوئے۔اس کے سامنے چائے کا کپ رکھا تھا جو کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

آج نہ جانے کیوں اس کا دل عجیب بوجھل تھا۔شاید انسان کچھ دنوں میں نہیں، کچھ رویّوں میں ٹوٹتا ہے۔

ٹی وی پر ایک مشہور پروگرام چل رہا تھا۔ موضوع تھا۔

"زندگی آخر ہے کیا؟"

اسٹیج پر دو لوگ موجود تھے۔ ایک اینکر، جبکہ دوسرا ایک عمر رسیدہ فلسفی، جس کے چہرے پر عجیب سا سکون تھا۔ ایسا سکون جو صرف بہت زیادہ درد سہنے کے بعد نصیب ہوتا ہے۔

اینکر نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"پروفیسر صاحب، سب سے پہلا سوال... زندگی آخر ہے کیا؟"

فلسفی ہلکا سا مسکرایا۔

"زندگی... انسان کی خواہشوں اور حقیقتوں کے درمیان پسا ہوا ایک سفر ہے۔ ہم سب کچھ نہ کچھ چاہتے ہیں، مگر زندگی ہمیں وہی دیتی ہے جو ہمارے لیے لکھا گیا ہوتا ہے۔"

عنادل خاموشی سے سن رہی تھی۔

اینکر دوبارہ بولا۔

"اگر زندگی اتنی مشکل ہے، تو پھر لوگ جینے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ آخر کیوں ہر انسان روز لڑتا ہے؟"

فلسفی نے چند لمحے خاموش رہ کر جواب دیا۔

"کیونکہ انسان امید پر زندہ رہتا ہے، ہر ٹوٹا ہوا انسان بھی دل میں کہیں نہ کہیں یہ یقین رکھتا ہے کہ شاید کل بہتر ہوگا۔ شاید اگلا دن اس کے زخموں پر مرہم رکھ دے۔"

عنادل کی آنکھیں نم ہوئیں۔ اسے اپنا وہ وقت یاد آیا جب وہ ہر رات خود کو یہی کہہ کر سلاتی تھی کہ، شاید کل سب ٹھیک ہو جائے۔

مگر کچھ کل کبھی نہیں بدلتے۔

اینکر نے اگلا سوال کیا۔

"زندگی انسان کو مایوس کیوں کرتی ہے؟"

فلسفی اس بار ہلکا سا ہنسا۔

زندگی مایوس نہیں کرتی...

ہماری توقعات کرتی ہیں۔

ہم لوگوں سے وفا چاہتے ہیں، حالانکہ اکثر لوگ صرف مطلب جانتے ہیں۔ ہم محبت دیتے ہیں، اور بدلے میں احترام کی امید رکھتے ہیں، مگر دنیا ہر احساس کی قیمت نہیں سمجھتی۔

عنادل کے دل میں جیسے کسی نے دبی ہوئی چوٹ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

ہارون کا چہرہ بے اختیار اس کے ذہن میں ابھرا۔

وہ لمحے...

وہ خاموشیاں...

وہ تکلیفیں...

اینکر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تو پھر انسان ان مایوسیوں سے باہر کیسے نکلے؟"

فلسفی نے گہری سانس لی۔

"سب سے پہلے یہ سمجھ لے کہ دنیا کسی ایک انسان پر ختم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی آپ کی قدر نہ کرے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بے قیمت ہیں۔ کچھ لوگ صرف آپ کی محبت کے قابل نہیں ہوتے۔"

عنادل کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔

فلسفی مزید بولا۔

"آج کی نوجوان نسل کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی پوری خوشی ایک انسان سے جوڑ لیتی ہے۔

وہ بھول جاتے ہیں کہ انسان بدل جاتے ہیں، رویّے بدل جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کا تعلق اپنے رب سے مضبوط ہو، تو پھر دنیا کی کوئی بے وفائی آپ کو مکمل طور پر نہیں توڑ سکتی۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی، اینکر نے آخری سوال کیا۔

"اگر آپ کو زندگی ایک جملے میں بیان کرنی ہو، تو آپ کیا کہیں گے؟"

فلسفی کی آنکھوں میں ہلکی نمی ابھری۔ پھر وہ دھیرے سے بولا۔

"زندگی ایک خاموش کتاب ہے، جسے ہر انسان اپنے درد اور صبر سے لکھتا ہے۔"

عنادل خاموش ہو گئی۔ ٹی وی اب بھی چل رہا تھا، مگر اس کی سوچیں کہیں اور جا چکی تھیں۔

شاید واقعی...

ہر درد انسان کو ختم کرنے نہیں، بدلنے آتا ہے۔



(باب:4)

(کرادنیز)

"بلیک سی"

ایک ایسا سمندر جس کی لہریں صرف پانی نہیں بلکہ سکون، وحشت، خوبصورتی اور پراسراریت اپنے اندر سمیٹے ہوئے محسوس ہوتی تھیں۔

ترکی کے شمال میں پھیلا یہ عظیم سمندر اپنی الگ ہی دنیا رکھتا تھا۔ یہاں کی فضا استنبول کی چمکتی روشنیوں سے بالکل مختلف تھی۔ ہر سو سرسبز پہاڑ، دھند میں لپٹی وادیاں، بادلوں کو چھوتے درخت، بارش کی ہلکی بوندیں، اور ٹھنڈی ہوائیں... ایسا لگتا تھا جیسے قدرت نے اپنی تمام تر خوبصورتی یہاں لا کر بسا دی ہو۔ کرادنیز کی خاص بات صرف اس کا سمندر نہیں تھا، بلکہ اس کے کنارے آباد شہر بھی تھے، اور انہی شہروں میں ایک شہر تھا۔

"طرابزون"

طرابزون، جہاں پہاڑ سمندر سے آ کر ملتے تھے۔ جہاں صبحیں اکثر بادلوں کی چادر اوڑھے جاگتیں، اور شامیں بارش کی خوشبو میں بھیگ جاتی تھیں۔ یہ شہر اپنی فطری خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اپنی تاریخ کی لیے بھی مشہور تھا۔ کبھی یہ قدیم "سلک روڈ" کا اہم حصہ رہا تھا، جہاں سے دنیا بھر کے تاجر گزرا کرتے تھے۔ یہاں کے لوگ سادہ مگر دلکش تھے، جبکہ یہاں کی چائے، مقامی موسیقی، اور لکڑی سے بنے پہاڑی گھر اس شہر کی پہچان تھے۔ اور انہی بلند پہاڑوں کے درمیان، یلمازیلدرز کا ایک پر تعیش نجی ولا موجود تھا، جبکہ دارُالمرَجان اس کی اصل سلطنت تھی جو استنبول میں واقع تھی۔ وہ ولا پہاڑ کی چوٹی پر تعمیر کیا گیا تھا، جہاں سے پورا بحیرہ اسود صاف دکھائی دیتا تھا۔

رات کے وقت جب نیچے شہر کی روشنیاں جگمگاتیں تو یوں محسوس ہوتا جیسے زمین پر ستارے بکھرے ہوں۔ اس ولا میں شیشے کی بلند دیواریں، وسیع بالکونیاں، ایک نجی اصطبل، گرم پانی کا انفینٹی پول، ہیلی پیڈ، اور پہاڑوں کی سمت کھلنے والے شاہانہ کمروں کی قطاریں موجود تھیں۔

سرد ہوا پورے ماحول میں گھوم رہی تھی۔ بادل اتنے نیچے آ چکے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے پہاڑوں نے انہیں اپنی آغوش میں قید کر لیا ہو۔اسی لمحے فضاء میں ہیلی کاپٹر کے پروں کی آواز گونجی۔

ولا کے اوپر موجود وسیع ہیلی پیڈ پر ایک سیاہ رنگ کا انتہائی مہنگا ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ لینڈ کرنے لگا۔ وہاں پہلے سے موجود گارڈز فوراً محتاط انداز میں سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ہیلی کاپٹر کے پروں سے اٹھتی تیز ہوا ارد گرد موجود درختوں کو ہلا رہی تھی۔ پھر دروازہ کھلا...اور اگلے ہی لمحے ایک بلند قامت شخصیت باہر اتری۔

سیاہ ہائی نیک، اس کے اوپر لمبا ڈارک گرے اوور کوٹ، کالی پینٹ، اور ہاتھ میں لیدر کے دستانے۔اس کے سیاہ بالوں میں موجود ہلکے سفید بال اس کی شخصیت کو مزید پر رعب بنا رہے تھے۔ وہ یلماز یلدرز تھا۔

بحیرہ اسود کی سرد ہوائیں بھی شاید اس شخص کے رعب کے آگے مدھم محسوس ہو رہی تھیں۔اس نے چند لمحے خاموشی سے سامنے پھیلے سمندر کو دیکھا۔ گہری لہریں پہاڑوں سے ٹکراتی دھند کے ساتھ عجیب سا منظر بنا رہی تھیں۔

"کرادنیز... وہ زیرِ لب بولا۔

"یہ جگہ آج بھی پہلے جیسی ہی پر سکون ہے۔"

صفدر اُس کے قریب آیا۔

"سر، شاہباز کو صبح ہی طرابزون منتقل کر دیا گیا تھا۔"

یلماز نے سر ہلایا۔

شاہباز...

اس کا محبوب گھوڑا۔

شاید دنیا میں اگر وہ کسی چیز سے واقعی مانوس تھا، تو وہ یہی گھوڑا تھا۔ وہ یہاں صرف ایک بزنس میٹنگ کے لیے نہیں آیا تھا، بلکہ خود سے چند دن گزارنے آیا تھا۔ شہر کے شور، سیاست، دھوکوں اور خون آلود کاروباری دنیا سے دور...

صرف وہ...

یہ پہاڑ...

اور شاہباز۔

وہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھا۔

کچھ فاصلے پر موجود شیشے کے اصطبل میں شاہباز کھڑا تھا۔ چمکتا سیاہ جسم، مضبوط ٹانگیں، اور ہوا میں لہراتی ریشمی ایال۔
جیسے ہی شاہباز نے اپنے مالک کو دیکھا، اس نے فوراً بے چینی سے زمین پر قدم مارا۔ یلماز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔
"دیکھا..." وہ صفدر کی جانب دیکھے بغیر بولا۔
"اس دنیا میں اگر کوئی میری آمد پر واقعی خوش ہوتا ہے، تو وہ صرف شاہباز ہے۔"
اور شاید یہ جملہ اس شخص کی پوری زندگی بیان کرنے کے لیے کافی تھا۔



طرابزون کی سرد اور نم ہواوں نے پورے ماحول کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ اس پہاڑی ولا کے اندر موجود وسیع کانفرنس ہال اس وقت مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہال کی دیواریں گہرے لکڑی کے پینلز سے بنی تھیں جبکہ سامنے شیشے کی پوری دیوار کے پار بحیرۂ اسود کی بے قرار لہریں دکھائی دے رہی تھیں۔ بیچ میں رکھی لمبی بلیک گلاس ٹیبل کے گرد ترکی کے چند بڑے بزنس مین موجود تھے، اور ٹیبل کے سرے پر یلماز یلدرز اپنی مخصوص شاہانہ خاموشی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سیاہ تھری پیس سوٹ، ہاتھ میں سلور رنگ کی مہنگی گھڑی، اور چہرے پر وہی پر سکون مگر خطرناک سنجیدگی۔
اس کے سامنے بیٹھا الپ کایا بار بار خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر حقیقت میں وہ اس شخص کے سامنے بیٹھ کر اندر ہی اندر دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا، اس کمرے میں اصل طاقت صرف ایک شخص کے پاس تھی۔
میٹنگ شروع ہوئی۔ الپ کایا کرسی سے ذرا آگے جھکا اور ہلکی تلخی سے بولا۔
"مجھے یاد ہے یلماز، تم نے میری کس طرح بے عزتی کی تھی۔"
کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سب نظریں یلماز پر جم گئیں۔ یلماز ہلکا سا مسکرایا، پھر نہایت سکون سے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"بے عزتی اُن کی ہوتی ہے، جن کی کوئی عزت ہو۔"
الپ کایا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کمرے میں بیٹھے باقی لوگ خاموش ہو گئے۔ یلماز نے اب پہلی بار نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

"اور جہاں تک مجھے یاد ہے..." وہ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"اُس دن تم خود میرے دفتر سے نکلتے وقت اتنے جلدی میں تھے کہ اپنی انا بھی وہیں چھوڑ گئے تھے۔"

چند لوگوں نے فوراً نظریں جھکالیں تاکہ اپنی ہنسی چھپا سکیں۔

الپ کے جبڑے بھینچے۔

"تم اب بھی خود کو سب سے بڑا سمجھتے ہو؟"

یلماز نے ٹیبل پر پڑا پین اٹھایا اور نہایت خاموشی سے گھماتے ہوئے بولا۔

"نہیں..."

پھر اس نے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"مجھے صرف اپنی قیمت معلوم ہے۔"

یہ جملہ سیدھا الپ کے غرور پر لگا۔

وہ واضح طور پر جل اٹھا تھا، مگر سامنے بیٹھا شخص اتنے سکون سے اسے ذلیل کر رہا تھا کہ جواب دینا بھی مشکل لگ رہا تھا۔

یلماز نے فائل کھولی۔

"اب اگر تمہاری انا کی میٹنگ ختم ہو گئی ہو، تو بزنس کی بات کر لیتے ہیں۔"

کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ صفدر نے فوراً اسکرین آن کی جہاں نئے پروجیکٹ کی پریزنٹیشن نمودار ہوئی۔

".Trabzon Coastal Resort Project"

یلماز نے اسکرین کی جانب دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا، یہ پروجیکٹ بحیرۂ اسود کے کنارے تعمیر ہو گا۔ لگژری ولاز، پرائیویٹ مرینہ، ہورس رینج اور سیون سٹار ریزاٹ۔

اس کی آواز ہمیشہ کی طرح پُر سکون مگر حکم چلانے والی تھی۔

"ہم کوالٹی پر کمپرومائز نہیں کرتے، اگر ایک خراب پتھر بھی لگا تو پوری بلڈنگ دوبارہ بنواؤں گا۔"

الپ کایا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کوسٹ بہت بڑھ جائے گی۔"

یلماز نے بنا تاثرات بدلے اس کی طرف دیکھا۔

"غریب لوگ خرچ گنتے ہیں الپ..."

وہ آہستہ سے بولا۔

"یلماز یلدرز معیار دیکھتا ہے۔"

الپ کے چہرے پر پھر تناؤ ابھرا۔

ایک اور بزنس مین نے فوراً بات بدلی۔

"سر، انویسٹرز آل ریڈی انٹرسٹڈ ہیں۔ اگر یہ پروجیکٹ سکسیس فل ہوا تو، بلیک سی ٹیورزم میں ریویولوشن آسکتا ہے۔"

یلماز نے سر ہلایا۔

"ہوگا نہیں، ہوچکا سمجھو۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

پھر اس نے فائل بند کی اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی موجودگی ہی پورے کمرے پر حاوی تھی۔ وہ چند قدم چل کر شیشے کی دیوار کے سامنے جا کھڑا ہوا جہاں باہر سمندر کی لہریں ٹکرا رہی تھیں۔

"لوگ کاروبار پیسے کے لیے کرتے ہیں..."

وہ سمندر کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"اور میں..."

اب وہ آہستہ سے مڑا۔

"میں حکومت کرنے کے لیے کرتا ہوں۔"

کمرے میں بیٹھا ہر شخص خاموش ہوگیا۔ اور الپ کا یا... وہ پہلی بار محسوس کر رہا تھا کہ شاید اس نے دوبارہ اسی شخص کے سامنے بیٹھ کر غلطی کی ہے جس کے سامنے بڑے بڑے لوگ اپنی آواز نیچی کرلیا کرتے تھے۔



آج پورے زور و شور سے طرابزون پر بارش برس رہی تھی۔

آسمان پر گہرے سرمئی بادل چھائے ہوئے تھے جبکہ ٹھنڈی ہوائیں بارش کے قطروں کو اپنے ساتھ لیے پورے شہر میں گھوم رہی تھیں۔ پہاڑوں پر پھیلے گھنے سبز درخت بارش میں نہا کر اور بھی دلکش ہو گئے تھے۔ کہیں دھند پہاڑوں کو اپنی آغوش میں لیے کھڑی تھی، تو کہیں بارش کی بوندیں خاموشی سے بحیرۂ اسود کی بے قرار لہروں میں جذب ہو رہی تھیں۔

طرابزون کی بارش عام شہروں جیسی نہیں ہوتی تھی۔

یہ شور نہیں کرتی تھی...

بلکہ سکون دیتی تھی۔

چھتوں پر گرتی بوندوں کی آواز، دور کہیں بجلی کی ہلکی گرج، اور مٹی میں بسی ٹھنڈی نمی... پورا ماحول یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قدرت خود خاموشی سے کوئی اداس دھن چھیڑ رہی ہو۔

اسی بارش بھرے موسم میں، شہر سے کافی بلند ایک پہاڑی پر واقع اس شاہانہ ولا کے اندر...

یلماز یلدرز شیشے کی وسیع دیوار کے سامنے کھڑا تھا۔

اس کے ہاتھ میں بلیک کافی کا مگ تھا، جبکہ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اس کی جیب میں موجود تھیں۔ سیاہ ہائی نیک اور ڈارک گرے ٹراؤزر میں ملبوس وہ شخص ہمیشہ کی طرح پرسکون مگر پر رعب لگ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس اونچائی سے پورا طرابزون دھند، بارش اور بادلوں کے درمیان ڈوبا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ نیچے دور سڑکوں پر گاڑیوں کی ہیڈلائٹس بارش میں دھندلی روشنی بکھیر رہی تھیں۔ بحیرۂ اسود کی لہریں بارش کے نیچے مزید گہری اور پراسرار محسوس ہو رہی تھیں۔ پہاڑوں کے دامن میں بنے لکڑی کے گھر، دھند میں چھپتے درخت، اور دور کہیں مسجد کے مینار سے ابھرتی مدھم اذان... یہ منظر کسی خواب جیسا لگ رہا تھا۔

یلماز نے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔ گرم کافی کی بھاپ سرد فضا سے ٹکرا رہی تھی۔ اسی لمحے پیچھے سے قدموں کی آواز ابھری۔

اس کا سیکرٹری صفدر نہایت ادب سے اس کے قریب آ کر رکا۔

"سر، آپ کے اس ہفتے کا شیڈول ریڈی ہے۔"

یلماز نے نظریں باہر کے منظر سے نہ ہٹائیں۔

".Good... tell me then"

وہ کافی کا سپ لیتے ہوئے بولا۔

"سوار اور منگل کو آپ فری ہیں۔"

صفدر نے ٹیبلیٹ پر نظریں جمائے کہنا شروع کیا۔

"بدھ کے دن شاہباز کی گرومنگ اپوائنٹمنٹ فکسڈ ہے۔"

اس جملے پر پہلی بار یلماز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"جمعرات کو آپ الپ کایا کے مینشن میں ڈنر پر انوائٹڈ ہیں۔"

یلماز خاموشی سے سنتا رہا۔

"اور جمعہ کو ہم واپس استنبول روانہ ہوں گے۔"

اب صفدر نے اگلی لائن پڑھی۔

"ہفتے کو آپ ایک چیرٹی ایونٹ میں انوائٹڈ ہیں۔"

کمرے میں چند لمحے خاموشی رہی۔

بارش اب بھی شیشوں سے ٹکرا رہی تھی۔

یلماز نے کافی کا آخری گھونٹ لیا، پھر آہستگی سے مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

"اوکے ڈن۔" وہ مختصر سا بولا۔

صفدر نے سر ہلایا اور وہاں سے چلا گیا۔

اب ایک بار پھر کمرے میں صرف بارش کی آواز باقی رہ گئی تھی۔ یلماز دوبارہ باہر دیکھنے لگا۔

کچھ لوگ بارش میں بھیگتے ہیں...

اور کچھ لوگ اپنی یادوں میں۔

شاید یلماز یلدرز دونوں میں سے دوسرا شخص تھا۔



ارزروم کی اُس ٹھنڈی صبح میں یونیورسٹی حسبِ معمول طلبہ کے شور اور قدموں کی چاپ سے آباد تھی۔ ہوا میں خزاں کی ہلکی سی خنکی گھلی ہوئی تھی جبکہ کیمپس کے درختوں سے زرد پتے آہستہ آہستہ زمین پر گر رہے تھے۔ اور انہی راہداریوں میں... زلیخہ تقریباً پورے ایک ہفتے بعد یونیورسٹی آئی تھی۔

ہاتھوں میں بکس اور بیگ تھامے، وہ تیز قدموں سے کوریڈور میں چل رہی تھی۔ مگر جیسے ہی اُس نے اپنی کلاس میں قدم رکھا، اُس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

بورڈ مکمل نوٹس سے بھرا ہوا تھا، طلبہ آپس میں لیکچرز ڈسکس کر رہے تھے، اور نوٹ بکس کے صفحات تیزی سے پلٹے جا رہے تھے۔ زلیخہ نے حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"یااللہ..." وہ بے اختیار بڑبڑائی۔

صرف ایک ہفتہ... اور کلاس اتنا زیادہ کام کمپلیٹ کر چکی تھی کہ اُس کا دماغ ہی گھوم گیا۔ اسی دوران جولی جلدی سے اُس کے پاس آئی۔

"فائنلی میڈم، تشریف لے ہی آئیں!"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ زلیخہ نے بے بسی سے اُسے دیکھا۔

"جولی، یہ سب کیا ہے؟

"اتنا کام...؟"

"کام؟" جولی نے معنی خیز انداز میں آنکھیں پھیلائیں۔

"کام تو ابھی سنو..." زلیخہ کے دل میں انجانی سی تشویش جاگی۔

"پروفیسر یوسف نے ایک امپورٹنٹ اسائنمنٹ دی تھی۔"

یہ نام سنتے ہی اُس کی دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"اور..." جولی نے مزید کہا۔

"اُسے ہر حال میں آج سبمٹ کروانا ہے، اور اُس کے مارکس آنے والی اسسمنٹ میں ایڈ ہوں گے۔"

"کیا؟!"

زلیخہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"جولی تم مذاق کر رہی ہو نا؟"

"Wish I was." وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

"اور پروفیسر یوسف نے واضح کہا تھا، لیٹ سبمیشن ایکسیپٹ نہیں ہو گی۔"

زلیخہ کے ہاتھوں میں پکڑی کتابیں جیسے مزید بھاری محسوس ہونے لگیں۔ وہ ایک لمحے کو خاموش کھڑی رہی۔

نہیں... وہ دوبارہ خود کو یوسف کے سامنے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ پہلے ہی اُس کے سامنے نہ جانے کتنی بار بے ترتیب اور الجھی ہوئی نظر آ چکی تھی۔

اور عجیب بات یہ تھی کہ، یوسف کے سامنے ہونے والی معمولی سی شرمندگی بھی اُسے دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ محسوس ہوتی تھی۔

"کلاسز؟" جولی نے پوچھا۔

مگر زلیخہ کے ذہن میں اب صرف ایک ہی چیز تھی... اسائنمنٹ۔

اُس نے فیصلہ کر لیا۔ بنا کچھ کہے وہ کوریڈور سے مڑی اور سیدھا لائبریری کی طرف بڑھ گئی۔

لائبریری ہمیشہ کی طرح پُرسکون تھی۔ لمبی شیلوز، کتابوں کی مخصوص خوشبو، اور کھڑکیوں سے اندر آتی دھیمی دھوپ، پورا ماحول خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

زلیخہ ایک کونے کی میز پر جا بیٹھی۔ اُس نے جلدی جلدی کتابیں کھولیں، نوٹ بک سامنے رکھی اور لکھنا شروع کر دیا۔

یوں اُس نے اپنی پہلی تین کلاسز بنک کر دیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ کبھی وہ ریفرنس بکس پلٹتی، کبھی نوٹس بناتی، اور کبھی پریشانی سے کلاک دیکھتی۔ پیشانی پر باریک پسینہ اُبھر آیا تھا، مگر قلم مسلسل چل رہا تھا۔

اور شاید دل کے کسی کونے میں یہ خوف بھی تھا، کہ وہ ایک بار پھر یوسف کی سنجیدہ نگاہوں میں خود کو ناکام نہ دیکھ لے۔



رات کے سوا نو بج رہے تھے جب یلماز یلدرز کا پرائیویٹ ہیلی کاپٹر ترابزون کے اُس عالی شان مینشن کے ہیلی پیڈ پر اترا جو الپ کایا نے خاص اُس کے استقبال کے لیے سجایا تھا۔

بارش اب بھی مسلسل برس رہی تھی۔ فضا میں بھیگی مٹی، گیلی گھاس اور سمندر کی نمکین ہوا گھلی ہوئی تھی۔

ہیلی کاپٹر کے بلیڈز کی تیز آواز کے درمیان جب یلماز نیچے اترا تو سیاہ لمبا اوور کوٹ اُس کے چوڑے کندھوں پر شان سے جما ہوا تھا۔ کالے چمکتے بوٹس بارش کے قطروں سے بھیگ رہے تھے جبکہ اُس کی سنجیدہ آنکھیں حسبِ معمول بے حد پر سکون تھیں۔

الپ کایا خود مینشن کے داخلی دروازے پر کھڑا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

"ویلکم یلماز۔"

وہ مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا۔

یلماز نے محض ایک سرسری نظر اُس پر ڈالی۔

"ہمیشہ کی طرح زندہ ہو، یہ اچھی بات ہے۔"

الپ کے چہرے کی مسکراہٹ لمحہ بھر کو ڈگمگائی مگر اُس نے خود کو سنبھال لیا۔

مینشن واقعی شاندار تھا، اونچی چھتیں، سنہری فانوس، سفید سنگِ مرمر کی سیڑھیاں، دیواروں پر مہنگی پینٹنگز اور ہر طرف قیمتی سجاوٹ۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ الپ کایا کے ایسے سو مینشن بھی یلماز یلدرز کے دارُالمرجان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

دارُالمرجان صرف ایک محل نہیں تھا، وہ یلماز کی طاقت، رعب اور حیثیت کی زندہ علامت تھا۔

ڈائننگ ہال میں صرف دو لوگوں کے لیے میز سجائی گئی تھی۔ باہر بارش شیشوں سے ٹکرا رہی تھی جبکہ اندر ہلکی کلاسیکل موسیقی فضا میں گھلی ہوئی تھی۔

"مجھے خوشی ہے تم آخر کار میرے ساتھ کام کرنے پر راضی ہو گئے۔" الپ نے وائن گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

یلماز نے خاموشی سے اپنی بلیک کافی کا سپ لیا۔

"خوشی تمہیں ہونی بھی چاہیے۔ ہر کسی کو یلماز یلدرز کے ساتھ بیٹھنے کا موقع نہیں ملتا۔"

الپ کے جبڑے سخت ہوئے مگر وہ مسکرایا۔

"تم آج بھی پہلے جیسے ہی مغرور ہو۔"

یلماز نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت سکون سے جواب دیا۔

"غرور وہ کرتے ہیں جن کے پاس کھونے کو کچھ ہو، میرے پاس تو سب کچھ ہے۔"

چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ پھر الپ نے فائل اُس کی جانب بڑھائی۔

"یہ نئی شپنگ ڈیل کے پیپرز ہیں۔ اگر ہم ساتھ کام کریں تو پورا بلیک سی ریجن ہمارے کنٹرول میں آ سکتا ہے۔"

یلماز نے فائل کھولی، چند صفحات دیکھے، پھر کرسی سے ٹیک لگائی۔

"تم اب بھی چھوٹا سوچتے ہو الپ۔"

وہ پر سکون لہجے میں بولا۔

"تم صرف بلیک سی چاہتے ہو جبکہ میں پورا یورپ اپنی میز پر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

الپ خاموش ہو گیا۔ ہر بار کی طرح آج بھی یلماز اُسے اُس کی اوقات یاد دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ڈنر ختم ہونے کے بعد یلماز بغیر کسی غیر ضروری بات کے کھڑا ہو گیا۔

"اتنی جلدی؟" الپ نے پوچھا۔

"میں اُن جگہوں پر زیادہ دیر نہیں رکتا جہاں مجھے سکون نہ ملے۔" یلماز نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

بارش اب مزید تیز ہو چکی تھی۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ ہیلی پیڈ پر کھڑا تھا۔ سرد ہوا اُس کے کوٹ کو ہلکا سا اڑا رہی تھی۔

ہیلی کاپٹر کے دروازے بند ہوئے اور پھر اگلے ہی لمحے وہ روشنیاں لیے تاریک، بارش بھری فضا میں بلند ہونے لگا۔

نیچے ترابزون کی بھیگی روشنیاں پھیلتی چلی گئیں، اور اوپر بیٹھا یلماز یلدرز ہمیشہ کی طرح سب سے بلند دکھائی دے رہا تھا۔



پوری کلاس میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف پروفیسر یوسف کی گہری اور رعب دار آواز سنائی دے رہی تھی جو کلاس روم کی دیواروں سے ٹکرا کر عجیب سا دباؤ پیدا کر رہی تھی۔ بڑی ڈیجیٹل اسکرین پر دل کا تھری ڈی ڈایا گرام بنا ہوا تھا جبکہ یوسف ہاتھ میں موجود ڈیجیٹل پین سے اس کے مختلف حصوں کی وضاحت کر رہا تھا۔

تمام طلبہ پوری توجہ سے اُسے سن رہے تھے۔ آخر وہ شخصیت ہی ایسی تھی کہ کوئی بے دھیانی کی ہمت نہیں کرتا تھا۔

ڈارک گرے شرٹ کے فولڈ کیے ہوئے کف اُس کی مضبوط کلائیوں کو نمایاں کر رہے تھے جبکہ چاندی رنگ گھڑی ہلکی روشنی میں چمک رہی تھی۔ پھر وہ خاموش ہوا۔ اس نے آہستگی سے پین میز پر رکھا اور کلاس کی جانب مڑا۔

"اب میں آپ لوگوں سے کل کے لیکچر کا ٹیسٹ لوں گا۔"

چند طلبہ کے چہروں کے رنگ اڑ گئے۔

"یو...اسٹینڈ اپ۔" اس نے سیدھا زلیخہ کی طرف اشارہ کیا۔

زلیخہ کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ دھیرے سے کھڑی ہو گئی۔

یوسف نے چند لمحے اُس کی طرف دیکھا پھر سنجیدگی سے سوال کیا۔

"انسانی دل کے اندر موجود کون سا حصہ خون کو پورے جسم میں پمپ کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے؟ اور بائیں وینٹریکل کی دیوار دائیں وینٹریکل سے زیادہ موٹی کیوں ہوتی ہے؟"

زلیخہ کے ہاتھ بے اختیار آپس میں جڑ گئے۔ اس نے جواب سوچنے کی کوشش کی مگر ذہن بالکل خالی ہو چکا تھا۔

"مجھے... نہیں پتا۔" وہ شرمندگی سے نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

کلاس میں دبی دبی ہنسی گونجی۔ زلیخہ کو یوں محسوس ہوا جیسے سب نظریں اُس کے وجود پر چبھ رہی ہوں۔ یوسف نے چند لمحے اُسے خاموشی سے دیکھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ پورا ہفتہ کہاں تھیں؟" اُس کی آواز اب پہلے سے زیادہ سرد تھی۔

"سوری پروفیسر..." زلیخہ بمشکل اتنا ہی کہہ پائی۔ کچھ طلبہ اب باقاعدہ مسکرا رہے تھے۔

یوسف کی آنکھوں میں سختی اتری۔

"سوری؟" وہ آہستگی سے بولا۔

یونیورسٹی کوئی تفریحی جگہ نہیں جہاں جب دل چاہے آ جاؤ اور جب دل چاہے غائب ہو جاؤ۔

زلیخہ کی انگلیاں کانپنے لگیں۔ مگر یوسف رکا نہیں۔

"اور اگر آپ کو پڑھائی میں دلچسپی نہیں تو کم از کم اُن لوگوں کا وقت ضائع نہ کریں جو واقعی یہاں کچھ سیکھنے آئے ہیں۔"

یہ جملہ تیر کی طرح زلیخہ کے دل میں اترا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی۔ ایک آنسو بے اختیار اُس کی پلک سے ٹوٹا اور اُس کے سیاہ حجاب میں جذب ہو گیا۔

وہ خاموش کھڑی تھی۔ اتنی خاموش جیسے کسی نے اُس کے اندر بولنے کی طاقت ہی ختم کر دی ہو۔

کلاس میں اب مکمل سکوت تھا۔ اور یوسف، وہ دوبارہ پلٹ کر اسکرین کی طرف جا چکا تھا۔

"نیل، آپ سب سے اسائنمنٹس کلیکٹ کریں۔" وہ بنا پیچھے دیکھے بولا، اور پھر اپنے کام میں دوبارا مصروف ہو گیا۔



طرابزون کی صبح ہمیشہ کی طرح حسین تھی۔ مگر آج اُس حسن میں کچھ اور ہی سکون گھلا ہوا تھا۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر ہلکی دھند تیر رہی تھی جبکہ دور دور تک پھیلے سرسبز جنگلات شبنم سے بھیگے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں درختوں کے پتوں کو ہولے ہولے ہلا رہی تھیں اور کہیں دور بہتے آبشاروں کی مدہم آواز فضا میں عجیب سی تازگی پیدا کر رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ہلکے ٹکڑے تیر رہے تھے اور سورج کبھی ان بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا تو کبھی اپنی سنہری روشنی پہاڑوں پر بکھیر دیتا۔

اسی حسین منظر کے درمیان یلماز یلدرز شاہباز پر سوار تھا۔

سیاہ رائیڈنگ کوٹ، کالے گلوز اور لمبے بوٹس میں ملبوس وہ ہمیشہ کی طرح بے حد باوقار لگ رہا تھا۔ شاہباز کی چمکتی سیاہ کھال صبح کی روشنی میں مزید دلکش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دونوں پہاڑی راستوں پر ایک عجیب ہم آہنگی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، یوں لگتا تھا جیسے شاہباز اپنے مالک کے دل کی ہر کیفیت سمجھتا ہو۔

کبھی یلماز ہلکا سا لگام کھینچتا اور شاہباز فوراً رفتار بدل لیتا، کبھی وہ اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرتا تو شاہباز محبت سے سر جنبش دیتا۔ دور پیچھے صفدر اور باقی گارڈز گھوڑوں پر اُن کے ساتھ موجود تھے۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ یلماز نے آج خود کو مکمل طور پر اس سکون کے حوالے کر دیا تھا جس کی اُسے مدتوں سے کمی محسوس ہوتی تھی۔ پھر اچانک اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل اب پہلے سے کہیں زیادہ گہرے ہو چکے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔

"صفدر۔" وہ گھوڑے کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے بولا۔

"جی سر۔"

"تم سب واپس جاؤ۔" صفدر چونکا۔

"لیکن سر بارش..."

"میں نے کہا واپس جاؤ۔"

اُس کی آواز پر سکون تھی مگر حکم ایسا کہ انکار ممکن نہیں تھا۔

"میں صرف شاہباز کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔"

صفدر فوراً خاموش ہو گیا۔ کوئی بھی یلماز یلدرز کے فیصلے کے آگے بولنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔

"اوکے سر۔"

کچھ ہی دیر بعد سب واپس مڑ گئے۔ اب وہاں صرف یلماز اور شاہباز تھے۔ یلماز گھوڑے سے اترا اور اُس کی گردن سہلاتے ہوئے آہستگی سے چلنے لگا۔ شاہباز بھی اُس کے ساتھ وفادار ساتھی کی طرح قدم ملا کر چل رہا تھا۔ پھر اچانک بارش کے چند قطرے زمین پر گرے۔ یلماز نے سامنے دیکھا، کچھ فاصلے پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا کاٹیج موجود تھا۔ وہ شاہباز کے ساتھ اُس طرف بڑھ گیا۔

طرابزون میں اچانک موسم بدل جانا عام بات تھی۔ ایک لمحہ دھوپ ہوتی اور اگلے ہی لمحے بارش پہاڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

یلماز نے دروازے پر دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھل گیا۔ سامنے تقریباً ستر سالہ ایک بزرگ خاتون کھڑی تھیں۔ سر پر پھولدار ترک اسکارف بندھا ہوا تھا جبکہ لمبا اونی لباس اور ہاتھ سے بنا ہوا گرم شال اُن کے وجود کو مزید سادہ اور پر نور بنا رہا تھا۔ چہرے پر عمر کی جھریاں تھیں مگر آنکھوں میں عجیب سی شفقت۔

"السلام علیکم... باہر بارش شروع ہو گئی ہے، کیا میں کچھ دیر یہاں رک سکتا ہوں؟" یلماز نے نہایت ادب سے کہا۔

پھر اُس نے شاہباز کی طرف دیکھا۔

"میرا گھوڑا بھی ساتھ ہے... کیا اُس کے لیے کہیں جگہ ہو سکتی ہے؟"

بزرگ خاتون کے چہرے پر فوراً اپنائیت بھری مسکراہٹ آ گئی۔

"آؤ آؤ بچے... ہمارے غریب خانے میں مدت سے کوئی نہیں آیا۔"

پھر وہ محبت سے بولیں۔

"اور فکر نہ کرو، پیچھے ایک چھوٹا سا اصطبل ہے، تمہارا گھوڑا وہاں رہ سکتا ہے۔" یلماز نے ممنونیت سے سر ہلایا۔

وہ شاہباز کو لے کر پیچھے گیا اور اُسے اصطبل میں باندھ کر اُس کی گردن سہلانے لگا۔

"بس تھوڑی دیر شاہباز..." وہ دھیرے سے بولا۔

اسی دوران بارش تیز ہوگئی۔ چھت پر گرتے قطروں کی آواز پورے ماحول کو مزید پرسکون بنا رہی تھی۔ یلماز واپس کاٹیج کے اندر آیا۔اندر کا ماحول چھوٹا مگر بے حد خوبصورت تھا۔

لکڑی کی دیواریں، چھت سے لٹکتی زرد روشنی والی لالٹین، ایک کونے میں جلتا ہوا فائر پلیس، ہاتھ سے بنی ہوئی رنگین قالینیں اور لکڑی کی پرانی کرسیاں... پورا گھر سادگی کے باوجود عجیب سی گرمی اور سکون دے رہا تھا۔

یلماز صوفے پر بیٹھ گیا۔ تبھی اُس نے ایک بزرگ مرد کو بھی دیکھا جو غالباً اُس خاتون کے شوہر تھے۔ بزرگ خاتون چائے بنا کر لائیں اور اُس کے سامنے رکھ دی۔

"اس سب کی ضرورت نہیں تھی، آپ لوگوں نے پہلے ہی بہت مہربانی کی ہے۔" یلماز نے نرمی سے کہا۔

خاتون مسکرائیں۔

"میرا نام فرشتے ہے اور یہاں سب مجھے اماں فرشتے کہتے ہیں۔"

یلماز کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ آئی۔

"اماں فرشتے... آپ اپنے نام کی طرح واقعی فرشتہ صفت خاتون ہیں۔"

وہ خوشی سے ہنس پڑیں۔

کافی دیر تک وہ اُس سے باتیں کرتی رہیں، اور حیرت انگیز طور پر یلماز خود کو بہت سکون میں محسوس کر رہا تھا۔

"شادی شدہ ہو؟" اماں فرشتے نے پوچھا۔

یلماز نے چائے کا سپ لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"چائے واقعی بہت مزیدار ہے اماں۔"

وہ مسکرائیں۔

"خدا تمہیں غزالی آنکھوں والی بیوی دے۔"

یلماز بس ہلکا سا مسکرایا۔ تبھی اُن کے شوہر بھی قریب آ گئے۔

"آج رات یہیں رک جاؤ بیٹا، کل چلے جانا۔"

"آپ کی محبت کا بہت شکر گزار ہوں، مگر آج مجھے واپس استنبول جانا ہے۔"

"تم استنبول میں رہتے ہو؟" اماں فرشتے نے پوچھا۔

"جی... مگر کبھی کبھی ایسے پرسکون ماحول میں سکون لینے چلا آتا ہوں۔"

اماں نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ تبھی اُن کے شوہر باہر جانے لگے۔

"وہ اتنی بارش میں کہاں جا رہے ہیں؟" یلماز نے پوچھا۔

"پاس والی مسجد میں اذان دینے... دراصل وہاں کے امام ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اچھا..." یلماز نے احترام سے کہا۔

پھر چند لمحے خاموشی رہی۔

"بیٹا... میری کوئی اولاد نہیں۔ ایک بیٹی تھی... وہ چھوٹی عمر میں ہی فوت ہو گئی۔ اُس کے بعد بس ہم دونوں ہی رہ گئے۔ آج تم آئے تو لگا جیسے میرا اپنا بیٹا آیا ہو۔"

یلماز کی آنکھوں میں پہلی بار عجیب سی نرمی اتری۔

"بالکل... میں آپ کا بیٹا ہی ہوں۔ اور اگر آپ کو برا نہ لگے تو دوبارہ بھی آؤں گا۔"

اماں فرشتے کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

"ضرور آنا... مجھے بہت خوشی ہو گی۔"

کچھ دیر بعد بارش رک گئی۔ یلماز نے اُن دونوں کا شکریہ ادا کیا، پھر شاہباز کو لے کر واپس اپنے ولا کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہاڑوں کے درمیان چلتے ہوئے اُس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ شاید مدتوں بعد اُسے کسی جگہ دل کو سکون ملا تھا۔



وہ اطمینان سے ایک ایک طالبعلم کی اسائنمنٹ کا رزلٹ سنا رہا تھا جو کل جمع کروائی گئی تھیں۔ کلاس روم میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف پروفیسر یوسف کی پُررعب آواز گونج رہی تھی۔ کچھ طلبہ کو وہ دوبارہ اسائنمنٹ بنانے کا کہہ چکا تھا جبکہ چند کو اُن کی محنت پر سراہ بھی چکا تھا۔

"یہ کیابنایاہے آپ نے؟یونیورسٹی لیول کی اسائنمنٹ لگ ہی نہیں رہی۔دوبارہ بنائیں۔"

ایک لڑکا شرمندگی سے سر جھکا گیا۔

پھراُس نے دوسری اسائنمنٹ اٹھائی۔

"گڈ...یہ کافی بہتر ہے۔"

زلیخہ خاموشی سے جولی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مگراُس کے دل میں عجیب بے چینی تھی۔وہ مسلسل اپنی انگلیاں آپس میں مروڑ رہی تھی۔اُسے ڈر تھاکہ نہ جانے یوسف اُس کی اسائنمنٹ کے بارے میں کیا کہے گا۔

تبھی یوسف کی بلند آواز گونجی۔

"زلیخہ ذولفقار..."اُس کادل زور سے دھڑکا۔

وہ خاموشی سے کھڑی ہوئی اور آگے بڑھ گئی۔یوسف نے اُس کی اسائنمنٹ ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔

"آپ نے اسائنمنٹ بہت اچھی بنائی ہے...ویری گڈ۔"

وہ اُس کی محنت سراہتے ہوئے بولا،پھراُس نے اسائنمنٹ اُس کی جانب بڑھادی۔

زلیخہ کے چہرے پربے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ایسالگا جیسے کسی نے اُس کے دل پر رکھابوجھ ہٹادیاہو۔

"تھینک یوسر..."وہ آہستگی سے بولی،پھر خاموشی سے واپس اپنی جگہ پر آگئی۔

آج اُس نے پورالیکچر غیر معمولی توجہ سے لیاتھا،نہ جولی سے باتیں کیں،نہ ادھر اُدھر دھیان دیااور یہ بات یوسف نے بھی نوٹ کی تھی۔

کلاس ختم ہوئی توتمام طلبہ بریک کے لیے باہر جانے لگے۔

زلیخہ بھی جولی کے ساتھ نکلنے ہی لگی تھی کہ یوسف نے اُسے اشارے سے روک لیا۔جولی نے فوراًمعنی خیز انداز میں اُسے دیکھا جبکہ زلیخہ کادل ایک بار پھر بے ترتیب ہوا۔

اب کلاس تقریباًخالی ہو چکی تھی۔زلیخہ خاموش اور بے چین دل کے ساتھ کھڑی تھی جبکہ یوسف اپنی فائلیں سمیٹ رہاتھا۔

چند لمحوں بعد وہ اُس کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ نے اسائنمنٹ پرواقعی بہت محنت کی ہے۔"

وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اگر آپ اسی طرح فوکس رکھیں گی تو مجھے یقین ہے آپ کلاس کے بہترین اسٹوڈنٹس میں آسکتی ہیں۔"

زلیخہ کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ خوشی بھی ابھری۔

"میں...مزید کوشش کروں گی پروفیسر۔" وہ بمشکل بول پائی۔

یوسف نے ہلکا سا سر ہلایا۔

"گڈ، اور ایک بات..."

زلیخہ کا دل پھر دھڑکا۔

"اپنی صلاحیت کو کبھی لاپرواہی کی نذر مت ہونے دیں۔ ہر کسی کو دوسرا موقع نہیں ملتا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی فائل اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اور پیچھے کھڑی زلیخہ...اُس کی خوشی کی واقعی کوئی انتہا نہیں تھی۔

یوسف نے آج اُسے الگ روک کر سراہا تھا۔ اور اُس کے لیے یہی بات دنیا کی سب سے بڑی خوشی بن گئی تھی۔



سب اسٹوڈنٹس کو آج کلاس میں ایک نئی ایکٹیویٹی دی گئی تھی۔ کلاس کا ماحول معمول سے مختلف تھا۔ ہر طرف ہلکی ہلکی سرگوشیاں تھیں، کچھ اسٹوڈنٹس ہنس رہے تھے، کچھ اپنی سیٹس پر جھکے جلدی جلدی کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ سامنے ڈائس پر پروفیسر یوسف اپنی مخصوص سنجیدہ شخصیت کے ساتھ کھڑا تھا۔ سفید شرٹ کے اوپر سیاہ کوٹ پہنے ہوئے، کلائی پر چمکتی سلور واچ اور وہی گہری نیلی آنکھیں جن میں عجیب سا رعب اور خاموشی بسی ہوئی تھی۔

"آج آپ سب کو ایک ایکٹیوٹی دی جارہی ہے۔"

اس کی بھاری آواز پورے ہال میں گونجی۔

آپ لوگ کسی بھی ٹاپک پر سوال لکھ سکتے ہیں۔ پرسنل

ایکاڈیمک، لائف ریلیٹڈ...اور اپنی تھنگ۔ لیکن شرط صرف یہ ہے کہ اپنا نام مینشن نہیں کرنا۔

پوری کلاس میں فوراً ہلچل مچ گئی۔ کسی نے مسکراتے ہوئے اپنے دوست کو کہنی ماری، کوئی جلدی جلدی سوچنے لگا کہ کیا پوچھا جائے۔

جولی فوراً زلیخہ کی طرف جھکی۔

"میں تو پوچھوں گی سر کبھی ہنستے بھی ہیں یا نہیں۔"

زلیخہ بے اختیار ہنس دی۔

"اور پھر اگلے دن تمہارا یونیورسٹی کارڈ بلاک ملے گا۔"

جولی نے زبان نکالی اور اپنی چٹ پر کچھ لکھنے لگی۔

زلیخہ بھی خاموشی سے اپنی چٹ کو دیکھنے لگی۔اس کے دل میں عجیب سی بے چینی تھی۔وہ کافی دیر قلم ہاتھ میں پکڑے سوچتی رہی... پھر آخر کار اس نے آہستگی سے لکھا۔

اگر کوئی انسان اچانک بدل جائے...اتنا بدل جائے کہ وہ آپ کو پہچاننے سے بھی انکار کر دے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس نے کبھی آپ کو اہم سمجھا ہی نہیں تھا؟

یہ لکھتے ہی اس کا دل زور سے دھڑکا۔اس نے فوراً چٹ فولڈ کی اور جلدی سے اٹھ کر سامنے رکھے شیشے کے بڑے باؤل میں ڈال دی۔کچھ دیر بعد تمام چٹس جمع ہو گئیں۔

یوسف نے باؤل اٹھایا اور ڈائس پر رکھ دیا۔پھر ایک چٹ کھولی۔

"Question number one..."

اس نے پر سکون لہجے میں پڑھا۔

"سر کامیابی زیادہ اہم ہے یا سکون؟"

کلاس خاموش ہو گئی، یوسف نے چند لمحے چٹ کو دیکھا پھر بولا۔

کامیابی وہ چیز ہے جس کے پیچھے دنیا بھاگتی ہے اور سکون وہ چیز ہے جو کامیابی ملنے کے بعد بھی اکثر نہیں ملتا۔اس لیے انسان کو پہلے اپنے اندر سکون پیدا کرنا چاہیے، ورنہ بڑی سے بڑی کامیابی بھی خالی لگتی ہے۔

کلاس میں چند لوگ متاثر ہو کر سر ہلانے لگے۔اس نے دوسری چٹ کھولی۔

اگر کوئی انسان ہمیں چھوڑ جائے تو کیا ہمیں بھی اسے چھوڑ دینا چاہیے؟

یوسف ہلکا سا مسکرایا، مگر وہ مسکراہٹ آنکھوں تک نہیں پہنچی۔

بعض لوگ زندگی سے چلے جاتے ہیں مگر انسان کے اندر سے نہیں جاتے۔ چھوڑ دینا آسان لفظ ہے، مگر حقیقت میں کچھ لوگ انسان کے وجود میں دفن ہو جاتے ہیں۔

زلیخہ کی نظریں بے اختیار اس کے چہرے پر جم گئیں۔

پھر ایک اور چٹ کھلی۔

"سر، کیا محبت انسان کو کمزور بنا دیتی ہے؟"

نہیں..."وہ فوراً بولا۔"

غلط انسان سے محبت انسان کو کمزور بنا دیتی ہے، پر صحیح انسان کی محبت انسان کو بہتر بناتی ہے۔

کلاس میں خاموشی چھا گئی۔

زلیخہ کا دل اب تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ بے صبری سے اپنی چٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک ایک کر کے تمام چٹس ختم ہونے لگیں۔ شیشے کے باؤل میں اب صرف دو چٹس بچی تھیں۔

اس نے بے اختیار اپنے ہاتھ آپس میں جکڑ لیے۔

"یااللہ... اگر اس نے میرا سوال پڑھ لیا تو؟"

اس کے دل میں گھبراہٹ اٹھی، مگر اگلے ہی لمحے وہ خود کو تسلی دینے لگی۔

اسے کیسے پتا چلے گا کہ وہ میری چٹ ہے؟ آخر نام تو لکھا ہی نہیں۔۔۔

یوسف نے آخری دو چٹس بھی پڑھ دیں، مگر وہ سوال نہیں آیا۔

زلیخہ کی پیشانی پر شکن ابھری۔ باؤل اب مکمل خالی ہو چکا تھا۔

".Class dismissed"

یوسف اپنی فائلز اٹھاتا ہوا باہر چلا گیا۔

تمام اسٹوڈنٹس بھی آہستہ آہستہ کلاس سے نکلنے لگے۔ جولی نے زلیخہ کی طرف دیکھا۔

"چلیں کینٹین...؟"

زلیخہ فوراً اپنے سر کو ہاتھ لگا کر بولی۔

تم جاؤ میرا سر بہت درد کر رہا ہے، میں تھوڑی دیر یہیں بیٹھوں گی۔

"میں رک جاؤں؟"

"ارے نہیں، تم کیوں اپنی بریک خراب کرو۔"

جولی اس کے بے وجہ اصرار کو سمجھ نہ سکی، مگر آخر کار کندھے اچکاتی ہوئی چلی گئی۔

جیسے ہی کلاس خالی ہوئی زلیخہ فوراً اٹھ کر ڈسٹبین کے پاس آگئی۔ اس نے گھبراہٹ سے ایک ایک چٹ نکال کر دیکھنا شروع کی۔ کاغذوں کی آواز خاموش کلاس میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

ایک...

دو...

تین...

مگر اس کی چٹ وہاں نہیں تھی۔

اس کی سانس اٹکی۔ اس نے دوبارہ تمام چٹس الٹ پلٹ کر دیکھیں، پھر بھی نہیں۔

یہ کہاں گئی؟" وہ حیرانی سے سرگوشی کی حد تک بولی۔"

اسی لمحے کلاس کے دروازے کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ گونجی۔

زلیخہ چونک کر پلٹی۔۔۔



وہ اپنے آفس میں آیا اور خاموشی سے اپنی چیئر پر بیٹھ گیا۔

کمرے میں ہلکی سی بکس اور کافی کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے شیشے کی دیوار کے اُس پار یونیورسٹی کی عمارتیں شام کی مدھم روشنی میں نہائی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ یوسف نے چند فائلز میز کے ایک کونے پر رکھیں، پھر اپنی ٹائی کو دو انگلیوں سے کھینچ کر ذرا ڈھیلا کیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی تھکن تھی۔ اب اس نے پاس رکھا پانی کا جگ اٹھایا اور گلاس میں پانی انڈیلا۔ چند گھونٹ پینے کے بعد اس نے سر کرسی کے ساتھ ٹکا دیا اور آنکھیں چند لمحوں کے لیے موند لیں۔

پھر... اس کے لبوں پر نہایت مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

اس نے اپنے کوٹ کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہلکے گلابی رنگ کی فولڈڈ چٹ نکالی، یہ وہی چٹ تھی جسے اس نے کلاس میں نہایت مہارت سے سب کی نظروں سے چھپالیا تھا۔

جب وہ آخری چند چٹس پڑھ رہا تھا، اسی دوران اس نے زلیخہ والی چٹ کھولی تھی۔

سوال پڑھتے ہی اس کی نیلی آنکھوں میں ایک عجیب سا توقف آیا تھا... مگر اگلے ہی لمحے اس نے بالکل معمول کے انداز میں دوسری چٹ اٹھانے کا تاثر دیا، جبکہ زلیخہ والی چٹ خاموشی سے اس کی انگلیوں کے نیچے دب کر اس کی سلیوز کے قریب آگئی تھی۔

پھر جب وہ لیکچر ختم ہونے پر اپنی فائلز سمیٹ رہا تھا، اسی لمحے اس نے نہایت روانی اور سکون کے ساتھ وہ چٹ اپنی کوٹ پاکٹ میں سرکادی تھی، ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اب وہی چٹ اس کے ہاتھوں میں تھی۔ یوسف آگے کو جھکا، دونوں بازو میز پر جمائے اور آہستگی سے چٹ کھولی۔

اس پر لکھا تھا۔

"اگر کوئی انسان اچانک بدل جائے... اتنا بدل جائے کہ آپ کو پہچاننے سے بھی انکار کر دے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے آپ کو کبھی اہم سمجھا ہی نہیں تھا۔؟"

چند لمحے کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر یوسف ہلکا سا مسکرایا۔

وہ مسکراہٹ عجیب تھی... جیسے کسی پرانی یاد نے دل کے بند دروازے پر دستک دی ہو۔

"ضروری نہیں..." وہ دھیرے سے خود سے بولا۔

"بعض لوگ بدلتے نہیں، خود کو چھپالیتے ہیں۔ کیونکہ کچھ رشتے انسان کو کمزور کر دیتے ہیں، اور بعض لوگ اپنی کمزوری کسی کو دکھانا پسند نہیں کرتے۔ کبھی کبھی انسان دور اس لیے نہیں جاتا کہ وہ پرواہ نہیں کرتا، بلکہ اس لیے جاتا ہے کیونکہ وہ بہت زیادہ پرواہ کرتا ہے۔"

اس کی نیلی آنکھوں میں لمحہ بھر کو گہرا سا سکوت اترا۔ وہ چند لمحے چٹ کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے والٹ نکالا۔ اس والٹ میں ایک مخصوص ہڈن سلاٹ تھا، جہاں عام طور پر لوگ اہم چیزیں رکھتے ہیں۔

یوسف نے نہایت احتیاط سے وہ گلابی چٹ وہاں رکھ دی۔ ایسے جیسے وہ محض کاغذ کا ٹکڑا نہیں، بلکہ کوئی بہت خاص چیز ہو۔

پھر اس نے والٹ بند کیا، کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی اور خاموشی سے چھت کو دیکھنے لگا۔

اور شاید... کئی عرصوں بعد اس کے چہرے پر آئی وہ ہلکی سی مسکراہٹ حقیقی تھی۔



وہ دونوں لڑکیاں اِس وقت یونیورسٹی کے مین گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ آج پوری یونیورسٹی رنگوں، روشنیوں اور ہلچل سے جگمگا رہی تھی۔ ہر طرف طلبہ و طالبات خوشگوار لباسوں میں ملبوس اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے جبکہ داخلی راستے کے دونوں جانب لگے سنہری لائٹس والے ستون ماحول کو اور بھی پُرکشش بنا رہے تھے۔ یارا نے پیاری سی گرے رنگ کی لمبی فراک پہنی ہوئی تھی، جس کے بازوؤں پر نفیس سلور ورک تھا، جبکہ اُس نے ضد کر کے عنادل کو بھی گہرے سبز رنگ کی لمبی فراک پہنائی تھی۔ فراک کا ریشمی کپڑا روشنی پڑنے پر ہلکا سا چمک رہا تھا، اور اُس کے ساتھ موجود باریک سنہری کام والا دوپٹہ عنادل نے بڑی مشکل سے اپنے سر پر ٹکایا ہوا تھا۔ اصل مسئلہ دوپٹہ نہیں... فراک تھی۔

عنادل ہر دو قدم بعد اپنی فراک سنبھالتی، کبھی ہیلز میں لڑکھڑاتی تو کبھی دوپٹہ کندھے سے پھسلنے لگتا۔

"یارا... خدا کے لیے، لوگ اس سب میں سانس کیسے لیتے ہیں؟" وہ آہستہ آواز میں بڑبڑائی۔

یارا فوراً ہنس پڑی۔

"کیونکہ سب تمہاری طرح جنگ نہیں لڑ رہے ہوتے کپڑوں کے ساتھ۔"

عنادل نے گھور کر اُسے دیکھا مگر پھر خاموش ہو گئی۔

یارا نے آج خود اُس کا ہلکا سا میک اپ کیا تھا۔ آنکھوں پر لگایا گیا نرم سا مسکارا انادل کی ہیزل گرین آنکھوں کو اور بھی غیر معمولی خوبصورت بنا رہا تھا۔ وہ آنکھیں ویسے ہی عجیب کشش رکھتی تھیں، مگر آج اُن میں ہلکی چمک اور گہرائی اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔

اس کے نرم گلابی ہونٹ، ہلکے سے کھلے بالوں کی چند لٹیں، اور سبز لباس میں اُس کا معصوم چہرہ... وہ واقعی کسی عام تقریب میں آنے والی لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔

عنادل نے ارد گرد دیکھا اور آہ بھری۔

"مجھے لگ رہا ہے کہ ہم کسی چیرٹی ایونٹ میں نہیں بلکہ فینسی ڈریس پارٹی میں آئے ہیں۔"

یارانے فوراًاُس کا بازو پکڑا۔

"خاموش! آج اگر مجھے یلماز یلدرز کا آٹو گراف نہ ملا نا، تو میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔"

اب دونوں ریسیپشن ایریا میں کھڑی تھیں جہاں سیکیورٹی معمول سے کہیں زیادہ سخت تھی۔ ہر طرف یونیورسٹی اسٹاف اور گارڈز موجود تھے کیونکہ کچھ ہی دیر میں ترکی کے مشہور بزنس مین یلماز یلدرز وہاں آنے والے تھے۔

یارا کی نظریں بار بار داخلی دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

وہ بے صبری سے اپنے ہاتھ میں پکڑی نوٹ بک کو دیکھتی پھر سامنے۔ جبکہ دوسری جانب عنادل کی حالت خراب ہو چکی تھی۔

"میری ٹانگیں ٹوٹنے والی ہیں۔"

وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"صرف پندرہ منٹ اور..." یارانے جلدی سے کہا۔

"پندرہ منٹ؟ میں تب تک شہید ہو جاؤں گی ان ہیلز میں۔"

یارا ہنس دی۔

آخر کار عنادل نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں اپنے محبوب بزنس مین کا انتظار کرو، میں جا کر حال میں ہماری جگہ رکھتی ہوں۔"

یارا فوراً مان گئی۔

"اوکے!... مگر سامنے والی قطار میں جگہ رکھنا۔"

عنادل نے بے زاری سے سر ہلایا اور وہاں سے چل دی۔

جس حال میں چیرٹی ایونٹ منعقد کیا گیا تھا وہ یونیورسٹی کی چوتھی منزل پر واقع تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے یا تو لفٹ استعمال کرنی پڑتی... یا پھر لمبی سیڑھیاں چڑھنی پڑتیں۔

عنادل کے قدم لفٹ کے سامنے آکر رُکے، اور اگلے ہی لمحے اُس کے ذہن میں وہی بند لفٹ... اندھیرا... گھٹن... اور کیف کا چہرہ ابھر آیا۔ اُس نے فوراً نظریں ہٹا لیں۔

"نہیں... لفٹ کبھی نہیں۔" وہ زیرِ لب بولی۔

پھر اپنی فراک سنبھالتی ہوئی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

یلماز یلدرز کی آمد پر پورا ریسیپشن تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔یونیورسٹی کے مرکزی داخلی دروازے کے باہر کئی لگژری گاڑیاں رکی تھیں جبکہ سیکیورٹی معمول سے کہیں زیادہ سخت تھی۔سیاہ یونیفارم میں ملبوس گارڈز ایک خاص ترتیب سے کھڑے تھے،اور جیسے ہی درمیان والی لمبی بلیک گاڑی کا دروازہ کھلا...ماحول جیسے چند لمحوں کے لیے ٹھہر سا گیا۔

سب سے پہلے اس کے دو پرسنل گارڈز باہر نکلے،پھر اگلے ہی لمحے یلماز یلدرز گاڑی سے باہر آیا۔

سیاہ رنگ کے شاہانہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس،جس کی فٹنگ اس کی مضبوط اور رعب دار شخصیت کو مزید نمایاں کر رہی تھی،اندر پہنی سفید شرٹ کا کالر نہایت نفاست سے سیٹ تھا جبکہ سیاہ ٹائی پر لگایا گیا سلور ٹائی پن روشنی میں ہلکا سا چمک رہا تھا۔اس کی کلائی پر بندھی بے حد مہنگی رائل واچ،چمکتے سیاہ لیدر شوز،اور پیچھے سیٹ کیے گئے سیاہ اور سفید بال...وہ واقعی کسی عام بزنس مین سے زیادہ ایک بادشاہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس کے چلنے میں عجیب سا اعتماد اور خاموش غرور تھا۔

وہ نہ جلدی میں تھا،نہ کسی کو متاثر کرنے کی کوشش میں،مگر پھر بھی ہر نظر بے اختیار اسی پر جا ٹھہرتی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ!...یہ حقیقت میں اتنے زیادہ ہینڈسم کیوں ہیں؟''

یارا نے تقریباً سرگوشی میں کہا جبکہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

''یہ انسان ہے...یا کوئی مووی کریکٹر؟''پیچھے سے کسی لڑکی کی آواز گونجی۔

اسی دوران یونیورسٹی کے ہیڈ آگے بڑھے اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ انہیں خوشبودار سفید اور نیلے پھولوں کا خوبصورت بُکے پیش کیا۔

"ویلکم ٹو کراکایا یونیورسٹی،مسٹر یلماز یلدرز۔یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے۔"

یلماز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بُکے تھاما۔

"اعزاز میرا ہے۔"اس کی گہری اور پُرسکون آواز سنائی دی۔

کیمروں کی فلیشز مسلسل چمک رہی تھیں۔کچھ اسٹوڈنٹس دور کھڑے صرف اسے دیکھ رہے تھے جبکہ کئی لڑکیاں واضح طور پر اُس کی شخصیت سے متاثر دکھائی دے رہی تھیں۔

یارا نہ جانے کتنی دیر سے اپنی نوٹ بک ہاتھ میں لیے مناسب موقع ڈھونڈ رہی تھی۔آخر کار کافی کوشش اور دھکم پیل کے بعد وہ ان خوش قسمت لوگوں میں شامل ہو گئی جنہیں یلماز یلدرز کا آٹو گراف مل گیا۔

"تھ... تھینک یو! سر" وہ بمشکل بول پائی۔

یلماز نے مختصر سا سر ہلایا اور اگلے شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یارا چند لمحے وہیں ساکت کھڑی رہی، پھر اچانک خوشی سے چیخی۔

"عنادل مر گئی میں! اس نے میری طرف دیکھ کر سائن کیا ہے۔" مگر عنادل تو وہاں تھی ہی نہیں۔

اس دوران یونیورسٹی انتظامیہ نے یلماز یلدرز کے لیے ایک خاص لفٹ مختص کر دی تھی۔ آج کے دن وہ لفٹ صرف اسی کے استعمال کے لیے تھی جبکہ باقی تمام طلبہ اور مہمان دوسری لفٹس استعمال کر رہے تھے۔ لفٹ کے ارد گرد خصوصی سیکیورٹی تعینات تھی۔ کوئی عام شخص اُس کے قریب بھی نہیں جا سکتا تھا۔

چیریٹی ایونٹ شروع ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا، اور اُس سے پہلے یلماز یلدرز کو یونیورسٹی کی تیسری منزل پر موجود ایک خصوصی کمرے میں لے جایا گیا جو خاص طور پر اُس کے آرام کے لیے تیار کروایا گیا تھا۔

وہ کمرہ نہایت نفیس انداز سے سجایا گیا تھا۔ ہلکی سنہری روشنی، مہنگی خوشبو، سیاہ اور سنہری فرنیچر، دیواروں پر ترکی کی کلاسیکل آرٹ پینٹنگز، اور شیشے کی بڑی دیوار جس سے باہر پورا یونیورسٹی کیمپس دکھائی دیتا تھا۔

کمرے میں ہر چیز شاہانہ ذوق کی عکاسی کر رہی تھی۔ یلماز اندر داخل ہوا تو اس کے گارڈز دروازے کے باہر رک گئے۔

وہ آہستگی سے چلتا ہوا شیشے کی دیوار کے قریب جا کھڑا ہوا۔ نیچے پورا یونیورسٹی کیمپس لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے خاموشی سے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"تیس منٹ..." وہ زیرِ لب بولا۔

اور شاید اُسے اندازہ بھی نہیں تھا، کہ انہی تیس منٹوں میں قسمت اُس کی زندگی کا رخ بدلنے والی تھی۔



وہ بڑی مشکل سے تیسری منزل تک پہنچی تھی۔ اس کے پاؤں حقیقتاً جواب دے چکے تھے۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اُس نے آخر کار ہار مان لی تھی اور اپنی ہیلز اتار کر ہاتھوں میں اٹھالی تھیں۔ اب وہ ننگے پاؤں ٹھنڈی سنگِ مرمر کی سیڑھیوں پر چل رہی تھی۔ سبز فراک کا گھیر بار بار اُس کے قدموں میں الجھ رہا تھا جبکہ دوپٹہ کبھی کندھے سے پھسلتا تو کبھی سر سے۔

"یارا کی بات ماننا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی..." وہ ہانپتے ہوئے بڑبڑائی۔

ابھی ایک منزل اور باقی تھی۔ وہ لمحہ بھر کو رکی اور تھکی ہوئی سانس کے ساتھ سامنے دیکھا۔ تیسری منزل کے کوریڈور میں ایک نہایت نفیس کمرہ موجود تھا جس کے باہر دو سیاہ لباس میں ملبوس گارڈز پوری مستعدی سے کھڑے تھے۔

ان کے چہروں کے تاثرات سخت تھے جبکہ کانوں میں لگے ائیر پیس واضح بتا رہے تھے کہ وہ کسی عام شخص کی حفاظت پر مامور نہیں۔ عنادل نے حیرانی سے اُنہیں دیکھا۔

"یہاں بھی سیکیورٹی...؟" وہ زیرِلب بولی مگر پھر کندھے اچکا کر آگے بڑھ گئی۔ اُسے اس وقت صرف ایک چیز کی فکر تھی...چوتھی منزل۔

وہ اللہ کا نام لے کر دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ابھی اُس نے دوسری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک اُس کا پاؤں بری طرح مڑا۔

"آہ—!" اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔

وہ فوراً برابر والی ریلنگ کو پکڑ کر خود کو گرنے سے بچانے لگی مگر توازن بگڑنے کے باعث اُس کے ہاتھوں میں پکڑی ہیلز سیڑھیوں پر گر گئیں۔ اس کا چہرہ درد سے سکڑ گیا۔

"یا اللہ..." وہ تقریباً سرگوشی میں بولی۔

اسی لمحے تیسری منزل والے اُس خاص کمرے کا دروازہ کھلا۔ پہلے دو گارڈز فوراً سیدھے ہو کر کھڑے ہوئے، پھر اگلے ہی لمحے یلماز یلدرز باہر نکلا۔

سیاہ شاہانہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس، ایک ہاتھ میں اپنی قیمتی گھڑی کو درست کرتا ہوا، جبکہ اُس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح وہی پُرسکون مگر رعب دار تاثرات تھے۔

مگر جیسے ہی اُس نے سامنے سیڑھیوں کے پاس بیٹھی اُس لڑکی کو دیکھا، اُس کے قدم لمحہ بھر کو رک گئے۔

عنادل اب ریلنگ پکڑے بیٹھی تھی اور درد کے باعث اُس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔

سبز لباس میں ملبوس، بکھرا ہوا ریشمی دوپٹہ، ہاتھوں سے چھوٹی ہوئی ہیلز، اور چہرے پر واضح تکلیف...کچھ لمحوں کے لیے یلماز کی نگاہیں اُس پر ٹھہر گئیں۔

"سر...؟" پیچھے کھڑے گارڈ نے آہستہ سے پکارا۔

یلماز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے چند قدم آگے بڑھا، مگر اتنے فاصلے پر رکا جہاں سے اُس کی موجودگی محسوس تو ہو مگر وہ اُس کی ذاتی حدود میں داخل نہ ہو۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" اُس کی گہری اور پُرسکون آواز کوریڈور میں گونجی۔

عنادل نے چونک کر سر اٹھایا، اور پھر پہلی بار اُس نے اُسے اتنے قریب سے دیکھا۔

وہی شخص جس کے لیے پورا یونیورسٹی کیمپس دیوانہ بنا ہوا تھا...یلماز یلدرز۔

"میرا پاؤں مڑ گیا ہے۔" وہ بمشکل بولی۔

یلماز کی نظر سیڑھیوں پر گری اُس کی ہیلز پر گئی، پھر دوبارہ اُس کے جھکے ہوئے چہرے پر۔

یلماز نے بغیر اُس کی طرف بڑھے اپنے ایک گارڈ کی جانب دیکھا۔

"کرسی لاؤ۔"

بس ایک حکم۔

اور اگلے ہی لمحے گارڈ فوراً قریب موجود لاؤنج ایریا سے ایک آرام دہ کرسی لے آیا، یلماز کچھ قدم پیچھے ہٹا۔

"آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔" وہ پُرسکون انداز میں بولا۔

عنادل نے مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی، درد کے باعث اُس کی سانس ہلکی سی کانپی۔

یلماز کی نظر اُس کے مڑے ہوئے پاؤں پر گئی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا، پھر اُس نے اپنے کوٹ کی آستین ہلکی سی اوپر کی۔ گارڈ آگے بڑھنے لگا مگر یلماز نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔

"میں دیکھ لیتا ہوں۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

عنادل فوراً چونکی۔

"نہیں...آپ تکلیف نہ کریں، میں ٹھیک ہوں..."

"آپ بالکل ٹھیک نہیں ہیں۔"

وہ سنجیدہ انداز میں بولا۔

اگلے ہی لمحے یلماز اُس کے سامنے جھکا۔ ایک گھٹنا سفید پتھر والے ٹھنڈے فرش پر ٹکایا، جبکہ دوسری ٹانگ کو ذرا بلند رکھتے ہوئے اُس نے نہایت احتیاط سے عنادل کا زخمی پاؤں اپنے گھٹنے پر رکھا۔

عنادل کی سانس اٹک گئی، اُسے شاید توقع نہیں تھی کہ ترکی کے سب سے بااثر لوگوں میں شمار ہونے والا شخص اِس طرح اُس کے سامنے جھکے گا۔

یلماز کی انگلیاں نہایت مہارت سے اُس کے مڑے ہوئے پاؤں کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ احتیاط سے اُس کی موچ درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تھوڑا درد ہوگا۔" اُس نے پہلے ہی تنبیہ کر دی۔

پھر اگلے ہی لمحے اُس نے آہستگی سے اُس کے پاؤں کو سیدھا کیا۔

"آہ...!" عنادل کے منہ سے بے اختیار سسکی نکلی۔

شدید درد کے باعث اُس نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ یلماز کے شانے پر رکھ کر اُسے ذرا پیچھے دھکیل دیا۔ یلماز کا توازن ہلکا سا ایک طرف کو جھکا، اور اُسی لمحے اُس کی نظریں عنادل کی آنکھوں سے جا ٹکرائیں۔

وقت جیسے اچانک ساکت ہو گیا... وہ ہیزل گرین آنکھیں جن میں درد بھی تھا، نمی بھی، اور عجیب سی معصوم وحشت بھی، اور بس...

وہ غزالی آنکھیں بادشاہ کے دل میں اترتی چلی گئیں۔

نور ہی نور سے مکھڑے پہ، وہ نوری آنکھیں
اس کے انجیل سے چہرے پہ وہ زبوری آنکھیں

اُس کی ہنسلی کی ہڈی سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہلکے سے ابھری اور پھر مدھم سی لرزش کے ساتھ واپس ڈھل گئی۔

چھوڑ آیا ہوں کسی آنکھ میں بینائی کو
اور بچا لایا ہوں چہرے پہ ادھوری آنکھیں

اُسے پہلی بار محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے برسوں سے خاموش وجود میں ہلکی سی دستک دی ہو۔

اس کو پہلو میں بٹھا کر اسے تکنے کا نشہ
کس قدر ہو گئیں چہرے پہ ضروری آنکھیں

پھر یلماز نے آہستگی سے اپنی نظریں ہٹائیں۔

"اب بہتر ہے؟" اُس کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ دھیمی تھی۔

عنادل نے بمشکل سر ہلایا۔ یلماز آہستگی سے کھڑا ہوا، پھر اُس نے سیڑھیوں پر گری عنادل کی ہیلز اٹھائیں اور اُس کے قریب رکھتے ہوئے بولا۔

"بعض دفعہ خوبصورت چیزیں انسان کو تکلیف بھی زیادہ دیتی ہیں۔"

نہ جانے وہ ہیلز کی بات کر رہا تھا... یا زندگی کی۔

عنادل اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"سر، ہال میں سب آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔" صفدر کی آواز گونجی۔

"اوکے..." ایک آخری نگاہ عنادل پر ڈالتے وہ وہاں سے چلا گیا۔ جبکہ پیچھے بیٹھی عنادل اپنے پاؤں کو اب ہلکی ہلکی حرکت دینے لگی۔



زلیخہ کا دل اب تک بے ترتیب دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی بار بار کروٹ بدل رہی تھی مگر نیند جیسے اُس سے روٹھ گئی تھی۔ کمرے کی مدھم زرد روشنی دیواروں پر پھیلی ہوئی تھی جبکہ باہر ارزُروم کی سرد رات خاموشی سے کھڑکیوں سے ٹکرا رہی تھی۔ مگر اُس کے ذہن میں صرف ایک ہی منظر بار بار گھوم رہا تھا... اور ہر بار اُس کی شرمندگی پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی۔

وہ لمحہ...

جب وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ سے ڈسٹ بن کو تھامے ہوئے، جبکہ دوسرا ہاتھ اُس کے اندر پڑی چٹس کو بے صبری سے ٹٹول رہا تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کیونکہ وہ اپنی وہی چِٹ ڈھونڈ رہی تھی... وہ چِٹ جس میں اُس نے ایک ایسا سوال لکھا تھا جو شاید اُسے نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ اچانک اُس نے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنی، اُس کے ہاتھ وہیں رک گئے اور پھر اسی عجیب سی پوزیشن میں جب وہ دھیرے سے پلٹی... تو سامنے یوسف کھڑا تھا۔ اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں۔ بازو سینے پر بندھے ہوئے۔ گہری نیلی آنکھیں سیدھی اُس پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" اُس کی بھاری آواز کلاس کے سنسان ماحول میں گونجی۔

زلیخہ کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ فوراً ڈسٹ بن ایک طرف رکھتے ہوئے جلدی سے کھڑی ہوئی، مگر گھبراہٹ میں اُس کا دوپٹہ کرسی کے کنارے سے الجھ گیا۔ اُس نے جلدی سے اُسے سنبھالا۔

"و...وہ..." اُس کی زبان جیسے ساتھ چھوڑ گئی تھی۔

یوسف خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"میں...اصل میں دیکھ رہی تھی کہ...وہ بری طرح اٹکی، کہ صفائی والے چِٹس صحیح سے پھینکتے بھی ہیں یا نہیں..."

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

پھر یوسف نے آہستہ سے ایک بھنوا اٹھائی۔

"تو اب یونیورسٹی میں کوالٹی چیکنگ کا شعبہ بھی آپ سنبھال رہی ہیں؟"

زلیخہ کا چہرہ شرمندگی سے سرخ پڑ گیا۔ وہ فوراً نظریں جھکا گئی۔

"نہیں...میرا مطلب وہ نہیں تھا..."

یوسف نے چند قدم اُس کی طرف بڑھائے۔ اُس کے قدموں کی آواز زلیخہ کے دل کی دھڑکن مزید تیز کر رہی تھی۔

"اچھا..." وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

"تو پھر شاید آپ اپنی ہی کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھیں؟"

زلیخہ نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں!"

یوسف نے ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھا۔

"اتنی جلدی انکار؟" پھر وہ ذرا جھکا اور ڈسٹ بن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگا شاید کسی سوال کا جواب اتنا ضروری تھا کہ آپ کو ڈسٹ بن تک میں تلاش کرنا پڑ گیا۔"

زلیخہ کو لگا زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائے۔ وہ دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی۔

"میں...میں بس جا رہی تھی..." وہ جلدی سے بولی۔

"ہاں، یہ فیصلہ شروع میں کر لیتیں تو زیادہ بہتر تھا۔"

یوسف کا لہجہ نہایت پرسکون تھا مگر اُس کی سنجیدگی زلیخہ کی شرمندگی بڑھانے کے لیے کافی تھی۔

زلیخہ نے بمشکل سر ہلایا اور جلدی سے وہاں سے نکل گئی۔

اور اب...اپنے بستر پر لیٹے ہوئے وہ بار بار وہی منظر یاد کر رہی تھی۔

"یااللہ..."اُس نے تکیے میں منہ چھپاتے ہوئے بڑبڑایا۔

"میں اتنی بے وقوف کیوں ہوں؟"اُسے خود پر شدید غصہ آرہا تھا۔اب نہ جانے وہ کل یوسف کا سامنا کیسے کرے گی۔



وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پریشانی کے عالم میں تیسرے فلور پر پہنچی تھی۔ جیسے ہی عنادل کا میسج آیا تھا کہ اُس کے پاؤں میں موچ آگئی ہے، یارا فوراً ہال چھوڑ کر باہر نکل آئی تھی۔اُس وقت پورے یونیورسٹی میں چرٹی ایونٹ کی رونق اپنے عروج پر تھی مگر یارا کو اس وقت صرف اپنی دوست کی فکر تھی۔

"عنادل!"...وہ تیزی سے اُس کی طرف بڑھی جو سیڑھیوں کے پاس موجود ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔اُس کا ایک ہاتھ اپنے ٹخنے پر تھا جبکہ چہرے پر درد واضح نظر آرہا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟"یارا نے قدرے فکر سے پوچھا۔

عنادل نے ہلکا سا سر اثبات میں ہلایا مگر اُس کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر تکلیف صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"ہوا کیا تھا آخر؟"اب عنادل نے اُسے ساری بات بتائی، کہ کس طرح وہ جلدی میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، پھر اُس کا پاؤں مڑا...اور پھر وہ کس طرح نیچے گری۔

"پھر ایک بھلے انسان نے اس کی مدد کی۔"وہ آہستہ آواز میں بولی۔

"اوہ خدایا..."یارا نے فوراً اُس کے کندھے کو سہارا دیا۔

"پھر؟"

"پھر...اُس نے میرا پاؤں ٹھیک کیا۔"

"کیا مطلب؟"

"یعنی..."عنادل نے نظریں چرائیں۔

"شاید اسے فرسٹ ایڈ آتی تھی۔"

وہ جان بوجھ کر یہ نہیں بتا رہی تھی کہ وہ شخص یلماز یلدرز تھا۔ کیونکہ وہ یارا کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اگر اُسے یہ پتہ چل جاتا تو وہ ایک کے بعد ایک سو سوال کرتی، پھر ہر بات کا عجیب مطلب نکالتی...اور آخر میں عنادل کا جینا حرام کر دیتی۔ اس لیے خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔

"چلو، ابھی اسپتال چلتے ہیں۔" یارا نے فوراً فیصلہ کیا۔

"ارے نہیں، اتنی بھی..."

"بس...!" یارا نے اُسے گھورا۔

"تمہارا پاؤں مڑا ہوا ہے اور تم مجھے کہہ رہی ہو کچھ نہیں ہوا؟" عنادل خاموش ہو گئی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں اسپتال میں موجود تھیں۔ سفید روشنیوں سے جگمگاتا صاف ستھرا کمرہ، دوائیں اور اینٹی سیپٹک کی مخصوص خوشبو جبکہ ڈاکٹر عنادل کے پاؤں کا معائنہ کر رہا تھا۔

"ہمم..." ڈاکٹر نے احتیاط سے اُس کا ٹخنہ چیک کرتے ہوئے کہا۔

"جس شخص نے آپ کے پاؤں کو فوراً اسٹریچ کیا تھا، اُسے اچھی معلومات تھیں۔"

"مطلب...؟" یارا فوراً متوجہ ہوئی۔

"اگر اُس وقت صحیح طریقے سے دباؤ نہ دیا جاتا تو سوجن کافی بڑھ سکتی تھی، شاید ہڈی بھی متاثر ہو جاتی۔ لیکن ابھی صرف ہلکی موچ ہے۔"

عنادل خاموش بیٹھی ڈاکٹر کی بات سن رہی تھی۔

"یعنی اُس شخص نے بالکل صحیح طریقہ استعمال کیا تھا۔"

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ خوش قسمت ہیں کہ بروقت مدد مل گئی۔"

عنادل کے ذہن میں بے اختیار وہ لمحہ ابھرا...جب وہ شخص اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ جب اُس نے اُس کا پاؤں اپنے گھٹنے پر رکھا تھا۔

وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی اور اپنا چہرہ فوراً دوسری طرف پھیر لیا۔

"اووو..." یارا نے معنی خیز انداز میں اُسے دیکھا۔

"لگتا ہے مدد کرنے والا کافی ٹیلنٹڈ تھا۔"

"یارا..." عنادل نے جھینپتے ہوئے اُسے گھورا۔

یارا ہنس دی۔

رات تک یارا اُسے گھر چھوڑ چکی تھی۔

"تمہیں اندازہ بھی ہے کتنی مشکل سے مجھے وہ آٹو گراف ملا؟" یارا نے صوفے پر بیٹھتے ہی ڈرامائی انداز میں کہا۔

"اتنی بھی کیا مشکل تھی؟"

"ہاں جی! جیسے یلماز یلدرز ہر گلی کے نکڑ پر آٹو گراف بانٹتا پھرتا ہو!"

عنادل بمشکل ہنسی روکے بیٹھی تھی۔

"پورا رش تھا وہاں، لوگ پاگلوں کی طرح اُن کے پیچھے تھے..."

لیکن آخر کار... یارا نے فوراً اپنا بیگ کھولا اور ایک خوبصورت سیاہ کارڈ نکالا جس پر سنہری سیاہی سے دستخط موجود تھے۔

"دیکھو!..." وہ خوشی سے تقریباً چمک رہی تھی۔

"واہ..." عنادل نے مصنوعی حیرت ظاہر کی۔

"مصنوعی خوشی مت دکھاؤ، میں پہچانتی ہوں تمہیں۔" یارا نے فوراً کہا۔

عنادل ہنس پڑی۔ کچھ دیر یارا اُس کے پاس بیٹھی رہی، اُس کے لیے دوا اور پانی رکھا، پھر اُسے آرام کا کہہ کر واپس اپنے گھر چلی گئی۔

اور دوسری طرف... جس ابتدائی طبّی امداد نے فوراً اُس کے پاؤں کو سہارا دیا تھا، اُس کی وجہ سے اب تک سوجن کافی کم ہو چکی تھی۔ اور جلد ہی عنادل بھی نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی تھی۔



معمول کی طرح حقیقت پوسٹ میں ایک اور مصروف دن تھا۔

ہر طرف کی بورڈز کی آوازیں، فون کالز، فائلوں کے پلٹنے کی مدھم سرسراہٹ اور لوگوں کی دھیمی گفتگو گونج رہی تھی۔ پورا آفس اپنے روزمرہ کے معمول میں مگن تھا۔

مگر کیف کا معمول آج بگڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے کیبن میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے رکھی میز فائلوں سے بھری ہوئی تھی، لیپ ٹاپ اسکرین پر کئی رپورٹس اوپن تھیں، مگر اس کا دھیان کام کی طرف تھا ہی نہیں۔

یا شاید...وہ خود بھی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی نظریں بار بار شیشے کی دیوار کے اُس پار جاتی تھیں، جہاں عنادل کی ڈیسک موجود تھی۔ مگر آج وہ کرسی خالی تھی۔

صبح سے، اور اب شام کے سات بج رہے تھے۔ کیف نے ایک بار پھر نظریں اٹھا کر باہر دیکھا۔

وہی خالی ڈیسک...وہی خاموش کمپیوٹر...وہی بے جان سی جگہ۔ اس نے بے زاری سے قلم میز پر پھینکا اور کرسی سے ٹیک لگالی۔

"عجیب لڑکی ہے..." وہ زیرِلب بڑبڑایا۔

پھر اگلے ہی لمحے خود کو سنبھالتے ہوئے فائل بند کی، اپنی چیزیں سمیٹیں اور کیبن لاک کر کے باہر نکل آیا۔ چند لمحوں بعد وہ زوبی کی ڈیسک کے سامنے کھڑا تھا۔

"مس عنادل کو شاید یہ احساس نہیں کہ ادارے کی ڈسپلن اور ذمہ داریاں ذاتی مصروفیات سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔"

اس کی سنجیدہ آواز سن کر زوبی فوراً سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"سر...ایکچولی وہ لیو پر ہیں۔"

کیف کی پیشانی ہلکی سی شکن آلود ہوئی۔

"کس قسم کی لیو؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"سر...اُن کے پاؤں میں موچ آگئی تھی، اسی لیے انہوں نے دو دن کی چھٹی لی ہے۔"

کیف چند لمحے خاموش رہا۔

"مجھ سے تو انہوں نے کوئی لیو اپروو نہیں کروائی۔"

"سر...انہوں نے مراد سر سے لی تھی۔"

یہ سن کر کیف خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری ابھری مگر اُس نے کچھ کہا نہیں، اسی دوران اُس کی نظر ساتھ رکھے واٹر ڈسپنسر پر گئی جو خالی ہو چکا تھا۔

"اوکے..." اگلے ہی لمحے اُس نے جان بوجھ کر ہلکا سا کھانسنے کی ایکٹنگ کی۔

"مجھے پانی مل سکتا ہے؟"

"جی سر، ابھی لاتی ہوں۔" زوبی فوراً اُٹھ کر باہر چلی گئی کیونکہ وہاں موجود واٹر ڈسپنسر خالی تھا۔

جیسے ہی وہ باہر نکلی، کیف نے فوراً اِدھر اُدھر دیکھا، پھر تیزی سے زوبی کے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے مہارت سے ایک مخصوص فائل اوپن کی جس میں تمام کولیگز کا ریکارڈ موجود تھا۔

نام... فون نمبر... ایڈریس۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چلیں۔

"عنادل..."

اگلے ہی لمحے اسکرین پر عنادل کی پروفائل اوپن ہو چکی تھی۔ کیف نے موبائل نکالا اور انتہائی تیزی سے اُس سیکشن کی تصویر لے لی۔ اسی لمحے باہر سے زوبی واپس آتی دکھائی دی۔ کیف نے فوراً موبائل جیب میں رکھا، فائل وہیں بند کر دی اور ایسے ایک طرف جا کھڑا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ زوبی اندر آئی اور اسے پانی دیا۔

"تھینک یو۔" کیف نے پرسکون انداز میں پانی پیا، چہرے پر وہی سنجیدگی تھی۔

پانی پینے کے بعد اُس نے گلاس میز پر رکھا۔

"گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ سر۔"

کیف ہلکا سا سر ہلاتا وہاں سے نکل گیا، اور دوسری طرف اس کی جیب میں رکھا موبائل خاموشی سے اُس راز کو سنبھالے ہوئے تھا، جسے شاید کیف خود بھی ابھی نام نہیں دے پا رہا تھا۔



وہ بنا یوسف سے نظریں ملائے خاموشی سے لیکچر لے رہی تھی۔ کل کی شرمندگی ہی اتنی تھی کہ کم از کم آج تو وہ اُس سے آنکھیں نہیں ملا پا رہی تھی۔ پوری کلاس غیر معمولی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف یوسف کی پُراعتماد آواز گونج رہی تھی جو مائیک کے ذریعے پورے لیکچر ہال میں پھیل رہی تھی۔ زلیخہ وقتاً فوقتاً اہم پوائنٹس اپنے رجسٹر پر نوٹ کر لیتی۔ ابھی بھی وہ یہی کر رہی تھی کہ اچانک کلاس کا دروازہ کھلا۔

ٹک... ٹک... ٹک...

ہائی ہیلز کی واضح آواز پورے کلاس روم میں گونجی، تقریباً سبھی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں۔ وہ ایک دراز قد، بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔

گہرے بھورے بال نفاست سے اُس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے، جبکہ سیاہ لانگ کوٹ اور ہلکے میک اپ نے اُس کی شخصیت کو اور بھی پُرکشش بنادیا تھا۔

یوسف، جو ابھی لیکچر دے رہا تھا، خاموش ہوا۔ پھر اُس کی نظریں اُس لڑکی پر پڑیں، اور اگلے ہی لمحے اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ مسکراہٹ... جو زلیخہ نے کبھی اپنے لیے نہیں دیکھی تھی۔

"کل ہم یہ لیکچر یہیں سے کنٹینیو کریں گے۔"

یوسف نے اپنی فائلز سمیٹتے ہوئے کہا اور پھر بغیر کسی وضاحت کے اُس لڑکی کے ساتھ کلاس سے باہر نکل گیا۔

پیچھے بیٹھی زلیخہ کا پورا وجود جیسے کسی شعلے کی طرح جل اٹھا۔ اُس کے ہاتھ میں پکڑا پین بے اختیار مضبوطی سے دب گیا۔

"مجھے دیکھ کر تو کبھی نہیں مسکرایا..." وہ دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے بڑبڑائی۔

اب باقی کا لیکچر فری تھا۔ طلبہ آہستہ آہستہ اپنی باتوں میں مصروف ہونے لگے۔ مگر زلیخہ خاموشی سے اٹھی۔ اپنی چیزیں سمیٹیں، پرس کندھے پر ڈالا اور باہر کی جانب چل دی۔

"کہاں جارہی ہو...؟" جولی نے اُسے جاتے دیکھ کر پوچھا۔

"بس... ایک کام یاد آگیا، وہی کرنے جارہی ہوں۔"

"کون سا کام...؟" مگر زلیخہ اُسے اَن سنا کرتی باہر جاچکی تھی۔

وہ کوریڈور میں آکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔

اور پھر... بالآخر اُس کی نظر نیچے گراؤنڈ ایریا پر پڑی۔ یوسف وہیں موجود تھا، اور اُس کے ساتھ وہی لڑکی بھی۔

دونوں کسی بات میں مصروف تھے، اور درمیان درمیان میں یوسف ہلکا سا مسکرا بھی دیتا۔ زلیخہ کے دل میں جیسے کسی نے چبھن سی اتار دی۔

"مجھے دیکھ کر تو کبھی نہیں مسکرایا..." وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بڑبڑائی۔

پھر وہ چپکے سے نیچے گئی اور کچھ فاصلے پر بنے ایک بڑے ستون کے پیچھے کھڑی ہوگئی، وہیں سے وہ دونوں کو دیکھنے لگی۔ کبھی اُس لڑکی کو... تو کبھی یوسف کو...

اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اُس کا دل عجیب بے چینی میں گھرتا جارہا تھا۔ پھر اچانک وہ دونوں اُسی طرف بڑھنے لگے، زلیخہ گھبرا گئی۔

"یااللہ..." وہ فوراً پلٹنے لگی تھی کہ سامنے سے آتے ایک لڑکے سے ٹکرا گئی۔

"اوہ!..." اُس کا توازن بگڑا مگر اگلے ہی لمحے اُس لڑکے نے فوراً اُس کے کندھوں کو تھام کر اُسے گرنے سے بچالیا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" زلیخہ فوراً ایک قدم پیچھے ہوئی اور سر اثبات میں ہلایا۔

"ج...جی۔" اُسی لمحے یوسف اور وہ لڑکی اُن کے پاس سے گزرے۔ یوسف کی نظر ایک لمحے کے لیے زلیخہ اور اُس لڑکے پر پڑی۔

وہ نظر عجیب تھی...

خراش زدہ۔

ناگواری سے بھری ہوئی۔

اور بے حد ضبط شدہ۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

زلیخہ بے اختیار اُس کے جاتے وجود کو دیکھتی رہ گئی۔

"ہائے، میرا نام اوزل میران ہے۔" سامنے کھڑے لڑکے نے دوستانہ انداز میں ہاتھ بڑھایا۔

وہ خوش شکل اور خوش مزاج سا نوجوان تھا، جس کی آنکھوں میں ہلکی سی شرارت نمایاں تھی۔

"شکریہ...اوزل۔" زلیخہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس سے ہاتھ ملایا، مگر اُس کی نظریں کہیں اور... کسی اور کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

اور اُسی دور... کوئی اُن دونوں کو بے حد ناگواری اور خاموش ضبط کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔



کیف اپنے روم میں اسٹڈی ٹیبل پر جلتے اسٹڈی لیمپ کے نیچے بیٹھا تھا۔رات کافی گزر چکی تھی مگر اس کی آنکھوں میں اب بھی وہی سنجیدگی اور الجھن موجود تھی۔ میز پر فائلیں، تصویریں اور فارنزک رپورٹس پھیلی ہوئی تھیں جبکہ کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

وہ ایک بار پھر ڈی ایس پی اور اے ایس پی کے پوسٹ مارٹم رپورٹس کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔اچانک اس کی نظریں ایک لائن پر آکر ٹھہر گئیں۔ کیف نے فوراً دوسری رپورٹ اٹھائی... پھر پہلی... پھر دوسری...

اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں چونک ابھری۔

"امپاسیبل..." وہ زیرِلب بولا۔

دونوں لاشوں کے خون میں ایک ہی قسم کے کیمیکل کے ذرات پائے گئے تھے۔ایک نہایت نایاب نیورو کیمیکل پاؤڈر...ایسا پاؤڈر جو انسانی جسم میں داخل ہوتے ہی چند منٹوں کیلئے پورے جسم کو مفلوج کر دیتا تھا۔

نہ انسان حرکت کر سکتا...

نہ چیخ سکتا...

صرف زندہ رہتے ہوئے سب محسوس کر سکتا تھا۔اور یہی وجہ تھی کہ قاتل نے دونوں کو انتہائی آسانی سے قتل کیا تھا۔

کیف فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"اس کا مطلب قاتل پہلے انہیں پیرالائز کرتا ہے۔"اس نے دھیمی مگر سنجیدہ آواز میں کہا۔اس نے دوبارہ رپورٹ پڑھی...

یہ کیمیکل عام مارکیٹ میں موجود نہیں تھا۔ بلکہ پورے ترکی میں صرف چند مخصوص لیبارٹریز میں تیار کیا جاتا تھا...اور وہ بھی محدود مقدار میں۔

کیف کی سوچ اب مزید گہری ہوگئی۔ یہ کوئی عام قاتل نہیں ہو سکتا تھا۔کیونکہ ایک عام انسان نہ تو اس کیمیکل تک رسائی حاصل کر سکتا تھا...اور نہ ہی اتنی صفائی سے اس کا استعمال۔

"قاتل کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں..."اس نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

اب یہ کیس صرف قتل کا نہیں رہا تھا، بلکہ اس کے پیچھے کوئی طاقتور سایہ موجود تھا۔ کیف نے تمام رپورٹس دوبارہ ترتیب سے رکھیں۔ کل اسے یہ سب مراد دمیر کے ساتھ ڈسکس کرنا تھا کیونکہ یہ ثبوت پورے کیس کا رخ بدل سکتا تھا۔اس نے گہری سانس لی اور فائلیں سمیٹ کر مخصوص دراز میں رکھ دیں،اسی دوران اس کی نظر اُس ڈائری پر پڑی۔

وہی ڈائری...جو عنادل اُس دن لفٹ میں بھول گئی تھی۔ کیف کے ہونٹوں پر بے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ وہ ڈائری اٹھا کر بستر پر آگیا اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

چند لمحے وہ خاموشی سے کور کو دیکھتا رہا جیسے خود سے لڑ رہا ہو کہ اسے یہ پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ مگر پھر تجسس جیت گیا۔

اس نے ڈائری کھولی، پہلے صفحے پر خوبصورت نرم لکھائی میں لکھا تھا۔

"عنادل نور"... کیف نے آہستہ سے اس کا نام دہرایا۔

"عنادل نور..."اس کے لہجے میں انجانی سی نرمی اتر آئی۔

صفحے کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے ہاتھ سے بنے پھول تھے اور نیچے ایک جملہ لکھا تھا۔

"کچھ لوگ شور میں بھی تنہا ہوتے ہیں۔"

کیف کی نظریں چند لمحے اُس جملے پر ٹھہری رہیں، پھر اس نے اگلا صفحہ پلٹا۔

وہاں مختلف چھوٹے چھوٹے نوٹس تھے۔

کبھی کسی کتاب کا اقتباس...

کبھی آدھی ادھوری شاعری...

اور کبھی روزمرہ کی باتیں۔

"آج پھر بارش ہوئی...اور مجھے بارش بے حد پسند ہے۔"

پھر ایک اور صفحہ۔

"بعض لوگ انسان کی زندگی میں زخم بن کر آتے ہیں...اور بعض مرہم بن کر، مگر سب سے خطرناک وہ ہوتے ہیں جو پہلے مرہم بنتے ہیں پھر زخم دے جاتے ہیں۔"

کیف خاموش ہو گیا۔اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ ہر وقت خاموش اور سنجیدہ رہنے والی عنادل کے اندر شاید ایک پوری ٹوٹی ہوئی دنیا آباد تھی۔

پھر آہستہ آہستہ وہ صفحات پلٹنے لگا،اس ڈائری میں موجود لفظوں کو پڑھنے لگا۔



دارُالمرجان کے اندر موجود وہ پُر تعیش جم روم کسی شاہی فٹنس کلب کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وسیع و عریض ہال کی دیواریں سیاہ اور سنہری رنگ کے حسین امتزاج سے مزین تھیں جبکہ ایک پوری دیوار شیشے کی بنی ہوئی تھی جہاں سے استنبول کا دلکش منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی اور شہر کی روشنیاں بھیگے شیشوں پر دھندلا عکس بنا رہی تھیں۔ جم روم میں دنیا کی مہنگی ترین ورزش مشینیں موجود تھیں۔ ایک جانب جدید ٹریڈ ملز قطار میں رکھی تھیں، دوسری طرف بھاری ویٹس اور مخصوص ڈمبلز موجود تھے جن پر سنہری رنگ میں'' وائے. وائے ''کندہ تھا۔

چھت سے لٹکتی مدھم سفید روشنیاں پورے ماحول کو نہایت شاہانہ اور پرسکون بنا رہی تھیں۔

یلماز اس وقت سیاہ بغیر بازوؤں والی شرٹ اور سرمئی ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ اس کے بازوؤں کی ابھری ہوئی رگیں اور مضبوط عضلات اس کی مسلسل محنت کا ثبوت تھے۔ پسینے کے قطرے اس کی گردن سے ہوتے ہوئے ہنسلی کی ہڈی تک بہہ رہے تھے جبکہ وہ پوری طاقت سے ورزش کر رہا تھا۔

ہر حرکت میں ایک عجیب ساضبط تھا... جیسے وہ صرف جسم نہیں بلکہ اپنے اندر کے غصے اور درد کو بھی قابو کر رہا ہو۔ اسی دوران صفدر ہاتھ میں فون تھامے اس کے قریب آیا۔

"سر...اوزل سر کی کال ہے۔"

"اوکے..." یلماز نے مختصر جواب دیا اور ایک طرف اشارہ کیا۔

صفدر فوراً اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ قریب رکھی ائیر بڈز کی ڈبیہ اٹھا کر اس کے پاس لے آیا۔ یلماز نے ورزش روکے بغیر ڈبیہ کو کھولا، ائیر بڈز نکالے اور کانوں میں لگا لیے۔

اب بھی وہ پوری طاقت سے ویٹس اٹھا رہا تھا جبکہ سانسوں کی رفتار قدرے تیز ہو چکی تھی۔

"کیسے ہو جونیئر؟ اور ازروم کی آب و ہوا کا کوئی اثر ہوا؟"

وہ ڈمبل اٹھاتے ہوئے بولا۔

"بھائی میں تو ٹھیک ہوں، بس اپنا استنبول اور بھائی یاد آ رہے ہیں..."

دوسری جانب سے اداسی بھری آواز آئی۔ جس پر یلماز بے اختیار مسکرایا۔

"فکر مت کرو، ایک بار تمہاری پڑھائی مکمل ہو جائے پھر تمہیں یہیں استنبول میں اپنے پاس رکھنے والا ہوں۔"

وہ پل اپس کرتے ہوئے بولا۔

"بھائی یہ سیمسٹر ختم ہو جائے پھر آپ سے ملنے آؤں گا۔"

"مجھے انتظار رہے گا تمہارا..."یلماز نے دھیمی اداسی سے کہا۔

وہ واقعی اوزل سے بے حد محبت کرتا تھا۔اس کے بغیر رہنا یلماز کیلئے ہمیشہ مشکل رہا تھا، مگر بات اب اوزل کے مستقبل کی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ استنبول میں اچھی یونیورسٹیز اویلیبل نہیں تھیں، بلکہ اتاترک یونیورسٹی میں پڑھنا اوزل کی خواہش تھی جو اس نے یلماز کے سامنے ظاہر کی تھی اور بھلا ایسا ہو سکتا تھا کہ اوزل کسی چیز کی خواہش کرے اور یلماز اسے پورا نہ کرے۔ وہ الگ بات تھی کہ اوزل اب اپنی خواہش پر پچھتا رہا تھا۔

"جونیئر اپنی پڑھائی پر اچھی طرح توجہ دینا...اور اگر کسی بھی چیز کی پریشانی ہو تو بس یلماز کو ایک کال کر دینا۔"

"بھائی آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں اپنی پڑھائی پر پورا دھیان دینے والا ہوں، آخر آپ کی اور اپنے بابا کی خواہش جو پوری کرنی ہے..."

بابا کا لفظ سنتے ہی یلماز کے ہاتھ یک دم سست پڑ گئے۔اس کی آنکھوں میں ایک گہرا سایہ اترا۔

"ویسے بھائی...آپ نے کبھی ماما، بابا کے بارے میں مجھے کچھ بتایا نہیں؟"اوزل دوسری جانب مصروف سے انداز سے بولا۔

یلماز خاموش ہو گیا۔اگلے ہی لمحے اس نے ورزش روک دی اور آہستہ سے دیوار کے ساتھ سر ٹکائے فرش پر بیٹھ گیا۔

اس کی سانسیں اب بھی قدرے بھاری تھیں مگر اس کے اندر اچانک ایک پرانا طوفان جاگ اٹھا تھا۔

"بھائی...؟"اوزل کی آواز ابھری۔

"اوکے بھائی... میں بعد میں بات کرتا ہوں، ابھی دوستوں کے ساتھ ڈنر پر جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے...اور خبردار اگر مجھے پتہ چلا تم نے گارڈز کو ساتھ آنے سے منع کیا ہے۔"

اس بار یلماز ہلکا سا مسکرایا۔

"اوکے بھائی...آپ فکر مت کریں۔خدا حافظ۔"

کال بند ہو گئی،اور کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔یلماز کچھ دیر یونہی خالی نظروں سے سامنے دیکھتا رہا۔اوزل کے الفاظ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"امی... بابا..."اس کے حلق میں جیسے کچھ اٹک گیا۔

کاش... میں تمہیں بتا سکتا کہ کس طرح ہمارے ماں باپ کو میری آنکھوں کے سامنے بے رحمی سے قتل کیا گیا تھا... صرف اس لیے، کیونکہ انہوں نے سب کی مرضی کے خلاف جا کر ایک دوسرے سے شادی کی تھی۔

یلماز کی مٹھی بھنچی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے خون میں لت پت وہ پرانا منظر ایک بار پھر زندہ ہو گیا۔

ایک عورت کی چیخ...

ایک مرد کا گرتا ہوا وجود...

اور ایک چھوٹا سا لڑکا...

جو خوف سے کانپتے ہوئے سب دیکھ رہا تھا۔

یلماز کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرے۔ وہ خاموشی سے اس کے چہرے سے ہوتے ہوئے نیچے ٹپک گئے۔ اور شاید یہی وہ لمحے تھے... جب استنبول کا سب سے طاقتور انسان اندر سے سب سے زیادہ ٹوٹا ہوا محسوس کرتا تھا۔



یمان یلدرز ترکی کے ایک نہایت مشہور لکھاری تھے۔ وہ اسلامی موضوعات پر کتابیں لکھا کرتے تھے اور ان کی لکھی ہوئی کتابیں پورے ترکی میں غیر معمولی شہرت رکھتی تھیں۔ لوگ ان کی کتابیں بڑے شوق سے خریدتے، پڑھتے اور ان سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کی تحریروں میں ایسی گہرائی اور تاثیر تھی کہ پڑھنے والوں کے دلوں تک اتر جاتی۔

وہ دین، انسانیت، صبر اور محبتِ الٰہی جیسے موضوعات پر اس انداز سے لکھتے کہ قاری خود کو ان لفظوں میں کھو دیتا۔

مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی شہرت کے باوجود یمان یلدرز کبھی منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ نہ انہوں نے کبھی کسی تقریب میں شرکت کی... نہ کسی انٹرویو میں نظر آئے۔ لوگ صرف ان کے قلم کو جانتے تھے... ان کے چہرے کو نہیں۔

بس چند قریبی دوست اور رشتہ دار ہی تھے جو ان کی اصل شخصیت سے واقف تھے، اور لکھاری ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک مسجد کے امام بھی تھے۔

کہا جاتا تھا کہ ان کی آواز میں عجیب سا سکون تھا۔ جب وہ اذان دیتے تو آس پاس کا ماحول جیسے تھم جاتا۔ لوگ دور دور سے صرف ان کی آواز سننے کیلئے مسجد آتے تھے۔

ان کی آواز میں نہ غرور تھا...

نہ بناوٹ...

بس ایک سچی بندگی کی مٹھاس تھی۔

پھر ایک دن... تقدیر نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں اناطولیہ گئے ہوئے تھے۔

سردیوں کی ہلکی شام تھی۔

بارش ابھی ابھی رکی تھی اور سڑکیں نمی سے چمک رہی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے راستوں پر رواں تھے جبکہ یمان ایک قدیم کتابوں کی دکان کے باہر کھڑے کچھ کتابیں دیکھ رہے تھے۔ تبھی ان کی نظر سامنے کھڑی ایک عورت پر پڑی۔

سنہرے بھورے بال...

ہلکی نیلی آنکھیں...

اور چہرے پر عجیب سی شرافت۔

وہ میری کرسٹیانا تھی۔ وہ ایک خوبصورت عیسائی خاتون تھیں جن کا تعلق ایک سخت مذہبی خاندان سے تھا۔ اس دن ان دونوں کے درمیان صرف مختصر سی بات ہوئی... مگر شاید قسمت کو یہی منظور تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد رفتہ رفتہ ان کی گفتگو بڑھنے لگی۔

کبھی کتابوں پر بات ہوتی...

کبھی زندگی پر...

کبھی مذہب پر۔

یمان ہمیشہ اس سے نہایت عزت اور وقار سے پیش آتے۔ انہوں نے کبھی اپنی حدود پار نہیں کیں اور میری بھی ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہو گئی تھی۔ وہ یمان کی خاموش طبیعت، نرم لہجے اور پاکیزہ سوچ کو پسند کرنے لگی تھی۔

دوسری طرف یمان بھی اس کے دل کی سچائی کو محسوس کرنے لگے تھے۔ مگر دونوں جانتے تھے کہ ان کا راستہ آسان نہیں۔ اسی لیے انہوں نے غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے صحیح وقت کا انتظار کیا۔ پھر ایک دن دونوں نے فیصلہ کیا کہ اب اپنے رشتے کو حلال بنانے کیلئے اپنے گھر والوں سے بات کرنی چاہیے، مگر شاید دنیا محبت کو اتنی آسانی سے قبول نہیں کرتی۔

جب یمان نے اپنے گھر والوں کے سامنے میری سے شادی کی بات کی تو پورا گھر جیسے آگ بگولا ہو گیا۔

"تم اُس کافر عورت سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"اپنے خاندان کی عزت خاک میں ملا دو گے تم؟"

"اگر تم نے یہ قدم اٹھایا... تو آج کے بعد ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا!"

یمان خاموشی سے سب سنتے رہے، وہ جانتے تھے کہ ان کے الفاظ ابھی کسی کے دل تک نہیں پہنچیں گے۔

دوسری طرف میری کے گھر کا ماحول اس سے بھی زیادہ سخت تھا۔

"تم ایک مسلمان سے شادی کرو گی؟"

"اپنے مذہب کے خلاف جاؤ گی؟"

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا!" اس کے والد نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

مگر جب میری پھر بھی نہ مانی تو معاملہ صرف دھمکیوں تک محدود نہ رہا، اس پر سختی کی گئی، اسے ڈرایا گیا، اس پر ہاتھ بھی اٹھایا گیا۔

اس کی ماں روتی رہتی جبکہ اس کے گھر والے مسلسل اسے مجبور کرتے رہے کہ وہ اپنے چچا کے بیٹے تھامس سے شادی کر لے۔

مگر میری ہر بار ایک ہی جواب دیتی۔

"اگر میں یمان سے شادی نہیں کر سکتی، تو کسی اور سے بھی نہیں کروں گی۔"

"چاہے مجھے پوری زندگی اکیلے گزارنی پڑے..."

اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے، مگر لہجے میں عجیب سا عزم۔

اس کے گھر والوں نے اسے ہر ممکن طریقے سے توڑنے کی کوشش کی... مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔

اور دوسری طرف... یمان بھی خاموشی سے سب برداشت کر رہے تھے۔ شاید محبت پہلی بار ان دونوں کو اتنا مضبوط بنا رہی تھی... اور اتنا تنہا بھی۔

پھر کچھ عرصے کے لیے یمان اور میری کا آپس میں رابطہ مکمل طور پر ختم ہو گیا۔ نہ کوئی خط... نہ کوئی ملاقات... نہ ہی کسی پیغام کی امید۔ مگر محبت اگر سچی ہو تو خاموشی بھی چیخنے لگتی ہے۔ یمان نے خود کو پہلے سے زیادہ عبادت میں مصروف کر لیا تھا۔ وہ ہر نماز کے بعد ہاتھ اٹھاتا اور صرف ایک ہی دعا مانگتا۔

"یا اللہ... اگر میری میرے حق میں بہتر ہے تو اُسے میرے نصیب میں لکھ دے..."

وہ تہجد کی تنہائیوں میں روتا، قرآن کی تلاوت کرتا اور ہر سجدے میں میری کا نام لیے بغیر اُس کے لیے دعا مانگتا۔

اس کے قریبی لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ یمان پہلے سے زیادہ خاموش ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اب ہلکے نمایاں ہونے لگے تھے، مگر اس کے لبوں پر پھر بھی صبر تھا۔

دوسری طرف میری کی حالت بھی کسی زندہ لاش جیسی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی بن چکی تھی۔ گھر والوں کی سختیوں، دھمکیوں اور نفرت بھرے رویّوں نے اُسے اندر سے توڑ دیا تھا۔ اب اُس نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ وہ گھنٹوں کھڑکی کے پاس بیٹھی بارش کو دیکھا کرتی، یا پھر خاموشی سے بستر پر لیٹے چھت کو تکتی رہتی۔ کبھی کبھی اُس کی ماں دروازہ کھول کر غصے سے کہتی۔

"اب یہ رونا دھونا کب تک چلے گا؟"

مگر میری خاموش رہتی، کیونکہ کچھ درد ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب الفاظ میں نہیں دیا جا سکتا۔

راتوں کو وہ چپکے چپکے روتی، اپنے تکیے میں منہ چھپا کر سسکیاں لیتی تاکہ کسی کو اُس کی آواز سنائی نہ دے۔

اُسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ نہ اپنے مذہب میں... نہ اپنے لوگوں میں... نہ اپنی زندگی میں۔

جب بھی اُس کا دل بے حد گھبراتا، اُسے یمان کی آواز یاد آتی۔

وہ پر سکون لہجہ...

وہ نرم انداز...

جب وہ اُسے کبھی کبھی قرآن کی آیات پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔

میری کو عربی سمجھ نہیں آتی تھی، مگر اُن آیات کو سنتے ہوئے اُسے ہمیشہ اپنے دل میں ایک عجیب سا سکون محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اُس کے اندر مچی شوریدہ جنگ چند لمحوں کے لیے تھم جاتی ہو۔ مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ اُسے وہ آیات یاد نہیں تھیں، نہ وہ عربی پڑھ سکتی تھی۔

وہ کئی بار بے بسی سے آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کی کوشش کرتی۔

"وہ... کون سی آیت تھی...؟"

مگر اُسے صرف یمان کی آواز یاد آتی... الفاظ نہیں۔

پھر وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا۔ اور انہی دنوں اُن کے گھر ایک نئی ملازمہ آئی...

جس کا نام فرشتے تھا۔

فرشتے ایک کم عمر شادی شدہ لڑکی تھی جو میری کے گھر صفائی ستھرائی کا کام کیا کرتی تھی۔ وہ نہایت سادہ مزاج، نرم دل اور دھیمی طبیعت کی مالک تھی۔اُس کے سر پر ہمیشہ ہلکے رنگ کا اسکارف بندھا ہوتا اور چہرے پر عجیب سا سکون رہتا تھا۔ وہ کم بولتی تھی مگر اُس کے لہجے میں ایسی مٹھاس تھی جو سننے والے کے دل میں اتر جاتی۔

وقت کے ساتھ ساتھ میری کی فرشتے سے دوستی ہو گئی۔

شاید اس لیے کیونکہ فرشتے وہ واحد انسان تھی جس کے لہجے میں میری کے لیے لیے ترس نہیں، سکون تھا۔

اکثر شام کے وقت جب گھر والے نیچے مصروف ہوتے، فرشتے خاموشی سے اُس کے کمرے میں صفائی کرنے آجاتی اور میری اُس کے پیچھے پیچھے چلتی رہتی، جیسے اُس کے پاس بیٹھنے سے اُسے اندرونی سکون ملتا ہو۔

ایک دن میری کھڑکی کے پاس بیٹھی بارش دیکھ رہی تھی،اُس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ فرشتے خاموشی سے فرش صاف کر رہی تھی کہ اچانک میری دھیرے سے بولی۔

"فرشتے..."

"جی بی بی؟"

"وہ... تم اُس دن کچھ پڑھ رہی تھی نا؟ عربی میں..."

فرشتے چند لمحے اُسے دیکھتی رہی۔

"قرآن کی آیات تھیں۔"

"کیا تم... مجھے پھر سے سنا سکتی ہو؟"

میری کی آواز میں عجیب سی بے بسی تھی۔

فرشتے پہلے تو گھبرا گئی۔ وہ جانتی تھی اگر گھر والوں کو پتا چل گیا تو شاید اُسے فوراً نکال دیا جائے۔

"بی بی... اگر کسی نے سن لیا تو..."

"کوئی نہیں سنے گا..." میری فوراً بولی۔

"براہِ کرم... مجھے وہ آواز دوبارہ سننی ہے..."

فرشتے نے ہچکچاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، پھر وہ دھیرے سے سورۂ رحمٰن کی تلاوت کرنے لگی۔

"**فَبِاَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ**..."

کمرے میں جیسے سکون اتر آیا۔ بارش کی آواز، ہوا کی سرسراہٹ اور قرآن کی تلاوت، سب مل کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ میری خاموشی سے سنتی رہی۔ اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

"یہ دل کو اتنا سکون کیوں دیتا ہے؟" وہ سرگوشی میں بولی۔

فرشتے ہلکا سا مسکرائی۔

"کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے۔"

اُس دن کے بعد میری اکثر فرشتے سے قرآن سنانے کی فرمائش کرتی۔ پھر کچھ وقت بعد میری نے گھر والوں کی نظروں سے چھپتے ہوئے فرشتے کو اپنے ساتھ قرآنِ پاک لانے کو کہا۔ فرشتے حیران رہ گئی۔

"بی بی، اگر کسی نے دیکھ لیا تو بہت مسئلہ ہو جائے گا..."

مگر میری کی آنکھوں میں عجیب سی طلب تھی۔

"صرف ایک بار..." وہ دھیرے سے بولی۔

"میں قرآن کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں..."

جس پر فرشتے مان گئی، اور پھر فرشتے اپنی دوستی کی خاطر چپکے سے اپنے گھر سے قرآنِ پاک لے آیا کرتی۔ وہ اُسے ہمیشہ کپڑے میں لپیٹ کر لاتی تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔

پھر رات کو جب پورا گھر سو جاتا، میری آہستہ سے دروازہ بند کرتی اور پردے گرا دیتی۔ فرشتے بستر کے قریب بیٹھتی اور نہایت ادب سے قرآنِ پاک کھولتی۔ پھر وہ تلاوت شروع کرتی اور ساتھ ساتھ اُس کا ترجمہ بھی سمجھاتی جاتی۔

"اللہ بندوں سے محبت کرتا ہے..."

"اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے..."

"مایوسی اللہ کی رحمت سے دور کر دیتی ہے..."

میری ہر لفظ انتہائی شوق سے سنتی۔ اُس کی آنکھیں اکثر نم ہو جاتیں، مگر نہ جانے کیوں اب اُس کے دل میں پہلی جیسی گھٹن نہیں رہتی تھی۔ وہ کبھی کبھی بچوں کی طرح سوال پوچھتی۔

"کیا اللہ واقعی سب کی دعائیں سنتا ہے؟"

"جی..." فرشتے نرمی سے جواب دیتی۔

"دل سے مانگو تو اللہ کبھی خالی نہیں لوٹاتا۔"

میری خاموش ہو جاتی۔ شاید اُس لمحے وہ دل ہی دل میں یمان کو مانگ رہی ہوتی تھی۔ اب قرآن سننا اُس کی عادت بن چکا تھا۔ وہ ہر رات بے صبری سے فرشتے کا انتظار کرتی۔

اور یوں... آہستہ آہستہ قرآن کی روشنی اُس کے دل میں اترتی چلی گئی۔

پھر وقت مزید گزرتا گیا۔ میری اب پہلے والی میری نہیں رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی بے چینی اب پہلے سے مختلف ہونے لگی تھی، جیسے اُس کے دل کے اندر کوئی نئی روشنی اتر رہی ہو۔ وہ راتیں جو پہلے صرف آنسوؤں اور گھٹن میں گزرتی تھیں، اب اُن میں قرآن کی تلاوت کی نرم آواز شامل ہو گئی تھی۔

رات کے اُس پہر جب پورا گھر خاموشی میں ڈوبا ہوتا، لمبی راہداریوں میں جلتی مدھم زرد بتیاں کسی ویران محل کا گمان دیتیں، تب فرشتے دبے قدموں سے اُس کے کمرے میں داخل ہوتی۔ اُس کے ہاتھ میں کپڑے میں لپٹا قرآنِ پاک ہوتا، جسے وہ ہمیشہ اپنے سینے سے لگا کر لاتی، جیسے کوئی سب سے قیمتی امانت ہو۔ میری بے تابی سے دروازہ بند کرتی اور پھر جلدی سے پردے گرا دیتی۔

"جلدی پڑھو فرشتے..." وہ سرگوشی میں کہتی، جیسے ڈر ہو کہ دیواریں بھی سن لیں گی۔

فرشتے ہلکا سا مسکراتی، پھر بستر کے قریب بیٹھ کر نہایت ادب سے قرآنِ پاک کھولتی۔ کمرے میں فوراً ایک عجیب سا سکون پھیل جاتا۔

"أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ"

فرشتے کی نرم آواز کمرے میں گونجتی تو میری کی بند آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ وہ عربی نہیں سمجھتی تھی، مگر نہ جانے کیوں ہر آیت اُس کے دل پر اترتی محسوس ہوتی۔

"اس کا مطلب کیا ہے؟" وہ نم آنکھوں سے پوچھتی۔

فرشتے محبت سے اُسے دیکھتی۔

"دلوں کو سکون صرف اللہ کے ذکر سے ملتا ہے۔"

یہ سنتے ہی میری کے لب کانپے۔ جیسے کسی نے اُس کے اندر برسوں سے مچی شوریدہ جنگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

"شاید اسی لیے مجھے یہ آوازیں سن کر سکون ملتا ہے..." وہ دھیرے سے بولی۔

فرشتے نے اُسے غور سے دیکھا، میری کی آنکھوں میں اب وہ ضد نہیں رہی تھی جو پہلے اپنے خاندان کے خلاف تھی، بلکہ وہاں کسی سچ کی تلاش تھی۔

پھر ایک رات میری نے اچانک پوچھا۔

"فرشتے... کیا تمہارا خدا واقعی اتنا مہربان ہے؟"

فرشتے مسکرائی۔

"اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔"

میری خاموش ہو گئی۔ اُس کے دل میں کچھ ٹوٹا بھی اور کچھ جڑا بھی... اب وہ ہر رات قرآن سنتی۔

فرشتے اُسے وضو کرنا سکھاتی، دعا مانگنا سکھاتی، اسلام کے بارے میں بتاتی اور میری بچیوں کی طرح شوق سے ہر بات سنتی۔

دوسری طرف گھر والے اُس کی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ تھامس اکثر گھر آنے لگا تھا، مگر میری ہر بار خود کو کمرے میں بند کر لیتی۔ اُسے اب کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

ایک رات بارش ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے باہر آسمان مسلسل گرج رہا تھا جبکہ کمرے میں صرف قرآن کی آواز موجود تھی۔

فرشتے سورۂ مریم کی تلاوت کر رہی تھی اور میری خاموشی سے سن رہی تھی۔ پھر اچانک اُس نے فرشتے کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"فرشتے..." اُس کی آواز کانپی۔

"میں اُس خدا کو ماننا چاہتی ہوں، جس کے کلام سے میرا دل سکون پاتا ہے۔"

فرشتے چند لمحے اُسے دیکھتی رہ گئی، پھر اُس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟" میری نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں تھک گئی ہوں لوگوں کے مذہب سے، اُن کے ظلم سے... اگر خدا واقعی محبت ہے، تو میں اُسی خدا کو چاہتی ہوں۔"

فرشتے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے فوراً دروازے کی طرف دیکھا کہ کہیں کوئی سن نہ لے۔ پھر وہ جلدی سے میری کے قریب بیٹھی۔

"میرے بعد دوہراؤ..."

کمرے میں ہلکی بارش کی آواز گونج رہی تھی۔ اور اُسی رات، خاموشی کے اُس مقدس لمحے میں، میری کرسٹیانا نے کلمہ پڑھ لیا۔

"اشھد اَن لا إلٰہ إلا اللہ و اشھد اَن محمداً رسول اللہ"

کلمہ ادا کرتے ہی میری کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مگر یہ آنسو پہلے جیسے نہیں تھے، یہ سکون کے آنسو تھے۔

فرشتے نے روتے ہوئے اُسے گلے لگالیا۔

"آج سے تم میری بہن ہو..."

میری ہنس بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔

اُسے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ اُس کا دل واقعی پرسکون ہو گیا ہے۔ مگر یہ راز صرف دو لوگوں کے درمیان تھا، فرشتے...اور اب مسلمان ہو چکی میری کے درمیان۔

میری اُس رات اپنے کمرے میں بیٹھی قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی جبکہ باہر سرد ہوا کھڑکیوں سے ٹکرا رہی تھی۔اُس کی نرم آواز میں پڑھی جانے والی آیات پورے کمرے میں سکون بکھیر رہی تھیں۔اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میری چونک گئی۔اُس کا دل بے اختیار زور سے دھڑکا۔وہ فوراً اُٹھی اور جلدی سے قرآنِ پاک بند کر کے کمرے میں رکھے ایک خاص لکڑی کے صندوق میں نہایت احتیاط سے رکھ دیا، پھر اُس نے اپنے اسکارف کو درست کیا اور دروازہ کھولنے چلی گئی۔

دروازہ کھولا تو سامنے فرشتے کھڑی تھی۔ مگر آج اُس کے چہرے پر عجیب سی بے تابی تھی۔وہ فوراً اندر داخل ہوئی اور جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھادی۔

"فرشتے؟ کیا ہوا؟" میری حیرانی سے بولی۔

فرشتے خوشی دباتے ہوئے اُس کے قریب آئی۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک بہت بڑی خوشخبری ہے، میری!"

"کیسی خوشخبری؟" میری کے لہجے میں فوراً تجسس ابھرا۔

"میرے شوہر کل ایک اسلامی مجلس میں جا رہے ہیں اور میں نے سنا ہے وہاں یمان یلدرز نامی شخص بھی شرکت کر رہا ہے۔"

چند لمحوں کے لیے میری جیسے ساکت ہو گئی۔

"یمان...؟" اُس کے لب کانپے۔

"کہیں یہ وہی یمان تو نہیں، جس کے بارے میں تم مجھ سے باتیں کرتی ہو؟"

میری کی آنکھیں نم ہو گئیں، اسے یقین تھا کہ ہزاروں لوگوں میں بھی یمان یلدرز نام کا صرف ایک ہی شخص ہو سکتا تھا۔ اُس کے چہرے پر برسوں بعد زندگی لوٹی تھی۔

"وہ...وہی ہے..." وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے یقین ہے...وہی ہے..." فرشتے نے اُس کا ہاتھ تھاما۔

"اگر تم چاہو، تو کل تم اُس سے مل سکتی ہو۔"

میری نے فوراً اُس کی طرف دیکھا۔

اُس کی دھڑکن جیسے سینے سے باہر آنے لگی تھی۔

"مگر کیسے؟"

فرشتے نے آہستہ آواز میں پورا منصوبہ بتایا۔

"کل رات جب سب سو جائیں گے، تم پچھلے دروازے سے نکل آنا۔ میں باہر انتظار کروں گی۔ پھر ہم میرے گھر جائیں گے، وہاں میرے شوہر یمان صاحب کو لے آئیں گے۔"

میری کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"کیا واقعی میں اُسے دیکھ سکوں گی؟"

فرشتے مسکرائی۔

"اگر اللہ نے چاہا تو ضرور۔"

اُس رات میری سو نہ سکی۔ وہ پوری رات جاگتی رہی۔ کبھی کھڑکی سے باہر اندھیرے کو دیکھتی، کبھی اپنے دل پر ہاتھ رکھتی۔

تین سال...

پورے تین سال بعد وہ یمان کو دیکھنے والی تھی۔

اگلی رات ہر چیز منصوبے کے مطابق ہوئی۔ گھر میں خاموشی چھا چکی تھی۔ سب لوگ سو چکے تھے۔ میری نے خاموشی سے ایک چھوٹا سا بیگ اٹھایا، آخری بار اپنے کمرے کو دیکھا، پھر دھیرے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

وہ ڈر رہی تھی... مگر اُس خوف سے کہیں زیادہ اُس کے دل میں یمان سے ملنے کی تڑپ تھی۔

فرشتے پہلے سے باہر اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ فوراً اُسے اپنے ساتھ لے گئی۔ رات کے اندھیرے میں دونوں خاموشی سے چلتی رہیں... حتیٰ کہ وہ فرشتے کے چھوٹے سے گھر پہنچ گئیں۔

میری کا دل بے قابو ہو رہا تھا، کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔

فرشتے کا شوہر اندر آیا اور اُس کے پیچھے ایک شخص کھڑا تھا...

"یمان۔"

میری کی سانس جیسے رک گئی اور دوسری طرف یمان بھی اُسے دیکھ کر ساکت رہ گیا۔

تین سال بعد... وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ دونوں کی آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"میری..." یمان کے لبوں سے بمشکل نکلا۔ میری روتے ہوئے اُس کے قریب آئی۔

"میں گھر چھوڑ آئی ہوں..." وہ کانپتی آواز میں بولی۔

"اور... میں مسلمان ہو چکی ہوں..."

یمان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے بے اختیار آسمان کی طرف دیکھا، جیسے اپنے رب کا شکر ادا کر رہا ہو۔

"اب... اب ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں رہی..."

میری نم آنکھوں سے بولی۔

یمان نے اُس کے آنسوؤں کو دیکھا، پھر دھیرے سے کہا۔

"تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں نے ہر سجدے میں دعا مانگی تھی۔"

فرشتے اور اُس کا شوہر خاموشی سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔

پھر اگلی صبح یمان میری کو اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔ وہ اُسے اپنے گھر لے کر آیا اور اپنے خاندان سے نکاح کی اجازت مانگی۔ مگر اِس بار بھی اُن کے چہروں پر نفرت تھی۔

"تم اِس گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" یمان کے بڑے بھائی نے سخت لہجے میں کہا۔

"جو نہ اپنے ماں باپ کی وفادار ہوئی، نہ اپنے دین کی..."

میری کی آنکھیں جھک گئیں۔ مگر یمان خاموشی سے سب سنتا رہا۔ پھر اُسے سمجھ آگیا کہ یہ لوگ کبھی بھی میری کو قبول نہیں کریں گے۔ لہٰذا اُس نے خاموشی سے اپنا گھر، اپنا خاندان، سب چھوڑ دیا اور میری کا ہاتھ تھام کر وہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ کچھ وقت بعد دونوں کا نکاح ہو گیا۔

اور میری کرسٹیانا، "مہوش" بن گئی۔ وہ دونوں اپنی نئی زندگی میں خوش تھے۔ پھر وہ طرابزون چلے گئے فرشتے کے قریب۔ طرابزون کے پُرسکون پہاڑوں میں، بادلوں اور سرسبز وادیوں کے درمیان، یمان نے اپنی جمع پونجی سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا کاٹیج خریدا۔ وہ جگہ نہایت پُرسکون تھی۔ صبحیں دھند میں لپٹی ہوتیں اور شامیں بارش کی خوشبو سے مہکتی تھیں۔

مہوش اور فرشتے اکثر ساتھ وقت گزارتی تھیں اور یمان روزانہ قریب والی مسجد میں اذان دیا کرتا تھا۔ اُس کی پُرسوز آواز پہاڑوں میں گونجتی تو مہوش کھڑکی کے پاس کھڑی خاموشی سے سنا کرتی، ہر اذان کے ساتھ اُسے محسوس ہوتا، جیسے اللہ نے آخرکار اُس کے بے سکون دل کو گھر دے دیا ہو۔

شام کا پُرسکون وقت تھا۔ ترابزون کی پہاڑیوں پر بادل آہستہ آہستہ اُتر رہے تھے جبکہ لکڑی کے اُس چھوٹے سے کاٹیج کے اندر ہلکی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے باہر بارش کے بعد کی نمی درختوں کی شاخوں سے ٹپک رہی تھی اور اندر جلتی لکڑیوں کی مہک پورے گھر میں بسی ہوئی تھی۔ یمان اپنی مخصوص لکڑی کی میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ میز پر سفید کاغذ، روشنائی کی دوات اور پرانا قلم رکھا تھا۔ وہ نہایت سکون سے کچھ لکھ رہا تھا۔

پانچ سالہ یلماز فرش پر بیٹھا لکڑی کے چھوٹے گھوڑے سے کھیل رہا تھا مگر اُس کی نظریں بار بار اپنے بابا کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ آخر تجسس اُس پر حاوی ہو گیا اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا یمان کے پاس آگیا۔

"بابا... آپ کیا لکھ رہے ہیں؟" وہ میز کے کنارے سے ٹھوڑی ٹکائے معصومیت سے بولا۔

یمان نے قلم روکا، اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا۔

"ایک خط..."

"کیسا خط؟" یلماز کی آنکھوں میں فوراً چمک ابھری۔

یمان نے کاغذ پر لکھی چند سطروں پر نظر ڈالی پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"ایسا خط... جو میں اپنے بیٹے کے اس وقت کے لیے لکھ رہا ہوں جب وہ بڑا ہو جائے گا۔ تاکہ اگر کبھی میں اس کے پاس نہ ہوں... تو میرے لفظ اس کے ساتھ رہیں اسے صحیح اور غلط کا فرق بتائیں، اور اسے یاد دلائیں کہ انسان کی اصل طاقت اس کے کردار میں ہوتی ہے، دولت یا شہرت میں نہیں۔"

ننھا یلماز چند لمحے خاموش رہا، جیسے اتنی بڑی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اچانک بولا۔

"آپ امی جان کے لیے خط لکھ رہے ہیں؟"

یمان بے اختیار مسکرایا۔

"نہیں... یہ خط میں تمہارے لیے لکھ رہا ہوں تاکہ تم اسے پڑھو، اور اس پر عمل بھی کرو۔"

یلماز کے چہرے پر فوراً اداسی آگئی۔

"بابا... لیکن مجھے تو یہ پڑھنا نہیں آتا۔"

یمان کی آنکھوں میں شفقت اُتر آئی۔ اُس نے یلماز کو اٹھا کر اپنی گود میں بٹھالیا۔

"جب تم پڑھنا سیکھ جاؤ گے... تب یہ خط پڑھنا۔"

یلماز نے فوراً سر ہلایا جیسے اُس نے کوئی بہت اہم ذمہ داری قبول کر لی ہو۔

"میں جلدی پڑھنا سیکھوں گا بابا!"

یمان ہنس پڑا اور اُس کے ماتھے کو چوم لیا۔

یلماز، یمان اور مہوش کی پہلی اولاد تھا، اور اُن دونوں کی دنیا بھی۔ اُن کی ہر دعا، ہر مسکراہٹ اور ہر امید اُس بچے سے جڑی ہوئی تھی۔

ایک دن کاٹیج کے باہر ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔ مہوش اور فرشتے گھر کے باہر لکڑی کی بینچ پر بیٹھی سبز پہاڑیوں کو دیکھ رہی تھیں جبکہ قریب ہی ننھا یلماز لکڑی کی تلوار ہاتھ میں لیے کھیل رہا تھا۔

اچانک مہوش نرم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"فرشتے... میں چاہتی ہوں یلماز بھی یمان کی طرح مسجد میں اذان دے۔"

فرشتے نے اس کی طرف دیکھا اور ہلکے سے مسکرائی۔

"اور ایسا کیوں؟"

مہوش کی نظریں دور کھیلتے اپنے بیٹے پر جم گئیں۔اُس کی آنکھوں میں عجیب سی نمی اور محبت اتر آئی۔

"کیونکہ اذان دینے والا انسان لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہے...اور میں چاہتی ہوں میرا بیٹا ایسا انسان بنے جس کی آواز لوگوں کے دلوں میں سکون اتار دے، جیسے یمان کی آواز میرے بے سکون دل میں اترا کرتی تھی۔ میں چاہتی ہوں دنیا اسے اس کی دولت سے نہیں، اس کی دین اور کردار سے پہچانے۔"

فرشتے خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔

مہوش اکثر یلماز کو اپنے پاس بٹھا کر کہتی تھی۔

"میرے بعد فرشتے تمہاری ماں ہے، یلماز۔اس نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں۔اگر کبھی میں یہاں نہ رہوں، تو فرشتے کو اپنی ماں کا ہی درجہ دینا اور اس کی خدمت کرنا۔"

ننھا یلماز یہ باتیں پوری طرح نہیں سمجھتا تھا، مگر اُس کی ماں جو بھی کہتی، وہ اُسے کسی سبق کی طرح یاد کر لیتا۔

اور شاید اُسے معلوم بھی نہیں تھا... کہ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ایک دن اُسے یلماز یلدرز بنائیں گی۔

سردیوں کی وہ یخ بستہ صبح اپنے اندر ایک عجیب سی وحشت سمیٹے ہوئے تھی۔ترابزون کے پہاڑ دھند کی سفید چادر اوڑھے خاموش کھڑے تھے جبکہ دور کہیں سمندر کی لہریں سرد ہوا کے ساتھ مدھم شور پیدا کر رہی تھیں۔درختوں کی شاخوں پر جمی نمی یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے فطرت خود بھی کسی انجانے خوف میں سانس لے رہی ہو۔

درختوں کے بیچ واقع وہ چھوٹا سا لکڑی کا گھر ہمیشہ کی طرح پر سکون تھا۔مگر شاید قسمت نے آج اس گھر کے نصیب میں سکون نہیں، قیامت لکھی تھی۔

فرشتے ان دنوں ذرا بیمار تھی، اسی لیے وہ اپنے شوہر کے ساتھ قریب کے گاؤں دوا لینے گئی ہوئی تھی۔

گھر میں صرف مہوش، بارہ سالہ یلماز اور ننھا اوزل موجود تھے۔کمرے میں جلتی لکڑیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

مہوش جھولے کے پاس بیٹھی ننھے اوزل کو سینے سے لگائے آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی۔بچہ ابھی چند دن پہلے ہی اس دنیا میں آیا تھا۔اس کا معصوم چہرہ کسی نرم پھول کی مانند لگتا تھا۔

یلماز فرش پر بیٹھا اپنے چھوٹے بھائی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔اس کی گہری سرمئی آنکھوں میں عجیب سی محبت جھلک رہی تھی۔

"امی جان، اوزل کے عارض کتنے ملائم ہیں نا..."

اس نے ننھے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

مہوش اس کی بات پر بے اختیار مسکرائی۔ اس نے یلماز کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"ہاں... بالکل تمہارے بچپن جیسے۔"

یلماز چند لمحے خاموش رہا پھر اچانک بولا۔

"آپ مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہیں یا اوزل سے؟"

مہوش ہلکا سا ہنسی، پھر اس نے یلماز کو اپنے قریب بٹھایا۔

"میں تم دونوں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ مگر یاد رکھنا، تم بڑے بھائی ہو۔ اس لیے اپنے چھوٹے بھائی کا خیال ہمیشہ ایسے رکھنا جیسے تمہارے بابا اور میں تمہارا رکھتے ہیں۔"

یلماز نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلایا، جیسے وہ اپنی ماں کے ہر لفظ کو دل پر لکھ رہا ہو۔

تبھی...

دھڑام!!!

گھر کا دروازہ پوری طاقت سے کھلا۔ مہوش چونک کر کھڑی ہوئی جبکہ یلماز خوفزدہ ہو کر دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

اگلے ہی لمحے یمان تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"بچوں کو چھپا دو مہوش... جلدی!"

مہوش کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"کیا ہوا ہے یمان؟"

"کچھ لوگ... تلواریں لیے اِسی طرف آ رہے ہیں!"

اس کی آواز میں ایسا خوف تھا جو مہوش نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ مہوش کچھ سمجھ پاتی، یمان فوراً یلماز کی طرف بڑھا، اس نے جھولے سے سوئے ہوئے اوزل کو اٹھایا اور یلماز کا ہاتھ پکڑ کر سامنے والے کمرے میں لے گیا۔ کمرے کے کونے میں لکڑی کی ایک بڑی الماری رکھی تھی۔ یمان نے جلدی سے الماری کھولی اور دونوں بچوں کو اندر بٹھایا۔

"جب تک فرشتے نہ آئے، تم اپنے بھائی کو لے کر یہاں سے باہر نہیں نکلنا۔"

"بابا..."یلماز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے،اس کے ننھے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

یمان نے اس کے سر پر بوسہ دیا۔

"اپنے بھائی کا خیال رکھنا... میرے شیر۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی اپنی آواز بھی لرز گئی، پھر اس نے آہستگی سے الماری بند کر دی۔

اندھیری الماری میں یلماز اپنے ننھے بھائی کو سینے سے لگائے سہم کر بیٹھ گیا۔اس کی دھڑکنیں بری طرح بے ترتیب ہو چکی تھیں۔

اگلے ہی لمحے باہر سے بھاری قدموں کی آوازیں گونجیں۔

دھڑام!...

گھر کا دروازہ ایک بار پھر زور سے کھلا۔چند آدمی ہاتھوں میں تلواریں لیے اندر داخل ہوئے۔ان کے چہروں پر درندگی تھی۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"یمان فوراً مہوش کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہو گیا۔

مگر جواب میں صرف ایک سرد قہقہہ گونجا۔اگلے ہی لمحے ان آدمیوں میں سے ایک شخص آگے بڑھا،اور اس نے اپنی تلوار پوری قوت سے یمان کی گردن پر پھیر دی۔

چھنن!... تلوار کی دھار گوشت چیرتی چلی گئی۔

یلماز کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔اس نے الماری میں موجود ایک چھوٹی دراڑ میں سے باہر جھانکا...اس کے بابا کا جسم بے جان ہو کر زمین پر گرا جبکہ خون کسی فوارے کی طرح بہنے لگا۔

مہوش کی دل چیر دینے والی چیخ پورے گھر میں گونج اٹھی۔

"یماااان!!!"

الماری کے اندر بیٹھا یلماز کانپنے لگا۔اس کا پورا جسم برف کی طرح سرد ہو چکا تھا۔اس کے ننھے ہاتھ اوزل کو مزید مضبوطی سے تھام چکے تھے۔

پھر...وہ آدمی مہوش کی طرف بڑھا۔اس نے بے دردی سے مہوش کے بال مٹھی میں جکڑے اور اسے اوپر کھینچا۔

اسی لمحے مہوش کی نظر اس چہرے پر پڑی،اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

"تھ... تھامس...؟"وہ تھامس تھا۔

وہی شخص جس سے شادی سے انکار کر کے مہوش نے اپنی پوری دنیا چھوڑ دی تھی۔ تھامس کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

"تمہیں لگا تھا، تم مجھ سے بچ جاؤ گی؟"

مہوش کے آنسو بہنے لگے۔

"ہم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا...؟"

مگر جواب میں صرف تلوار چمکی، اور اگلے ہی لمحے تھامس نے انتہائی بے رحمی سے مہوش کا گلا کاٹ دیا۔

خون دیواروں تک جا چھینٹا۔ مہوش کا وجود زمین پر گرتے ہی بے جان ہو گیا۔

الماری کے اندر بیٹھا یلماز یہ منظر دیکھ کر جیسے سانس لینا بھول گیا۔ اس کی گہری سرمئی آنکھیں پتھر کی ہو گئی تھیں۔

ننھا اوزل اس کی بانہوں میں سویا ہوا تھا... جبکہ یلماز کی دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو چکی تھی۔



(باب:5)

طرابزون کا ایک اور خوشگوار دن اپنی پوری رعنائی کے ساتھ پہاڑوں پر اترا تھا۔ فضا میں ہلکی سی خنکی گھلی ہوئی تھی جبکہ دور دور تک پھیلے سرسبز پہاڑ دھند کی باریک تہہ اوڑھے کھڑے تھے۔ صبح کی نرم دھوپ درختوں کی شاخوں سے چھن کر زمین پر پڑ رہی تھی اور ہوا میں گیلی لکڑیوں اور مٹی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ کہیں قریب بہتے چشمے کی آواز ماحول کو اور زیادہ پُرسکون بنا رہی تھی۔

اماں فرشتے ہمیشہ کی طرح صبح سویرے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھیں۔

ان کے ہاتھوں میں لکڑیوں کی بنی پرانی ٹوکری تھی جبکہ سر پر گہرے بھورے رنگ کا اسکارف بندھا ہوا تھا۔ وہ پہاڑی راستوں پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی خشک لکڑیاں چن رہی تھیں۔ عمر ڈھل چکی تھی مگر محنت آج بھی ان کی عادت تھی۔

پہاڑوں کے بیچ بہتی ٹھنڈی ہوا بار بار ان کے دوپٹے کو ہلاتی تھی۔ وہ کبھی جھک کر خشک ٹہنی اٹھاتیں تو کبھی دور نظریں اٹھا کر پہاڑوں کو دیکھتیں، جیسے ان خاموش وادیوں میں ان کی پوری زندگی دفن ہو۔ کافی دیر بعد وہ تمام لکڑیاں اکٹھی کر کے اپنی چھوٹی سی کاٹیج میں واپس لوٹ آئیں۔

کاٹیج کے باہر لکڑیوں کی باڑ تھی جبکہ چھت سے لٹکتے چھوٹے پھولوں کے گملے اس سادہ گھر کو عجیب سی خوبصورتی دیتے تھے۔ وہ لکڑیاں ایک کونے میں رکھ کر اندر داخل ہوئیں، اندر حسبِ معمول سکون پھیلا ہوا تھا۔

چولہے میں جلتی لکڑیوں کی آنچ اندر کے ماحول کو گرمائے ہوئے تھی۔

اماں فرشتے اب شام کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی تھیں۔

وہ دیگچی میں سالن ہلاتے ہوئے کبھی نمک ڈالتی تھیں تو کبھی لکڑی کے چمچ سے چولہے کی آنچ درست کرتیں۔

اسی دوران ان کے شوہر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آئے اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے انہیں کھانا پکاتے دیکھتے رہے۔

پھر دھیمی آواز میں بولے۔

"تم نے اُسے بتایا کیوں نہیں کہ ہم اُسے پہلے سے جانتے ہیں؟"

اماں فرشتے کے ہاتھ چند لمحوں کو رکے، مگر اگلے ہی پل وہ دوبارہ پرسکون انداز میں سالن ہلانے لگیں۔

"کسے؟ یلماز کو؟" انہوں نے بغیر مڑے جواب دیا۔

"ہاں..."

اماں فرشتے ہلکا سا مسکرائیں۔

"ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ جب اگلی بار آئے گا... تب شاید ضرورت پڑے۔"

ان کے شوہر کی پیشانی پر ہلکی شکن ابھری۔

"کیا مطلب؟ تمہیں یقین ہے، وہ دوبارہ یہاں آئے گا؟"

اماں فرشتے نے اب کی بار چولہے کی آنچ مدھم کی، پھر آہستگی سے مڑ کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں عجیب سا سکون تھا، جیسے وہ وقت کے بہت سے راز جانتی ہوں۔

"مجھے یقین تھا... قسمت اُسے ایک بار ضرور یہاں تک لائے گی۔"

وہ دھیرے سے بولیں۔

"اور دیکھنا... وقت ایک بار پھر اُسے یہاں لے کر آئے گا۔"

ان کے لبوں پر پراسرار سی مسکراہٹ ابھری۔ مگر سامنے بیٹھے ان کے شوہر کی آنکھوں میں اچانک انجانا خوف لہرا گیا۔ انہوں نے بے اختیار کھڑکی کے باہر پھیلے پہاڑوں کی طرف دیکھا۔ ہوا اب ذرا تیز ہو گئی تھی۔

"فرشتے..." وہ دھیمی آواز میں بولے۔

"اگر اُسے سب یاد آگیا تو...؟"

کمرے میں چند لمحوں کیلئے خاموشی چھا گئی۔

چولہے میں جلتی لکڑیوں کی آواز اب پہلے سے زیادہ نمایاں محسوس ہو رہی تھی۔

اماں فرشتے نے نظریں جھکا لیں۔

"کچھ زخم وقت کبھی نہیں بھرتا۔" وہ آہستہ سے بولیں۔

پھر انہوں نے کھڑکی سے باہر دور پھیلے دھند زدہ پہاڑوں کو دیکھا۔

"اور کچھ سچائیاں...انسان جتنا بھی بھاگ لے، آخر کار اُس تک پہنچ ہی جاتی ہیں۔"



دارالمرجان کے وسیع و عریض اسٹڈی آفس میں اس وقت گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دیواروں پر لگے مہنگے ترک فن پارے، سیاہ اور سنہری رنگ کے امتزاج سے بنا شاہانہ انٹیریئر، اور چھت سے لٹکتا عظیم الشان کرسٹل فانوس پورے کمرے کو رعب دار بنا رہا تھا۔ باہر استنبول میں اندھیرا چھا چکا تھا، جہاں رات کی روشنیاں ستاروں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

یِلماز یلدرزا اپنی عالی شان سیاہ چرمی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ اس کا وجود ہمیشہ کی طرح پُر رعب اور پُر سکون تھا۔ سیاہ شرٹ کی آستینیں کلائی تک فولڈ تھیں جبکہ ہاتھ میں موجود چاندی کی انگوٹھی مدھم روشنی میں ہلکا سا چمک رہی تھی۔ اس کی گہری سرمئی آنکھوں میں وہی خطرناک سنجیدگی تھی جو سامنے والے کو بے اختیار محتاط کر دیتی تھی۔

صفدر اس کے قریب انتہائی باادب انداز میں کھڑا تھا۔

"جو کام میں نے تمہیں کرنے کیلئے کہا تھا... وہ ہو گیا؟"

یِلماز کی گہری آواز کمرے میں گونجی۔

"جی سر۔"

صفدر نے فوراً ایک سیاہ فائل اس کے سامنے رکھی۔

یِلماز نے فائل کو نہایت دلچسپی سے کھولا۔

پہلے صفحے پر واضح حروف میں لکھا تھا۔

نام: عنادل نور

عمر: 23 سال

قومیت: پاکستانی

تعلیم: فائنل ایئر اسکالرشپ اسٹوڈنٹ

یونیورسٹی: کاراکایا یونیورسٹی، ترکی

شعبہ: انجینئرنگ

رہائش: گرلز اپارٹمنٹ، استنبول

گھر کا مستقل پتہ: اسلام آباد، پاکستان

رابطہ نمبر: __________

فیملی بیک گراؤنڈ: متوسط طبقہ

اضافی معلومات:

-غیر معمولی تعلیمی کارکردگی

-یونیورسٹی کی ٹاپ اسکالرشپ ہولڈر

-پارٹ ٹائم ریسرچ اسسٹنٹ

-کسی قسم کی سوشل میڈیا سرگرمی تقریباً نہ ہونے کے برابر

یِلماز خاموشی سے ہر صفحہ غور سے دیکھتا رہا۔ جیسے وہ صرف معلومات نہیں... اس لڑکی کی پوری شخصیت کو پڑھ رہا ہو۔

پھراس کے لبوں پر ہلکی سی پراسرار مسکراہٹ ابھری۔

"گڈ..." اس نے فائل بند کرتے ہوئے کہا، پھر اس نے نظریں اٹھا کر صفدر کی طرف دیکھا۔

"اب ایک کام کرو صفدر..."

"جی سر۔"

"کاراکایا کے ہیڈ پرنسپل کو میرا پیغام پہنچادو۔"

صفدر فوراً متوجہ ہو گیا۔

"کہ وہ اپنی یونیورسٹی میں سے کوئی سے دو اسٹوڈنٹس کو میرا انٹرویو لینے کیلئے اِس ہفتے پوری تیاری کے ساتھ دارالمرجان بھیجیں۔"

صفدر کی آنکھوں میں حیرت ابھری، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یِلماز یلدررز برسوں سے کسی کو انٹرویو نہیں دیتا تھا۔ بڑی بڑی انٹرنیشنل کمپنیوں اور میڈیا ہاؤسز کی درخواستیں تک رد کر دی جاتی تھیں۔

مگر یِلماز ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے فائل پر انگلی رکھتے ہوئے انتہائی پر سکون لہجے میں کہا۔

"اور یاد رہے... ان دو اسٹوڈنٹس میں سے ایک ہر حال میں یہ غزالی آنکھوں والی لڑکی ہونی چاہیے۔"

صفدر نے بے اختیار فائل پر موجود تصویر کی طرف دیکھا۔

عنادل نور۔

"اوکے سر۔" اس نے فوراً سر جھکایا۔

مگر اندر ہی اندر وہ شدید حیران تھا۔

آخر ایسی کیا بات تھی اس لڑکی میں...؟ جس یِلماز یلدررز کے پاس دنیا کی طاقتور شخصیات وقت مانگتی تھیں، آج وہ خود ایک عام سی یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ کو اپنے محل بلانا چاہتا تھا۔

صفدر خاموشی سے وہاں سے نکل گیا۔ اور دوسری طرف یِلماز اپنا سر اپنی شاہانہ کرسی سے ٹکائے آنکھیں موند گیا۔ اس کی انگلیاں آہستگی سے فائل کے اوپر رکھی تھیں۔

چند لمحوں بعد اس نے دھیمی آواز میں خود سے کہا۔

"میں تمہیں دوبارہ دیکھنا چاہتا ہوں... غزالی آنکھوں والی لڑکی۔"



پوری کلاس خاموشی سے پروفیسر یوسف کو سن رہی تھی۔
کمرے کی مدھم سفید روشنی میں سامنے لگی عظیم ڈیجیٹل اسکرین ہلکی نیلی روشنی بکھیر رہی تھی جبکہ یوسف اپنی مخصوص سنجیدگی اور رعب کے ساتھ اسکرین کے سامنے کھڑا تھا۔اس نے ہاتھ میں موجود سیاہ ڈیجیٹل پین کو اسکرین پر چلایا۔ پین کی نوک کے لمس کے ساتھ ہی شیشے جیسی اسکرین پر نیلے حروف ابھرنے لگے۔
"نیوروڈیکس۔٧٤ "
وہ نہایت نفاست سے کیمیکل کا نام لکھتے ہوئے پلٹا۔
نیوی بلیو شرٹ کی آستینیں حسبِ معمول کلائیوں تک فولڈ تھیں جبکہ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں عجیب سی سنجیدگی تھی۔
"آج کا موضوع بہت اہم ہے۔"اس کی بھاری آواز پورے لیکچر ہال میں گونجی۔ تمام طلبہ فوراً متوجہ ہو گئے۔
"آج ہم ایک نہایت خاص...اور خطرناک کیمیکل کے بارے میں پڑھیں گے۔"
پھر وہ دوبارہ اسکرین کی طرف مڑا اور کیمیکل کے نیچے چند مزید فارمولے لکھنے لگا۔
"نیوروڈیکس فورٹی سیون ایک ایسا نیورولوجیکل پیرالائزنگ ایجنٹ ہے... جو انسانی جسم کے اعصابی نظام کو وقتی طور پر مکمل مفلوج کر دیتا ہے۔"
کلاس میں خاموشی مزید گہری ہو گئی۔
"اگر یہ کیمیکل انسانی جسم میں انجیکٹ کر دیا جائے... تو چند سیکنڈز کے اندر انسان کا پورا جسم حرکت کرنا بند کر دیتا ہے۔"
اب کئی طلبہ چونک کر سیدھے بیٹھ گئے تھے۔یوسف نے پرسکون لہجے میں بات جاری رکھی۔
"دل دھڑکتا رہتا ہے، دماغ مکمل طور پر کام کرتا رہتا ہے۔
انسان ہر چیز محسوس کرتا ہے..."
وہ چند لمحے رکا۔
"مگر حرکت نہیں کر سکتا۔"

پوری کلاس پر سنسنی طاری ہو گئی۔

"یہاں تک کہ اگر اس کے جسم کو ٹکڑوں میں بھی کاٹا جائے..." اس کی آواز غیر معمولی حد تک سنجیدہ ہو گئی۔

"تب بھی وہ درد محسوس کرے گا... مگر چیخ نہیں سکے گا۔"

زلیخہ کے ہاتھ بے اختیار رک گئے۔ جولی نے خوفزدہ نظروں سے یوسف کو دیکھا۔

ایک لڑکے نے فوراً ہاتھ کھڑا کیا۔

"سر... کیا یہ کسی عام لیبارٹری میں بنتا ہے؟"

یوسف نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں... یہ عام کیمیکل نہیں ہے۔"

وہ اسکرین پر کیمیکل کی ساخت کو بڑا کرتے ہوئے بولا۔

"اس کی تیاری کیلئے انتہائی ایڈوانس بایو کیمیکل آئسولیشن ٹیکنالوجی درکار ہوتی ہے۔"

وہ اب پوری کلاس میں چلتے ہوئے لیکچر دے رہا تھا۔

"یہ کیمیکل اعصابی خلیوں کے درمیان موجود سگنل ٹرانسمیشن کو بلاک کر دیتا ہے، سادہ لفظوں میں..."

وہ ایک طالبعلم کے قریب رکا۔

"دماغ جسم کو حرکت کا حکم دیتا رہتا ہے... مگر جسم وہ حکم وصول ہی نہیں کر پاتا۔"

"سر... کیا اس کا کوئی علاج موجود ہے؟" ایک لڑکی نے سوال کیا۔

"اگر بروقت اینٹی ڈوٹ مل جائے تو..." یوسف نے جواب دیا۔

"ہاں، انسان بچ سکتا ہے، مگر چند گھنٹوں کے بعد یہ کیمیکل خون میں اس حد تک جذب ہو جاتا ہے کہ پھر ریکوری تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔"

اب پوری کلاس غیر معمولی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ زلیخہ نے محسوس کیا کہ یوسف صرف کتابی معلومات نہیں دے رہا تھا... وہ اس کیمیکل کو ایسے بیان کر رہا تھا جیسے اسے اس کے بارے میں عملی تجربہ ہو۔

"سر..." اب کی بار ایک اور طالبعلم بولا۔

"کیا یہ ترکی میں آسانی سے دستیاب ہے؟"

یوسف کی آنکھوں میں ہلکی سی سنجیدگی اتری۔

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا، پھر ڈیجیٹل اسکرین پر ترکی کا نقشہ ظاہر کیا۔

"پورے ترکی میں یہ کیمیکل صرف چند مخصوص ہائی سیکیورٹی لیبارٹریز میں پایا جاتا ہے۔" اس نے اسکرین پر چند مقامات نشان زد کیئے۔

"اور وہاں بھی اس تک رسائی ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔"

کلاس اب مکمل طور پر اس کے سحر میں گرفتار تھی۔

"کیونکہ یہ کیمیکل اگر غلط ہاتھوں میں چلا جائے..."

وہ دھیرے سے بولا۔

"تو انسان کو قتل کرنا... غیر معمولی حد تک آسان ہو جاتا ہے۔"

چند لمحوں کیلیئے مکمل خاموشی چھا گئی۔

پھر یوسف نے ڈیجیٹل پین بند کیا اور میز کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ سب کی اسائنمنٹ یہ ہے..."

تمام طلبہ فوراً متوجہ ہو گئے۔

"آپ اس کیمیکل پر مکمل ریسرچ رپورٹ تیار کریں گے۔"

اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے صرف انٹرنیٹ سے کاپی کی گئی معلومات نہیں چاہئیں۔" اس کی نظریں پوری کلاس پر گھومیں۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ میں سے کون اس کیمیکل کے نیورولوجیکل اثرات کو واقعی سمجھ سکتا ہے۔" پھر اس کی نگاہ چند لمحوں کیلیئے زلیخہ پر ٹھہری۔

"اور یاد رہے..." وہ دھیرے سے بولا۔

"غلط معلومات جمع کروانے والوں کی اسائنمنٹ ریجیکٹ کر دی جائے گی۔"

پوری کلاس میں ہلکی سی بے چینی پھیل گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن کیف نے اُس کیمیکل کا ذکر مراد میر سے کیا، اور مراد میر اُس کی باریک بینی پر اُسے داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ خود بھی حیران تھے کہ آخر اتنا اہم نکتہ اُن کی نظروں سے کیسے اوجھل رہ گیا تھا۔

"اگر یہ بات سچ ثابت ہو گئی نا کیف... تو کیس کی پوری سمت بدل جائے گی۔" مراد میر سنجیدگی سے بولے تھے۔

کیف نے میز پر رکھی فائل بند کی۔

"اور مجھے پورا یقین ہے سر... قاتل کوئی عام انسان نہیں۔ اُس کے پاس یا تو لیبارٹری تک رسائی ہے... یا پھر کسی ایسے شخص تک، جس کے پاس یہ رسائی موجود ہے۔"

مراد میر نے گہری سانس لی۔

"کل صبح ہم اُن تمام لیبارٹریز کی لسٹ نکلواتے ہیں جہاں یہ کیمیکل موجود ہو سکتا ہے۔"

کیف نے اثبات میں سر ہلایا، اور پھر شام ہوتے ہی اپنا کام مکمل کر کے آفس سے نکل گیا۔

اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ عنادل، جس کا پاؤں اب پہلے سے کافی بہتر ہو چکا تھا، اپنے بستر سے اٹھی اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھی اُسے یقین تھا کہ باہر یارا ہو گی۔ چہرے پر پہلے سے سجی مسکراہٹ لیے اُس نے دروازہ کھولا...

مگر اگلے ہی لمحے وہ مسکراہٹ جیسے جم کر رہ گئی۔

سامنے کیف منصور کھڑا تھا۔ کالے رنگ کی جیکٹ، ہاتھ جیبوں میں، چہرے پر ہمیشہ والی سنجیدگی، اور آنکھوں میں عجیب سی خاموش تھکن۔

"آپ؟" وہ حیرانی اور ہلکے صدمے سے بولی۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" کیف نے اسی سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں..." وہ فوراً بولی۔

کیف، جس کا قدم اندر کی جانب بڑھنے لگا تھا، وہیں رُک گیا۔

"میں اکیلی رہتی ہوں یہاں... اور میں ایسے کسی بھی غیر مرد کو رات میں اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

ایک لمحے کے لیے کیف واقعی اپنی حرکت پر شرمندہ ہوا۔

اُسے احساس ہوا کہ وہ بنا سوچے سمجھے یہاں چلا آیا تھا۔

"سوری... مجھے آنے سے پہلے آپ سے پوچھنا چاہیے تھا۔"

وہ چہرے پر ناکام سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ پہلے بھی پوچھتے... تو تب بھی میرا جواب 'نہیں' ہی ہوتا۔"

کیف کو دوسرا جھٹکا لگا۔

"عجیب لڑکی ہو..." وہ دل میں بڑبڑایا۔

وہ واپس مڑا، مگر پھر جیسے کچھ یاد آیا تو دوبارہ پلٹا۔

"آپ کا پاؤں کیسا ہے اب؟"

"بہت بہتر ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

پھر واپس مڑا، ابھی اُس نے دو قدم ہی لیے تھے کہ پیچھے سے عنادل کی آواز آئی۔

"کیف..." وہ آواز لاشعوری طور پر نکلی تھی۔ اور شاید وہ لاشعوری طور پر کیف کے ساتھ 'سر' لگانا بھول گئی تھی۔

کیف کے قدم وہیں جم گئے۔ پہلی بار اُسے اپنا نام کسی کے لبوں سے اتنا اچھا لگا تھا۔ وہ آہستہ سے پلٹا۔

پیچھے عنادل اُسی سنجیدگی سے کھڑی تھی، مگر چہرے پر اس بار نرمی تھی۔

"اتنی مصروف زندگی میں بھی... میری عیادت کے لیے آنے کا شکریہ۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

کیف چند لمحے خاموش اُسے دیکھتا رہا، پھر اُس کے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"شاید... آپ پہلی مریض ہیں جس نے دروازے سے ہی واپس بھیج دیا۔"

عنادل کے چہرے پر بے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"اور شاید آپ پہلے مہمان ہیں، جو پھر بھی ناراض نہیں ہوئے۔"

کیف نے نظریں جھکائیں، جیسے اُس مسکراہٹ کو اپنے اندر کہیں محفوظ کر لیا ہو۔

"خیر..."

وہ آہستہ سے بولا۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔"

"آپ بھی۔" پھر عنادل اندر چلی گئی اور اپارٹمنٹ کا دروازہ دوبارہ لاک کر دیا۔ اور پیچھے کھڑا کیف کچھ دیر خاموشی سے اُس بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ راہداری میں عجیب سی خاموشی تھی۔ پھر وہ ہلکا سا مسکرایا...اور زیرِ لب بولا۔

"تم سچ میں عجیب ہو..." اور پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔



استنبول کے قدیم قبرستانوں میں ایک عجیب سی وقار بھری خاموشی بسی ہوتی تھی۔ صدیوں پرانے سرو کے درخت اپنی بلند قامت شاخوں سمیت قبروں پر سایہ فگن تھے۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا درختوں کے پتوں سے ٹکراتی تو ایک مدھم سی سرسراہٹ جنم لیتی۔ دور کہیں کسی مسجد سے آتی اذان کی بازگشت اس خاموش فضا میں روحانی سکون گھول رہی تھی۔

یِلماز یلدرز خاموشی سے اپنے دادا کی قبر کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تازہ سرخ گلابوں کا ایک خوبصورت گلدستہ تھا جسے اس نے نہایت احتیاط سے قبر پر رکھا۔ پھر اس نے سر جھکایا اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کی۔

کچھ فاصلے پر صفدر خاموشی سے کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب بھی یِلماز یہاں آتا تھا تو تنہا رہنا پسند کرتا تھا۔ اس لیے تمام محافظوں کو دور روک دیا جاتا تھا۔

یِلماز نے اپنی انگلیوں سے قبر کی مٹی کو آہستگی سے چھوا۔

اسے اپنا بچپن یاد آ گیا... وہ دن جب اس کے ماں باپ کے قتل کے بعد اس کی آنکھ ایک اجنبی کمرے میں کھلی تھی اور سامنے اس کے دادا بیٹھے تھے۔ وہی دادا جنہوں نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا، اسے خوف کے اندھیروں سے نکالا، اور اوزل سمیت دونوں بھائیوں کو اپنے سائے میں پالا۔

دادا اکثر اسے یمان یلدرز کے قصے سنایا کرتے تھے۔

"تمہارے بابا بچپن میں بہت ضدی تھے..." دادا ہنستے ہوئے کہتے۔ اور ننھا یِلماز بڑی دلچسپی سے ہر قصہ سنتا۔

پھر وقت گزرتا گیا... دادا نے اپنے بیٹے اور بہو کے قاتل کو ڈھونڈ نکالا اور اسے قانون کے کٹہرے تک پہنچایا۔

پھر ایک دن... دادا بھی چلے گئے۔ اور یِلماز ایک بار پھر تنہا رہ گیا۔

"دادا..." وہ دھیرے سے بولا۔

"آج آپ کو گئے پورے گیارہ سال ہو گئے ہیں۔"

اس کی آواز میں وہی مضبوطی تھی جو دنیا جانتی تھی، مگر اس مضبوطی کے پیچھے ایک پوتے کی اداسی چھپی ہوئی تھی۔

"آپ کہتے تھے مرد کا اصل امتحان طاقت نہیں، کردار ہوتا ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"میں نے آپ کی بات یاد رکھی۔"

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔

"آپ کہتے تھے دولت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا، دل میں نہیں..."

یِلماز نے نظریں جھکا لیں۔

"دادا... پورا ترکی مجھے جانتا ہے۔ آپ کا کاروبار آج پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ اوزل اپنی تعلیم مکمل کر رہا ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی۔

"مگر بعض اوقات آج بھی دل چاہتا ہے کہ ایک بار آپ کے پاس بیٹھ کر مشورہ لے سکوں۔"

کچھ لمحے خاموشی رہی، پھر وہ دھیرے سے بولا۔

"جانتے ہیں دادا؟ اوزل اب بھی بچہ ہی ہے۔ عمر بڑھ گئی ہے، مگر میرے لیے وہ آج بھی وہی ننھا سا بچہ ہے جسے میں گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔" اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آئی۔

"اور ہاں... میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔" وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"شاید اس لیے کہ میری دنیا اوزل میں سمٹ گئی تھی۔"

کچھ دیر بعد وہ آہستگی سے کھڑا ہو گیا۔ صفدر فوراً ادب سے اس کے قریب آ گیا۔

اب وہ دونوں قبرستان کی پتھریلی راہداری پر چل رہے تھے۔

"سر، اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟" صفدر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

یِلماز نے اپنا سیاہ چشمہ آنکھوں پر لگایا اور سر ہلا دیا۔

"اس پورے قبرستان میں ہر طرف سفید گلاب نظر آتے ہیں، لیکن آپ جب بھی آتے ہیں تو صرف سرخ گلاب لاتے ہیں۔"

یِلماز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"دادا کو سرخ گلاب بہت پسند تھے۔"

صفدر بھی مسکرا دیا، چند قدم چلنے کے بعد یِلماز دوبارہ بولا۔

"ایک ذمہ داری تمہارے سپرد ہے اب۔"

"جی سر؟"صفدر نے فوراً پوچھا۔

یِلماز کی آواز معمول کے مطابق پر سکون تھی۔

"جب میں مر جاؤں... تو میری قبر پر ہر ہفتے تازہ سرخ گلاب رکھا کرنا۔"

صفدر کے قدم بے اختیار رک گئے۔

"مجھے بھی دادا کی طرح سرخ گلابوں سے محبت ہے۔"

"سر... خدا نہ کرے ایسی بات ہو۔"اس کی آواز میں حقیقی اضطراب تھا۔

یِلماز ہلکا سا مسکرایا۔

"موت سے کوئی سودا نہیں کر سکتا صفدر۔"

وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہم سب نے ایک دن جانا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ لوگ اپنے پیچھے صرف قبر چھوڑ جاتے ہیں... اور کچھ لوگ یادیں۔"

صفدر خاموش ہو گیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ دنیا کے طاقتور ترین لوگوں کے دلوں میں بھی کچھ ایسے زخم ہوتے ہیں جو کبھی نہیں بھرتے۔ قبرستان کے مرکزی دروازے کے قریب پہنچ کر یِلماز اپنی مخصوص سیاہ رنگ کی انتہائی مہنگی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہوا۔ انجن کی مدھم آواز بلند ہوئی۔ اور گاڑی آہستہ آہستہ قبرستان سے نکل گئی...

مگر سرخ گلابوں کی خوشبو ابھی بھی اس قبر کے گرد بکھری ہوئی تھی، جہاں ایک پوتا ہر بار دنیا کا سب سے طاقتور آدمی نہیں، بلکہ صرف اپنے دادا کو یاد کرنے والا ایک تنہا بچہ بن کر آتا تھا۔



کلاس روم میں غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تمام طلبہ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ پروفیسر یوسف ایک ایک کر کے اسائنمنٹس کا جائزہ لے رہے تھے۔

"اس بار مجھے خوشی ہے کہ تقریباً سبھی طلبہ نے محنت کی ہے۔" یوسف نے رجسٹر بند کرتے ہوئے کہا۔

"خاص طور پر اس کیمیکل کے بارے میں تحقیق آسان نہیں تھی، لیکن آپ لوگوں نے کافی اچھی کوشش کی ہے۔"

کلاس میں موجود کئی طلبہ کے چہروں پر خوشی ابھر آئی۔

زلیخہ بھی خاموشی سے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے اسائنمنٹ کھلی ہوئی تھی جس پر اچھے نمبر درج تھے۔ یوسف پہلے ہی اس کی تعریف کر چکا تھا اور یہی بات اس کے دل میں عجیب سی خوشی پیدا کر رہی تھی۔

اسی دوران کلاس روم کا دروازہ کھلا۔ تمام نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ ایک لمبے قد کی وہی باوقار خاتون اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر اعتماد نمایاں تھا۔ سیاہ رنگ کا پروفیشنل سوٹ، ہاتھ میں فائل اور آنکھوں میں سنجیدگی...

یوسف کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اوہ، آپ آ گئیں۔" وہ اس کی جانب بڑھا۔

زلیخہ کے دل میں نہ جانے کیوں ایک عجیب سی چبھن سی محسوس ہوئی۔ یوسف کلاس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اس سے پہلے کہ آج کا لیکچر ختم ہو، میں آپ لوگوں کو ایک خاص شخصیت سے ملواتا چلوں۔"

وہ ایک طرف ہٹا۔

"یہ یسریٰ ہیں۔ میری پرانی دوست۔"

یسریٰ نے مسکرا کر تمام طلبہ کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" کلاس نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

یوسف دوبارہ بولا۔

"جس کیمیکل کے بارے میں ہم گزشتہ چند دنوں سے پڑھ رہے ہیں، وہ ترکی کی چند مخصوص لیبارٹریوں میں تیار کیا جاتا ہے۔"

اس نے یسریٰ کی طرف اشارہ کیا۔

"اور ان چند لیبارٹریوں میں سے ایک کی مینیجر یہ ہیں۔"

فوراً پوری کلاس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ کئی طلبہ حیرت سے یسریٰ کو دیکھنے لگے۔

"واہ..." کسی نے سرگوشی کی۔

ایک طالب علم نے ہاتھ کھڑا کیا۔

"میڈم، کیا واقعی اس کیمیکل تک عام لوگوں کی رسائی ممکن نہیں؟"

یسریٰ ہلکا سا مسکرائی۔

"بالکل نہیں۔ اس کی تیاری اور ذخیرہ دونوں انتہائی سخت نگرانی میں ہوتے ہیں۔"

وہ پیشہ ورانہ انداز میں جواب دے رہی تھی، جبکہ یوسف خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ زلیخہ کی نظریں کبھی یوسف پر جاتیں اور کبھی یسریٰ پر، پھر اچانک اس نے ایک بات محسوس کی۔

یسریٰ جب بھی کوئی جواب دیتی تھی، اس کی نظریں غیر ارادی طور پر یوسف کی جانب اٹھ جاتیں۔ اور ہر بار اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی نرمی جھلک جاتی۔

وہ نرمی... جسے شاید کوئی عام شخص نہ پہچان پاتا۔ لیکن ایک لڑکی پہچان سکتی تھی اور زلیخہ پہچان گئی تھی۔

اس کے دل میں بے اختیار ایک عجیب سا احساس جاگا۔ جیسے کسی نے خاموشی سے اس کے سینے میں کانٹا چبھو دیا ہو۔

"تو یہ بات ہے..." وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی، پھر اس نے دوبارہ یسریٰ کی طرف دیکھا۔

وہ خوبصورت تھی، تعلیم یافتہ تھی، پراعتماد تھی، اور سب سے بڑھ کر... یوسف اسے جانتا تھا۔ شاید بہت پہلے سے، یہ خیال آتے ہی زلیخہ کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔

"مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟" اس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"آخر وہ میرا کیا لگتا ہے؟" لیکن دل عجیب چیز تھا، وہ منطق ماننے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ سامنے یوسف اور یسریٰ کسی بات پر مسکرائے اور زلیخہ نے فوراً اپنی نظریں رجسٹر پر جھکا لیں۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ حسد واقعی ایک بہت تلخ احساس ہوتا ہے اور شاید اس سے بھی زیادہ تلخ یہ احساس تھا کہ وہ اس حسد کی وجہ جانتی تھی...



وہ بوجھل دل کے ساتھ گھر پہنچی تھی۔ پورا راستہ اس کے ذہن میں وہی منظر گھومتا رہا تھا۔

یوسف...

اور یسریٰ...

جیسے ہر بار آنکھیں بند کرنے پر وہی منظر اس کے سامنے آجاتا۔ گھر پہنچتے ہی وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بستر پر گر گئی۔ تکیے میں منہ چھپائے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ آخر اسے اتنا برا کیوں لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا کہ یوسف کی زندگی میں وہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔

کافی دیر رونے کے بعد اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا فون اٹھایا اور اربش کا نمبر ملا دیا۔ پہلی ہی بیل پر کال اٹھالی گئی۔

"ہیلو؟"

"ہیلو..." زلیخہ کی بھاری اور رندھی ہوئی آواز سن کر اربش فوراً چونک گئی۔

"تم رو رہی ہو؟"

"ہاں..."

"زلیخہ، کیا ہوا؟ سب خیریت ہے؟" اربش کی آواز میں تشویش واضح تھی۔

"کچھ بھی خیریت نہیں ہے۔" زلیخہ پھر سے رونے لگی۔

"اللہ کے لیے سیدھی طرح بتاؤ ہوا کیا ہے؟"

چند لمحے خاموشی رہی، پھر زلیخہ دھیرے سے بولی۔

"یوسف مجھ سے نہیں... کسی اور سے محبت کرتا ہے۔"

دوسری طرف چند سیکنڈ کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"کیا؟"

"میں نے خود دیکھا ہے۔" زلیخہ نے نم آواز میں کہا۔

"آج ایک لڑکی آئی تھی۔ یسریٰ..." پھر اس نے ساری بات تفصیل سے اربش کو بتادی۔ اربش خاموشی سے سنتی رہی۔ جب زلیخہ خاموش ہوئی تو اربش نے گہرا سانس لیا۔

"بس؟"

"بس؟" زلیخہ کو جیسے یقین ہی نہ آیا۔

"تمہیں یہ سب سن کر صرف 'بس' کہنا ہے؟"

"کیونکہ جو تم نے بتایا ہے، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔" اربش نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔"

"اور؟"

"اور وہ اس کی دوست تھی۔"

"اور؟"

زلیخہ خاموش ہو گئی۔ اربش نے آہستہ سے کہا۔

"زلیخہ، کبھی کبھی ہم اپنے ڈر کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔"

"لیکن..."

"نہیں، میری بات سنو۔" اربش نے اسے روکا۔

"کیا تم نے یوسف کو اپنی زبان سے یہ کہتے سنا کہ وہ یسریٰ سے محبت کرتا ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا تم نے یسریٰ کو یہ کہتے سنا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم نے خود ہی ایک کہانی بنائی، خود ہی اس پر یقین کیا اور اب خود ہی رو رہی ہو۔"

زلیخہ خاموش ہو گئی، اسے ماننا پڑا کہ اربش کی بات میں وزن تھا۔

"لیکن مجھے یسریٰ کی آنکھوں میں محبت نظر آئی تھی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ممکن ہے۔" اربش نے جواب دیا۔

"لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ محبت صرف ایک طرفہ ہو۔"

زلیخہ چونکی۔

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم نے غلط سمجھا ہو۔"

زلیخہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"دیکھو، ابھی نتیجہ نکالنے کا وقت نہیں ہے۔" اربش نرمی سے بولی۔

"کبھی کبھی حقیقت وہ نہیں ہوتی جو دور سے نظر آتی ہے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

زلیخہ کے آنسو اب کافی حد تک رک چکے تھے۔

"اب میری بات غور سے سنو۔" اربش بولی۔

"کل یونیورسٹی مت جانا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تمہاری موجودہ حالت میں تم پورا دن بس یوسف اور یسریٰ کو سوچتی رہو گی۔"

زلیخہ خاموش رہی۔

"کل ہم دونوں ملتے ہیں۔" اربش نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کہیں باہر چلتے ہیں، اچھی سی کافی پیتے ہیں اور پھر تم مجھے پوری کہانی شروع سے آخر تک سنانا۔"

زلیخہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"تم واقعی میری دوست ہو۔"

"مجھے ابھی پتا چلا؟" اربش نے جان بوجھ کر ناراضی ظاہر کی۔

جس پر زلیخہ کی ہلکی سی ہنسی نکل گئی اور شاید یہی وہ پہلی ہنسی تھی جو اس شام اس کے لبوں پر آئی تھی۔

"اچھا اب سو جاؤ۔" اربش نے کہا۔

"اور یاد رکھو... جب تک حقیقت سامنے نہ آجائے، اپنے دل کو خود سے سزا مت دو۔"

زلیخہ خاموش ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔

"شب بخیر، اربش۔"

"شب بخیر، ڈرامہ کوئین۔"

زلیخہ بے اختیار مسکرا دی، کال بند ہو گئی، اور کمرے میں ایک بار پھر خاموشی پھیل گئی۔ مگر اس بار اس خاموشی میں پہلے جیسی گھٹن نہیں تھی۔



دارالمرجان کی کے اندر موجود اسپورٹس ونگ اپنی شان و شوکت میں کسی شاہی کلب سے کم نہ تھا۔ اونچی چھتوں سے آویزاں نفیس فانوس نرم سنہری روشنی بکھیر رہے تھے۔ دیواروں پر قیمتی لکڑی کی پینلنگ تھی جبکہ فرش پر گہرے رنگ کی چمکدار لکڑی بچھی ہوئی تھی۔ کمرے کے عین وسط میں ایک شاندار اسنوکر ٹیبل موجود تھی، جس کا سبز مخملی کپڑا دور سے ہی اپنی نفاست کا احساس دلا رہا تھا۔

یلماز یلدرز اس وقت اسنوکر ٹیبل کے ایک کنارے پر کھڑا تھا۔

سیاہ رنگ کی شرٹ کے بازو کہنیوں تک چڑھے ہوئے تھے جبکہ اوپر کے دو بٹن کھلے تھے۔ اس کی مضبوط کلائیاں اور تنومند بازو اس کی مسلسل ورزش کا پتہ دے رہے تھے۔

وہ جھکا۔ اس کی نظریں سفید گیند اور نشانے پر جمی تھیں۔

پورا کمرہ خاموش تھا۔ اگلے ہی لمحے کیو اسٹک اس کی انگلیوں کے درمیان حرکت میں آئی۔

ٹک!

سفید گیند برق رفتاری سے آگے بڑھی۔

ٹک!

سرخ گیند کونے کے پاکٹ میں جا گری۔

مگر کھیل ختم نہیں ہوا تھا۔ سفید گیند گھومتی ہوئی دوسرے زاویے سے واپس آئی اور ایک اور گیند کو ایسی درستگی سے چھوا کہ وہ بھی پاکٹ میں جا گری۔

یہ شاٹ کسی عام کھلاڑی کا نہیں تھا۔ وہ ایک پروفیشنل کی مہارت سے کھیل رہا تھا۔ یلماز نے سکون سے سیدھا ہو کر کیو اسٹک ایک طرف گھمائی۔ اس کے چہرے پر نہ غرور تھا نہ جوش، صرف اعتماد... وہ اعتماد جو صرف کامیاب لوگوں کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔

"سر..." صفدر اندر داخل ہوا۔

یلماز کی نظریں ابھی بھی اسنوکر ٹیبل پر تھیں۔

"بولو صفدر؟"

"سر، جبران یلدرز آپ سے بات کرنے کے لیے آئے ہیں۔"

صفدر مؤدبانہ انداز میں بولا۔

یلماز کے ہاتھوں کی حرکت رک گئی۔ کمرے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"جاؤ، انہیں بٹھاؤ۔ میں آتا ہوں۔" اس کی آواز معمول کے مطابق پرسکون تھی۔

"اوکے سر۔" صفدر سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی یلماز کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

اس کی آنکھوں میں سرخی ابھرنے لگی، جبڑے سختی سے بھینچ گئے، ہاتھ میں پکڑی کیو اسٹک پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

"جبران یلدرز..." وہ زیرِ لب بولا۔

یہ نام آج بھی اس کے اندر کہیں نہ کہیں آگ لگا دیتا تھا۔

جبران... اس کے تایا، یعنی یمان یلدرز کے بڑے بھائی۔

یلماز کو اپنے تایا کے بارے میں تب معلوم ہوا تھا جب وہ اپنے دادا کے پاس آیا تھا۔ مگر جاننے کے بعد بھی وہ کبھی انہیں اپنا نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ اس کے دل میں ایک سوال ہمیشہ زندہ رہا تھا۔ اگر جبران یلدرز نے اس کی ماں کو قبول کر لیا ہوتا... اگر انہوں نے یمان یلدرز کا ساتھ دیا ہوتا... تو کیا آج سب کچھ مختلف نہ ہوتا؟ کیا اس کے والدین زندہ نہ ہوتے؟

کیا اسے بارہ برس کی عمر میں اپنے ماں باپ کا خون اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھنا پڑتا؟

یہ سوال سالوں گزرنے کے باوجود اس کے دل میں زخم کی طرح موجود تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اصل قاتل تھامس تھا۔ اسے سزا بھی مل چکی تھی، مگر بعض اوقات انسان قاتل سے زیادہ ان لوگوں سے شکوہ کرتا ہے جنہوں نے وقت پر ساتھ نہ دیا ہو اور یلماز کے دل میں جبران یلدرز کے لیے یہی شکوہ موجود تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اسنوکر ٹیبل کے گرد چلا، پھر آخری گیند کے سامنے رک گیا۔ اس کی نظریں گیند پر تھیں مگر ذہن ماضی میں بھٹک رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے زور سے شاٹ کھیلا۔

ٹک!

کالی گیند سیدھی پاکٹ میں جا گری۔ یلماز نے گہرا سانس لیا۔

پھر کیو اسٹک میز پر رکھی، اپنے کوٹ کے بٹن بند کیے،

کلائی پر بندھی مہنگی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پر دوبارہ وہی پرسکون تاثرات لوٹ آئے تھے۔ مگر آنکھوں کی گہرائی میں برسوں پرانی ناراضی اب بھی زندہ تھی۔ آج کئی سال بعد تایا اور بھتیجا ایک بار پھر آمنے سامنے بیٹھنے والے تھے۔

دارالمرجان کے وسیع ڈرائنگ روم میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اونچی چھت، نفیس فانوس، دیواروں پر آویزاں نایاب مصوری اور دور تک پھیلے شاہانہ فرنیچر کے باوجود اس وقت کمرے کی فضا میں ایک عجیب سا تناؤ موجود تھا۔

جبران یلدرز چمڑے کے صوفے پر بیٹھے تھے۔ عمر نے ان کے بالوں میں سفیدی گھول دی تھی اور چہرے پر وقت کی تھکن واضح تھی۔

دروازہ کھلا۔ کمرے میں موجود تمام محافظ فوراً سیدھے ہو گئے۔ یلماز یلدرز اندر داخل ہوا۔

سیاہ رنگ کا تھری پیس سوٹ، کلائی پر مہنگی گھڑی، آنکھوں پر ہلکے رنگ کے چشمے اور چہرے پر وہی ناقابلِ فہم سنجیدگی۔ اس نے ایک نظر جبران پر ڈالی، پھر آہستگی سے ان کے سامنے والی نشست پر بیٹھ گیا۔

"خیریت؟" اس کی آواز میں نہ اپنائیت تھی نہ گرمجوشی، صرف رسمی سرد مہری۔

جبران نے چند لمحے اسے دیکھا۔ ہر بار کی طرح آج بھی انہیں اپنے چھوٹے بھائی یمان کی جھلک اس کے چہرے میں نظر آئی۔

"کیسے ہو، یلماز؟"

"مصروف ہوں۔" مختصر جواب آیا۔

جبران نے آہ بھری۔

"میں تمہارا تایا ہوں۔"

"مجھے یاد ہے۔" یلماز نے بے تاثر انداز میں کہا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" بالآخر یلماز نے اصل سوال پوچھا۔

جبران چند لمحے خاموش رہے، گویا الفاظ جمع کر رہے ہوں۔

"میری کمپنی کو شدید نقصان ہوا ہے۔"

یلماز کے چہرے پر کوئی تاثر نہ آیا۔

"پچھلے دو سالوں میں کئی معاہدے ختم ہو گئے۔ سرمایہ کار پیچھے ہٹ گئے۔" جبران کی آواز میں تھکن تھی۔

"میں نے بہت کوشش کی... لیکن اب حالات میرے قابو سے باہر ہیں۔"

یلماز خاموشی سے سنتا رہا۔

"مجھے تمہاری مدد چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے جبران کی نظریں جھک گئیں۔

دارالمرجان کی خاموش فضا میں یہ الفاظ غیر معمولی محسوس ہوئے۔ ترکی کے ایک زمانے کے کامیاب کاروباری شخص کو آج اپنے بھتیجے کے سامنے مدد مانگنی پڑ رہی تھی۔

چند لمحے خاموشی رہی، پھر یلماز نے دھیرے سے پوچھا۔

"مدد؟"

"ہاں۔"

"کیسی مدد؟"

"صرف ایک سرمایہ کاری۔" جبران بولے۔

"تمہارا ایک فیصلہ میری کمپنی کو دوبارہ کھڑا کر سکتا ہے۔"

یلماز نے اپنی انگلیوں کو آپس میں جوڑا، پھر اپنی نشست سے ذرا سا پیچھے ٹیک لگا لی۔ اس کی آنکھیں مسلسل جبران کے چہرے پر جمی تھیں۔

"اور آپ کو لگا میں یہ کر دوں گا؟"

جبران نے تلخی محسوس کی۔

"میں تمہارا خاندان ہوں۔"

یلماز ہلکا سا مسکرایا، مگر وہ مسکراہٹ طنز سے بھری تھی۔

"خاندان؟" اس نے دہرایا۔

"دلچسپ لفظ ہے۔"

جبران کے چہرے پر ناگواری ابھری۔

"یلماز..."

"جب میرے والد نے اپنی پسند کی عورت سے نکاح کرنا چاہا تھا..." یلماز نے پہلی بار ان کی بات کاٹ دی۔

"تب آپ نے کیا کہا تھا؟"

جبران خاموش ہو گئے۔

یلماز کی آواز اب بھی پرسکون تھی۔ مگر اس سکون کے نیچے برسوں کی آگ دفن تھی۔

"آپ نے کہا تھا..." وہ آہستگی سے بولا۔

"اگر تم اس عورت کو قبول کرو گے تو ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔"

جبران نے نظریں جھکا لیں۔

"ماضی کی غلطیاں تھیں۔"

"غلطیاں؟" یلماز ہلکا سا ہنسا۔

"ان غلطیوں کی قیمت میرے والد نے اپنی جان دے کر ادا کی۔"

خاموشی۔

"میری والدہ نے اپنی جان دے کر ادا کی۔"

خاموشی۔

"اور ایک بارہ سالہ بچے نے اپنے ماں باپ کا خون دیکھ کر ادا کی۔"

جبران کے ہونٹ کانپے۔

"میں شرمندہ ہوں۔"

"بہت دیر سے۔"۔یلماز نے فوراً جواب دیا۔

جبران نے پہلی بار بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو تم میری مدد نہیں کرو گے؟"

یلماز خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا، پھر کھڑکی کے پاس جا کر رک گیا۔اس کے سامنے دارالمرجان کے وسیع باغات پھیلے ہوئے تھے۔

"آپ جانتے ہیں تایاابو..."وہ پشت موڑے ہوئے بولا۔

"بعض دروازے ایک بار بند ہو جائیں تو دوبارہ نہیں کھلتے۔"

جبران کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"میں تمہاراخون ہوں۔"

یلماز نے آہستگی سے سر موڑااور پہلی بار سیدھااان کی طرف دیکھا۔

"اور میری ماں کیا تھیں؟"

یہ سوال تیر کی طرح جا کر لگا۔جبران کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

یلمازان کے قریب آیا۔اس کی آواز مکمل طور پر پر سکون تھی۔

"جس دن آپ نے میری ماں کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا..."

وہ بولا۔

"اسی دن آپ نے میرے والد کو بھی کھو دیا تھا۔"

جبران کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

"اور آج..."

یلماز نے بات مکمل کی۔

"میں بھی وہی جواب دے رہا ہوں۔"

خاموشی۔

"میں آپ کی درخواست قبول نہیں کر سکتا۔"

جبران کے چہرے پر شکست اتر آئی۔

"یعنی یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

یلماز نے سر ہلایا۔

"جی۔" پھر چند لمحے بعد مزید بولا۔

"دارالمرجان میں آنے والے مہمانوں کو کبھی خالی ہاتھ نہیں جانے دیا جاتا۔"

جبران نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس لیے جاتے وقت صفدر آپ کو ایک گاڑی اور کچھ تحائف دے دے گا۔"

پھر اس کی آواز سرد ہو گئی۔

"لیکن کاروبار میں آپ کو مجھ سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔"

جبران کچھ لمحے خاموش بیٹھے رہے، پھر آہستگی سے کھڑے ہو گئے۔ اب ان کے قدموں میں پہلے والی مضبوطی نہیں رہی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھے اور پہلی بار یلماز کو محسوس ہوا کہ وقت نے واقعی ان کے تایا کو بوڑھا کر دیا تھا۔

دروازہ بند ہوا۔

کمرے میں دوبارہ خاموشی چھا گئی، یلماز کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں کوئی فتح نہیں تھی، کیونکہ بعض انتقام جیت کر بھی انسان کو سکون نہیں دیتے۔



نئی معلومات نے اس کیس میں جیسے جان ڈال دی تھی۔ کئی ہفتوں سے تفتیش ایک ہی جگہ پر رکی ہوئی تھی، مگر اب پہلی بار انہیں محسوس ہوا تھا کہ وہ قاتل کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ استنبول کرائم برانچ کے خصوصی تفتیشی دفتر حقیقت پوسٹ میں اس وقت رات کے تقریباً نو بج رہے تھے۔ عمارت کے بیشتر حصے خاموش ہو چکے تھے۔

اکثر کولیگز اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ مگر ایک کمرے کی روشنیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔

مراد دمیر اپنی میز کے پیچھے بیٹھے تھے جبکہ ان کے سامنے کئی فائلیں اور لیبارٹری رپورٹس پھیلی ہوئی تھیں۔

دوسری جانب کیف منصور کھڑا دیوار پر لگے بڑے بورڈ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ بورڈ پر دونوں مقتولین کی تصاویر، جائے وقوعہ کے نقشے، رپورٹوں کی نقول اور مختلف نوٹس لگے ہوئے تھے۔ کیف نے ایک سرخ مارکر اٹھایا اور بورڈ پر ایک لفظ کے گرد دائرہ کھینچا۔

"یہی ہے وہ چیز جس نے پورا کیس بدل دیا ہے۔"

مراد دمیر نے سر اٹھایا۔

"کیمیکل؟"

"جی۔"

کیف سنجیدگی سے بولا۔

"دونوں لاشوں کے خون کے نمونوں میں یہی مرکب پایا گیا تھا۔"

مراد دمیر نے میز پر رکھی رپورٹ دوبارہ دیکھی۔

"اور دونوں مقتولین کی موت سے تقریباً پندرہ منٹ پہلے یہ ان کے جسم میں داخل کیا گیا تھا۔"

"بالکل۔"

کیف نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اس کا مطلب قاتل پہلے انہیں مفلوج کرتا ہے، پھر قتل کرتا ہے۔" کمرے میں چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

مراد دمیر نے گہرا سانس لیا۔

"ہمیں خود کو خوش قسمت سمجھنا چاہیے کہ فرانزک ٹیم نے اتنی معمولی مقدار میں موجود اس مادے کو دریافت کر لیا۔"

کیف ہلکا سا مسکرایا۔

"شاید..."

پھر وہ میز کے قریب آ گیا۔

"میں نے پورے ترکی کی فارماسیوٹیکل اور ریسرچ لیبارٹریوں کا ریکارڈ چیک کروایا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک نئی فائل مراد میر کے سامنے رکھ دی۔

مراد میر نے فائل کھولی۔ پہلے صفحے پر چند مخصوص لیبارٹریوں کے نام درج تھے۔ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ مراد میر کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"صرف سات؟"

"جی سر۔" کیف بولا۔

"پورے ترکی میں صرف سات رجسٹرڈ لیبارٹریاں ایسی ہیں جہاں اس درجے کے نیورو پیرالائٹک کیمیکل پر تحقیق یا تیاری کی اجازت موجود ہے۔" مراد میر فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"یعنی ہمارا دائرہ ہزاروں لوگوں سے کم ہو کر چند درجن افراد تک آ گیا۔"

"بالکل۔" کیف نے جواب دیا۔

"اب ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ ان سات لیبارٹریوں میں سے کس جگہ سے یہ کیمیکل نکالا گیا۔"

مراد میر کی آنکھوں میں پہلی بار امید کی چمک ابھری۔

"سیکیورٹی فوٹیج؟"

"منگوالی ہیں۔"

"ملازمین کا ریکارڈ؟"

"اس پر کام شروع ہو چکا ہے۔"

"حالیہ استعفے؟"

"وہ بھی۔"

مراد میر نے چند لمحے خاموش رہ کر کیف کو دیکھا، پھر مسکرا دیے۔

"میں مانتا ہوں کیف، اگر تم یہ کیمیکل والی بات نہ پکڑتے تو شاید ہم ابھی تک اندھیرے میں ہی بھٹک رہے ہوتے۔"

کیف نے نظریں چرائیں، تعریف سننا اسے کبھی پسند نہیں تھا۔

"ابھی قاتل نہیں ملا سر۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"لیکن پہلی بار اس نے کوئی نشان چھوڑا ہے۔"

مراد میر کرسی سے اٹھے اور بورڈ کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ان کی نظریں مقتولین کی تصاویر پر تھیں۔

"تم جانتے ہو اس کا کیا مطلب ہے؟"

"کیا؟"

"قاتل خود کو ناقابلِ شکست سمجھنے لگا ہے۔"

مراد میر دھیرے سے بولے۔

"اور جب مجرم یہ سمجھنے لگے کہ وہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا..."

وہ رکے۔

پھر ان کی نظریں بورڈ پر لگے سرخ دائرے پر جم گئیں۔

"تبھی وہ اپنی پہلی غلطی کرتا ہے۔"

کیف خاموش رہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔کئی ماہ کی تفتیش کے بعد پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا کہ قاتل کہیں نہ کہیں گھبراہٹ محسوس کرنا شروع کر دے گا اور وہ دن دور نہیں تھا جب وہ شخص قانون کے سامنے کھڑا ہو گا۔

کیف نے بورڈ پر لگے لیبارٹریوں کے نام دوبارہ دیکھے۔

پھر دھیرے سے بولا۔

"سر..."

"ہاں؟"

"مجھے لگتا ہے ہماری اگلی لاش ملنے سے پہلے ہمیں قاتل تک پہنچنا ہو گا۔"

مراد میر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے... یہ صرف ایک تفتیش نہیں تھی، یہ وقت کے خلاف دوڑ تھی۔

آخر کار مراد میر کے کیبن سے نکلتے ہوئے کیف نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

رات کے دس بجنے والے تھے۔ پورا دن کیس کی تفتیش میں گزر گیا تھا اور اب حقیقت پوسٹ کا دفتر تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ راہداریوں میں وہی ہلکی سی خاموشی پھیل چکی تھی جو دن بھر کی مصروفیت کے بعد دفاتر پر اترتی ہے۔ کیف نے اپنے کوٹ کا بٹن بند کیا اور مراد میر والے کمرے سے باہر نکل آیا۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کے قدم رک گئے۔ شیشے کی دیوار کے اُس پار موجود ڈیسک پر ابھی بھی روشنی جل رہی تھی۔

اور وہاں... عنادل بیٹھی ہوئی تھی۔اس کی نظریں کمپیوٹر اسکرین پر جمی تھیں جبکہ انگلیاں مسلسل کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔اس کے ارد گرد تقریباً تمام میزیں خالی پڑی تھیں۔

کیف نے حیرانی سے بھنویں سکیڑیں۔ کیونکہ اس کے مشاہدے کے مطابق عنادل وہ واحد شخص تھی جسے دفتر سے جلدی گھر جانے کی سب سے زیادہ فکر رہتی تھی۔

آج پہلی بار وہ باقی سب کے جانے کے بعد بھی وہیں موجود تھی۔ بے اختیار اس کے قدم اسی طرف بڑھ گئے۔

"آپ ابھی تک گھر نہیں گئیں؟"

عنادل چونکی، اس نے سر اٹھایا۔

"اوہ... سر۔" پھر ہلکی سی تھکن بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔

"نہیں سر، اصل میں دو دن کا کام پیچھے رہ گیا تھا، بس وہی مکمل کر رہی ہوں۔"

کیف کی نظریں کمپیوٹر اسکرین پر گئیں جہاں مختلف رپورٹس اور ڈیٹا شیٹس کھلی ہوئی تھیں۔اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ شاید وہ واقعی جتنی سنجیدہ دکھائی دیتی ہے، اتنی ہی محنتی بھی ہے۔

"ہمم..." وہ آہستگی سے بولا۔

پھر قریب پڑی ایک میز کے پاس گیا اور وہاں سے کرسی اٹھا کر سیدھا عنادل کے برابر رکھ دی۔ عنادل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کیف آرام سے بیٹھ گیا، گویا یہ دنیا کی سب سے معمولی بات ہو۔

"بتائیے، کیا کام باقی ہے؟" وہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں کچھ مدد کر دیتا ہوں۔"

عنادل نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں سر، میں کر لوں گی۔"

"دیکھیں مس عنادل..." کیف نے سنجیدگی سے کہا۔

"میرا نہیں خیال کہ اس وقت آپ کو مجھ سے بحث کرنی چاہیے۔"

"سر، میں بحث نہیں کر رہی۔" عنادل نے فوراً وضاحت دی۔

"تو پھر آپ میری مدد لینے سے انکار کر رہی ہیں؟"

کیف نے اسی سنجیدگی سے پوچھا۔

عنادل ایک لمحے کو الجھ گئی۔

"نہیں... میرا وہ مطلب نہیں تھا۔"

"اچھا ہے۔" کیف نے فوراً جواب دیا۔

"کیونکہ میرا خیال ہے آپ کو میری مدد قبول کر لینی چاہیے۔"

پھر اس نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

"ورنہ آپ کو آدھی رات تک یہیں بیٹھنا پڑے گا۔"

وہ رکا، پھر قدرے معنی خیز انداز میں بولا۔

"اور آپ جیسی اصول پسند لڑکی کو رات دیر دفتر میں بیٹھنا کہاں گوارا ہو گا۔"

عنادل چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ یہ تعریف تھی یا طنز مگر ایک بات ضرور تھی، کیف پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اب وہ ہر وقت جھڑکنے یا حکم چلانے والے باس کی طرح بات نہیں کرتا تھا۔

آخر کار اس نے خاموشی سے اپنی کرسی ذرا ایک طرف کھسکا دی۔ گویا اجازت دے دی ہو۔

کیف کے لبوں پر بمشکل ایک مسکراہٹ آئی۔

اگلے ہی لمحے دونوں کام میں مصروف ہو گئے۔ کبھی کیف کوئی رپورٹ چیک کرتا۔ کبھی کسی فائل کی غلطی پکڑتا۔

کبھی عنادل سے کوئی ڈیٹا مانگتا۔ اور کبھی عنادل اسے حیران کر دیتی کہ اسے کام کی کتنی باریکیاں یاد تھیں۔

وقت خاموشی سے گزرتا گیا۔ دفتر کی روشنیاں اب مزید مدھم محسوس ہونے لگی تھیں۔ باہر شہر کی سڑکوں پر رات مزید گہری ہو چکی تھی۔ مگر دونوں کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

جو کام چار گھنٹے مزید لے سکتا تھا وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں مکمل ہو گیا۔ آخر کار کیف نے آخری رپورٹ بند کی۔

اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"ہو گیا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

عنادل نے فوراً اپنی اسکرین دیکھی، پھر فائلوں کی طرف نظر دوڑائی اور اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر حقیقی خوشی ابھر آئی۔

"واقعی ہو گیا..." وہ بے اختیار بولی۔

اس کی آواز میں وہ خوشی تھی جو مشکل کام مکمل ہونے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ وہ کیف کی طرف مڑی۔

"تھینک یو سر۔" اس بار اس کی آواز میں رسمی پن کم اور خلوص زیادہ تھا۔

"واقعی... اگر آپ مدد نہ کرتے تو شاید مجھے کافی دیر اور رکنا پڑتا۔"

کیف چند لمحے خاموش رہا، پھر ہلکا سا مسکرایا۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"ویسے بھی کبھی کبھی باس ہونے کا کوئی فائدہ تو ہونا چاہیے۔"

عنادل کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔

شاید پہلی بار، اور یہی وہ لمحہ تھا جس نے کیف کو چند سیکنڈ کے لیے خاموش کر دیا۔

کیونکہ اسے اچانک احساس ہوا... عنادل جب دل سے مسکراتی تھی تو واقعی بہت خوبصورت لگتی تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنی نظریں دوسری طرف کر لیں۔

"چلیے، اب گھر جایئے۔" اس نے اپنی معمول کی سنجیدگی واپس لاتے ہوئے کہا۔

"اور راستے میں کوئی نیا کام ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجیے گا۔"

عنادل ہلکا سا ہنسی۔

"جی سر۔"

اور نہ جانے کیوں... اس مختصر سی ہنسی نے کیف کے پورے دن کی تھکن کم کر دی۔



کیفے کی کھڑکیوں سے دھوپ کی نرم کرنیں اندر آ رہی تھیں۔ ارد گرد لوگوں کی ہلکی پھلکی گفتگو، کافی کی خوشبو اور برتنوں کی مدھم آوازیں ماحول کو خوشگوار بنا رہی تھیں۔

زلیخہ اور اربش ایک کونے والی میز پر بیٹھی تھیں۔ زلیخہ کے سامنے کافی کا کپ رکھا تھا مگر وہ کب سے اسے ہاتھ تک نہیں لگا رہی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور نظریں میز پر جمی ہوئی تھیں۔

"اب بتاؤ بھی، آخر مسئلہ کیا ہے؟" اربش نے اس کی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

زلیخہ نے گہرا سانس لیا۔

"مجھے لگتا ہے یوسف... یسریٰ سے محبت کرتا ہے۔"

اربش نے چند لمحے اسے دیکھا، پھر آہستگی سے مسکرائی۔

"اور یہ نتیجہ تم نے صرف ایک دن میں نکال لیا؟"

"میں لڑکی ہوں اربش۔ میں کسی دوسری لڑکی کی آنکھوں میں محبت پہچان سکتی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے یسریٰ کی طرف سے ہو۔"

زلیخہ چونکی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر یسریٰ یوسف کو پسند کرتی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یوسف بھی اسے پسند کرتا ہو۔"

زلیخہ خاموش ہو گئی۔

"تم نے خود کہا تھا نا کہ یوسف ہر ایک سے عزت اور اچھے انداز میں بات کرتا ہے؟"

"ہاں..."

"تو پھر اگر وہ یسریٰ سے مسکرا کر بات کر رہا تھا تو اس میں ایسی کون سی غیر معمولی بات تھی؟"

زلیخہ جواب نہ دے سکی۔

اربش نے کافی کا گھونٹ لیا اور سنجیدگی سے بولی۔

"زلیخہ، محبت میں سب سے خطرناک چیز حقیقت نہیں، بلکہ اپنے ذہن کی بنائی ہوئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ انسان دوسروں کی ایک مسکراہٹ کو پوری داستان بنا لیتا ہے۔"

زلیخہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"مگر مجھے برا لگا تھا۔"

"وہ تو لگنا ہی تھا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم اسے پسند کرتی ہو۔" یہ سنتے ہی زلیخہ نے فوراً نظریں چرا لیں۔ اربش ہنس پڑی۔

"اچھا چھوڑو، ایک سوال کا جواب دو۔"

"کیا؟"

"اگر کل یوسف تمہیں دیکھ کر تمہاری تعریف کر دے تو؟"

زلیخہ کے چہرے پر بے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"پھر تو..."

"پھر تو ساری دنیا اچھی لگنے لگے گی؟" اربش نے شرارتی انداز میں کہا۔

زلیخہ نے جھینپتے ہوئے اسے گھورا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔"

"نہیں، میں تمہیں حقیقت بتا رہی ہوں۔"

چند لمحے دونوں خاموش رہیں، پھر اچانک زلیخہ کی آنکھوں میں چمک آئی۔

"اربش؟"

"ہاں؟"

"اگر میں کل یونیورسٹی جاؤں... اور یسریٰ سے بھی زیادہ خوبصورت لگوں تو؟"

اربش نے کپ میز پر رکھتے ہوئے ماتھا پکڑ لیا۔

"یا اللہ! میں اتنی دیر سے تمہیں سمجھا کیا رہی ہوں؟"

"سنجیدگی سے بتاؤ نا۔"

"زلیخہ!"

"بس ایک بار۔"

اربش نے بے بسی سے سر ہلایا۔

"تم واقعی نہیں سدھرو گی۔"

زلیخہ کے چہرے پر پہلی بار کھل کر مسکراہٹ آئی۔

"تو پھر طے ہوا۔"

"کیا طے ہوا؟"

"کل میں یونیورسٹی جاؤں گی... اور ایسی تیار ہو کر جاؤں گی کہ سب مجھے ہی دیکھیں۔"

"سب یا یوسف؟" اربش نے فوراً وار کیا۔

زلیخہ ایک لمحے کو رکی، پھر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"دونوں۔"

اربش زور سے ہنس پڑی جبکہ زلیخہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کئی دنوں بعد پہلی بار اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تھا اور اس وقت اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔

"کل یونیورسٹی میں یسریٰ نہیں... زلیخہ نمایاں ہو گی۔"



ریسٹورنٹ کی وسیع و عریض عمارت رات کی روشنیوں میں جگمگا رہی تھی۔ شیشے کی بلند دیواروں سے شہر کی چمکتی سڑکیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اندر نرم موسیقی مدھم لہروں کی طرح فضا میں بہہ رہی تھی جبکہ قیمتی فانوس اپنی سنہری روشنی بکھیر رہے تھے۔ ہر میز پر تازہ پھول سجے تھے اور ماحول میں ایک خاص وقار اور نفاست تھی۔

نہان اور کیف ایک نسبتاً پُرسکون گوشے میں موجود میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کھانا تقریباً ختم ہو چکا تھا۔

"براق نہیں آیا؟" کیف نے حسبِ معمول سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں، میں نے اسے نہیں بلایا۔" نہان نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں؟" کیف قدرے حیران ہوا۔

"کیونکہ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

"بتاؤ، کیا بات ہے؟"

نہان نے پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لیا۔

"ڈنر کے بعد بات کرتے ہیں۔"

کیف نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد کھانا ختم ہو گیا۔ ویٹر میز صاف کر کے جا چکا تھا۔ اب دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔

کیف نے نہان کو غور سے دیکھا۔

"اب بتاؤ، کیا بات ہے؟"

نہان کے ہاتھ بے اختیار ایک دوسرے میں الجھ گئے۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کئی سالوں سے دل میں چھپی بات آج زبان تک آئی تھی۔ آخر اس نے ہمت جمع کی۔

"کیف... میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔" وہ چند لمحے رکی، پھر دھیمی آواز میں بولی۔

"اور میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

کیف خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر نہ حیرت آئی، نہ خوشی، نہ غصہ۔ وہ ویسے ہی سنجیدہ بیٹھا رہا۔ چند لمحوں بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہان... تم میری بہت اچھی دوست ہو۔ لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔"

نہان کی پلکیں لرز گئیں۔ اس نے بمشکل اپنا چہرہ اٹھایا۔ آنکھوں میں نمی اتر چکی تھی۔

"کیا تم کسی اور کو پسند کرتے ہو؟" اس بار سوال کرتے ہوئے اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

کیف چند لمحے خاموش رہا، پھر نہایت سنجیدگی سے بولا۔

"میری زندگی میں کوئی ہے یا نہیں... یہ اصل مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں تمہیں وہ مقام نہیں دے سکتا جس کی تم حق دار ہو۔ تم میری بہترین دوستوں میں سے ایک ہو، اور میں نہیں چاہتا کہ ایک ایسا رشتہ شروع ہو جس میں میرا دل شامل نہ ہو۔ میں ہماری دوستی کی عزت کرتا ہوں، اسی لیے تمہیں جھوٹی امید نہیں دے سکتا۔"

نہان کی آنکھوں سے ایک آنسو نکل کر گال پر بہہ گیا۔

"تو میں نے ہمیشہ غلط سمجھا؟"

"نہیں۔" کیف نے فوراً جواب دیا۔
"تم نے کبھی غلط نہیں سمجھا۔ تم میرے لیے اہم ہو، لیکن ہر اہم شخص انسان کی قسمت نہیں بنتا۔"
نہان خاموش ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے دل میں برسوں سے سنبھال کر رکھی ہوئی امید آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہو۔
"تم جانتے ہو؟" وہ ہلکی سی ہنسی ہنسی، جو حقیقت میں ہنسی نہیں تھی۔
"میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ اگر کبھی ہمت کر کے تمہیں بتاؤں گی تو شاید سب کچھ بدل جائے گا۔"
کیف نے نظریں جھکا لیں۔
"کاش میں تمہیں وہ جواب دے سکتا جو تم سننا چاہتی تھیں۔"
"لیکن نہیں دے سکتے۔" نہان نے اس کی بات مکمل کی۔
کیف خاموش رہا۔ نہان نے اپنی آنکھیں صاف کیں، پرس اٹھایا اور آہستہ سے کھڑی ہو گئی۔
"فکر مت کرو، کیف۔ میں تم سے نفرت نہیں کروں گی۔"
اس نے کمزور سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"شاید کچھ وقت لگے گا... مگر میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔"
کیف بھی کھڑا ہو گیا۔
"نہان..."
لیکن نہان نے سر ہلا دیا۔
"آج نہیں۔" اس کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہو گئیں۔
"آج اگر میں مزید رکی تو شاید خود کو سنبھال نہ سکوں۔"
یہ کہہ کر وہ مڑ گئی۔
کیف خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ چمکتی روشنیوں والے اس خوبصورت ریسٹورنٹ میں پہلی بار اسے ماحول غیر معمولی حد تک خاموش محسوس ہوا۔ نہان کی دور ہوتی ہوئی پشت کو دیکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے آنکھیں بند کیں، اس کا مقصد کبھی بھی نہان کو تکلیف دینا نہیں تھا۔ لیکن بعض اوقات سچائی، جھوٹ سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عنادل اپنے اپارٹمنٹ کے صوفے پر بیٹھی تھی۔اس کے پاؤں کی موچ اب پہلے سے کافی بہتر ہو چکی تھی۔سامنے میز پر چائے کا کپ رکھا تھا جبکہ یارا اس کے برابر میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی۔یارا کے چہرے پر غیر معمولی جوش تھا، جیسے وہ کسی بڑے راز کو مزید اپنے اندر چھپا نہ پا رہی ہو۔

"مجھے تمہیں ایک بہت بڑی خبر سنانی ہے!" یارا اچانک بولی۔

"خیر تو ہے؟" عنادل نے ابرو اچکائے۔

"خیر سے بھی بڑھ کر!" یارا تقریباً اچھلتی ہوئی بولی۔

"یونیورسٹی کے پرنسپل نے آج مجھے اپنے آفس میں بلایا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ..." یارا نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا۔

"ہماری یونیورسٹی کو دارالمرجان جا کر یلماز یلدرز کا انٹرویو لینے کا موقع ملا ہے!"

"کیا؟" عنادل کا ہاتھ فضا میں ہی رک گیا۔

"اور سنو..." یارا کی مسکراہٹ مزید پھیل گئی۔

"دو طلبہ منتخب کیے گئے ہیں۔ایک تم ہو، اور دوسرا میں اپنی مرضی سے منتخب کر سکتی ہوں!"

عنادل چند لمحے خاموش رہی، پھر اس نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میں نہیں جا رہی۔"

"کیا مطلب؟" یارا کی مسکراہٹ وہیں جم گئی۔

"مطلب یہی کہ میں نہیں جا رہی۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔" عنادل نے بے پروائی سے جواب دیا۔

یارا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"پورے ترکی میں ہزاروں طلبہ ہوں گے جو اس موقع کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں اور تم انکار کر رہی ہو؟"

عنادل نے نظریں چرائیں، اس کے ذہن میں فوراً وہ سیڑھیوں والا واقعہ تازہ ہو گیا۔

اپنی ایڑیاں ہاتھ میں اٹھائے، سیڑھیوں پر لڑکھڑاتی ہوئی، پھر یلماز کا اس کے سامنے جھکنا... اس نے فوراً سر جھٹکا۔

"میں نہیں جا رہی، بس۔"

"کیوں؟"

"ویسے ہی۔"

"یہ کوئی جواب ہوا؟"

عنادل نے لمبی سانس لی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی پرنسپل نے مجھے کیوں منتخب کیا۔ یونیورسٹی میں مجھ سے بہتر اور بھی تو طلبہ ہیں۔"

"کیونکہ تم پوری یونیورسٹی کی ٹاپ اسکالرشپ اسٹوڈنٹ ہو۔" یارا فوراً بولی۔

عنادل خاموش ہو گئی۔

"اور ویسے بھی، انجینئرنگ فائنل ایئر کی سب سے نمایاں طالبہ بھی تم ہی ہو۔"

"تب بھی میں نہیں جا سکتی۔"

"اب کیا بہانہ ہے؟"

"میں پہلے ہی آفس سے دو چھٹیاں لے چکی ہوں، اب مزید چھٹی نہیں ملے گی۔"

یارا نے فوراً ہاتھ ہلایا۔

"اس کی فکر مت کرو، میں کل ہی پاپا سے بات کرتی ہوں۔"

"نہیں!" عنادل کی آواز غیر متوقع طور پر بلند ہوئی۔

"کیا ہوا؟" یارا چونک گئی۔

عنادل نے فوراً لہجہ نرم کیا۔

"میرا مطلب... مت کرنا۔ میں خود بات کر لوں گی۔"

یارا نے غور سے اسے دیکھا۔

"تم واقعی وہاں نہیں جانا چاہتیں، ہے نا؟"

عنادل نے جواب نہیں دیا اور موضوع بدلتے ہوئے وہ بولی۔

"ویسے ایک عجیب بات ہوئی ہے۔"

"کون سی؟"

"کیف سر بدل گئے ہیں۔"

"کیف منصور؟"

"ہاں۔"

"کیسے؟" یارا نے دلچسپی سے سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

عنادل چند لمحے سوچتی رہی۔

"پہلے ہر وقت غصے میں رہتے تھے۔ بات بھی ایسے کرتے تھے جیسے سامنے والا ان کا ملازم نہیں، مجرم ہو۔"

"اور اب؟"

"اب..." عنادل نے خود بھی حیرت سے سوچا۔

"اب وہ پہلے جیسے نہیں رہے۔"

پھر اس نے آفس میں ہونے والی تمام باتیں یارا کو بتا دیں۔ کس طرح کیف اس کے ساتھ بیٹھ کر کام کرتا رہا۔ کس طرح اس نے رپورٹس مکمل کروانے میں مدد دی، اور کس طرح وہ اس کی عیادت کے لیے رات کو اس کے اپارٹمنٹ تک آ گیا تھا۔

یارا خاموشی سے سب سنتی رہی، پھر اس کے چہرے پر ایک شرارتی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"مجھے لگتا ہے وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔"

"کیا؟" عنادل تقریباً کھانس گئی۔

"بالکل!"

"یارا!"

"میں سنجیدہ ہوں۔"

"اور میں نہیں ہوں۔" عنادل نے فوراً جواب دیا۔

یارا ہنس پڑی۔

"تو پھر کوئی آدمی رات کو کسی لڑکی کے گھر صرف اس کے پاؤں کی موچ پوچھنے جاتا ہے؟"

"وہ میرے باس ہیں۔"

"باس تو اور بھی لوگوں کے ہوتے ہیں۔"

"یارا!"

"اچھا ٹھیک ہے، غصہ مت کرو۔" پھر بھی اس کی آنکھوں میں شرارت باقی تھی۔

"لیکن اگر واقعی وہ تمہیں پسند کرتا ہو تو؟"

اس بار عنادل کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے چند لمحے خاموش رہ کر کھڑکی کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولی۔

"بس کرو یارا۔"

یارا بھی خاموش ہو گئی۔ عنادل کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ دھیمی تھی۔

"تم جانتی ہو نا... میں ایک بار محبت کر چکی ہوں۔"

ہوا جیسے اچانک بوجھل ہو گئی۔

"ہارون کو میں نے اپنی ساری محبت دے دی تھی۔"

اس کی نظریں کہیں دور جم گئیں۔

"شاید اتنی کہ اب میرے پاس کسی اور کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔"

یارا کے چہرے سے شرارت غائب ہو گئی۔

"عنادل..."

"میں کسی سے نفرت نہیں کرتی۔ نہ کیف سر سے، نہ کسی اور سے۔" وہ ہلکا سا مسکرائی، مگر وہ مسکراہٹ اداس تھی۔

"لیکن بعض دفعہ انسان ایک بار ٹوٹنے کے بعد دوبارہ ویسا نہیں رہتا۔"

کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ یارا نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہر کہانی ہارون پر ختم نہیں ہوتی، عنادل۔"

عنادل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر نہ جانے کیوں، اس کے ذہن میں اچانک ایک بار پھر سیڑھیوں پر کھڑا وہ سنجیدہ شخص آیا جس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے اسے ایک عجیب سی نرمی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے فوراً اس خیال کو جھٹک دیا۔

"ویسے..." یارا اچانک دوبارہ پرجوش ہوئی۔

"میں دوسرے طالب علم کے طور پر اپنا نام خود لکھوا رہی ہوں۔"

"یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔"

"اور تم بھی جا رہی ہو۔"

"نہیں۔"

"ہاں۔"

"نہیں۔"

"ہاں۔"

"یارا!"

"عنادل!"

دونوں ایک دوسرے کو گھورنے لگیں، اور اگلے ہی لمحے یارا کی ہنسی پورے کمرے میں گونج اٹھی۔



مراد دمیر کے دفتر کی دیوار پر ترکی کا بڑا نقشہ آویزاں تھا، جس پر مختلف شہروں کے گرد سرخ دائروں کے نشان لگے ہوئے تھے۔ میز پر فائلوں کے انبار، تصاویر، فرانزک رپورٹس اور لیبارٹریوں کا ریکارڈ پھیلا ہوا تھا۔

مراد دمیر اپنی کرسی پر بیٹھے ایک رپورٹ کا جائزہ لے رہے تھے، جبکہ سامنے کیف منصور کھڑا سفید بورڈ پر مختلف نام لکھ رہا تھا۔

"ترکی میں صرف سات لیبارٹریاں ایسی ہیں جہاں وہ کیمیکل تیار یا محفوظ کیا جاتا ہے۔"

کیف نے مارکر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

مراد دمیر نے سر ہلایا۔

"اوراب ہمیں ان ساتوں میں سے اصل مجرم تک پہنچنا ہے۔"

کیف خاموشی سے بورڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

سات لیبارٹریوں کے نام ایک قطار میں درج تھے۔

"میں نے تمام لیبارٹریوں کا ابتدائی ریکارڈ نکلوالیا ہے۔"

اس نے ایک فائل مراد دیمیر کے سامنے رکھ دی۔

مراد دیمیر نے فائل کھولی۔

"کچھ ملا؟"

"شاید۔" کیف مختصر سا بولا۔ یہی اس کی عادت تھی، کم بولنااور زیادہ سوچنا۔

مراد دیمیر فائل کے صفحات پلٹنے لگے۔ کیف نے میز پر ایک اور فائل رکھ دی۔

"یہ گزشتہ دو سال کا ریکارڈ ہے۔"

مراد دیمیر نے ابرو سکیڑے۔

"کس چیز کا؟"

"کیمیکل کے استعمال، منتقلی اور ضائع ہونے والے سٹاک کا۔"

مراد دیمیر کی نظریں فوراً فائل پر جم گئیں۔

"تم نے یہ سب ایک رات میں نکلوایا؟"

"نیند ویسے بھی نہیں آرہی تھی۔" کیف نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔

مراد دیمیر ہلکا سا مسکرائے، پھر ان کی نظریں ایک صفحے پر رک گئیں۔

"رکو..." انہوں نے فائل دوبارہ پڑھی۔

"یہ کیا ہے؟"

کیف فوراً ان کے قریب آیا۔ مراد دیمیر نے ایک اندراج پر انگلی رکھی۔

"تین ماہ پہلے ایک لیبارٹری نے رپورٹ درج کروائی تھی کہ ان کے سٹاک میں معمولی کمی پائی گئی تھی۔"

کیف کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

"کتنی کمی؟"

"صرف دو وائلز۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ دونوں جانتے تھے کہ یہ مقدار بہت کم تھی، اتنی کم کہ عام آڈٹ میں شاید کسی کی توجہ بھی نہ جاتی۔ مگر دو انسانوں کو مفلوج کرنے کے لیے یہی مقدار کافی تھی۔ مراد دیمیر آہستہ سے کرسی سے اٹھے۔

"کون سی لیبارٹری؟"

کیف نے فوراً صفحہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ چند لمحے بعد اس کے چہرے پر سنجیدگی مزید گہری ہو گئی۔

"نورا بایوٹیک لیبارٹری۔"

مراد دیمیر کی نظریں سکڑ گئیں۔

"کیا ان کے پاس اس کمی کی کوئی وضاحت موجود ہے؟"

"رپورٹ میں لکھا ہے کہ ممکنہ طور پر ریکارڈنگ کی غلطی تھی، اس لیے معاملہ بند کر دیا گیا۔"

"غلطی؟" مراد دیمیر طنزیہ انداز میں بولے۔

"اتنا خطرناک کیمیکل غائب ہو جائے اور وہ اسے غلطی قرار دے دیں؟"

کیف خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں مختلف امکانات گردش کرنے لگے تھے۔

"مجھے لگتا ہے کسی نے جان بوجھ کر یہ معاملہ دبا دیا تھا۔"

اس نے آخر کار کہا۔

مراد دیمیر نے سر ہلایا۔

"کل صبح سب سے پہلے اسی لیبارٹری جائیں گے۔"

کیف نے فائل بند کی۔

"اور صرف ریکارڈ نہیں دیکھیں گے۔"

"پھر؟" مراد دیمیر بولے۔

"ہر اس شخص کی فہرست چاہیے جسے اس کیمیکل تک رسائی حاصل تھی۔" کیف اسی سنجیدگی سے بولا۔

"اب بات بن رہی ہے۔" مراد دیمیر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

کیف کھڑکی کے پاس جا کر رک گیا۔ نیچے استنبول کی روشن سڑکیں دکھائی دے رہی تھیں۔

دو مقتولین...

ایک ہی قاتل...

اور اب پہلی بار ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کب سے اندھیرے میں چھپا ہوا راستہ آہستہ آہستہ روشن ہونا شروع ہو گیا ہے۔

"مراد سر..." کیف کی نظریں اب بھی شہر پر جمی تھیں۔

"میرا خیال ہے ہم قاتل کے پہلے حقیقی نشان تک پہنچ چکے ہیں۔"

مراد دیمیر نے فائل بند کی اور کمرے میں موجود خاموشی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ اصل کھیل اب شروع ہونے والا تھا۔



زلیخہ آج غیر معمولی حد تک وقت لے کر تیار ہوئی تھی۔

آئینے کے سامنے کھڑی وہ خود کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ہلکے بادامی رنگ کا لمبا کوٹ، اس کے اندر نفیس کریم رنگ کا سویٹر، نیلی جینز اور بھورے رنگ کے بوٹ اس کی شخصیت کو ایک الگ ہی وقار دے رہے تھے۔ اس نے آج پہلی بار حجاب نہیں لیا تھا۔

اس کے لمبے، گھنے اور ریشمی سیاہ بال آزادانہ انداز میں اس کی کمر تک بکھرے ہوئے تھے۔ ہلکے میک اپ نے اس کے نازک نقوش کو مزید نمایاں کر دیا تھا جبکہ آنکھوں میں لگایا گیا ہلکا سا کاجل اس کی کشش میں اضافہ کر رہا تھا۔

وہ خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔ آج اسے پورا یقین تھا کہ یوسف اسے نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

آخر کار اتنی محنت اسی کے لیے تو کی تھی۔

یونیورسٹی کا مرکزی دروازہ طلبہ سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے ہی زلیخہ اندر داخل ہوئی، بے اختیار کئی نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ کچھ لڑکے بات کرتے کرتے رک گئے، کچھ کے قدم سست پڑ گئے، کئی لڑکیاں بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا تو اس کے کھلے بال اس کے شانے سے پھسلتے ہوئے پیچھے لہرا گئے۔

زلیخہ پورے اعتماد کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی ٹھوڑی ہلکی سی بلند تھی اور قدم پُراعتماد۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ آج پوری یونیورسٹی میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں لگ رہا۔ راستے میں اسے کئی نظریں اپنے تعاقب میں محسوس ہوئیں مگر آج اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ صرف ایک شخص کی توجہ چاہتی تھی... صرف ایک۔

کلاس روم میں آکر وہ اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ جولی جب اندر آئی تو چند لمحوں تک اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

"اوہ خدایا... زلیخہ!"

زلیخہ نے مصنوعی بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"کیا ہوا؟"

"تم آج... مختلف لگ رہی ہو۔"

زلیخہ کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری۔

"بس ایسے ہی۔"

جولی نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا مگر کچھ نہ کہا۔

وقت گزرتا گیا اور پھر وہ لمحہ آگیا جس کا زلیخہ کو انتظار تھا۔ کلاس روم کا دروازہ کھلا، یوسف حسبِ معمول اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں فائل تھی اور چہرے پر وہی سنجیدہ تاثرات۔ مگر آج جیسے ہی وہ چند قدم آگے بڑھا، ایک اجنبی سی خوشبو اس کے حواس سے ٹکرائی۔ وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر اس کی نظریں کلاس پر گھومیں اور جا کر زلیخہ پر رک گئیں۔

زلیخہ اس وقت ایک ادا سے اپنے بال کندھے سے پیچھے کر رہی تھی۔

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ مگر زلیخہ کی توقعات کے برعکس...

یوسف کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی، بلکہ اس کے جبڑے کی لکیر نمایاں ہو گئی، آنکھوں میں ناگواری اتر آئی اور پھر اس نے فوراً نظریں ہٹا لیں۔

زلیخہ کی مسکراہٹ ایک لمحے کو ڈگمگائی۔

یوسف خاموشی سے جا کر ڈائس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"آج ہم اپنے پچھلے موضوع کو آگے بڑھائیں گے۔" اس نے معمول کے مطابق لیکچر شروع کر دیا۔ مگر دورانِ لیکچر ایک بات بار بار اس کی نظروں میں آ رہی تھی۔ کلاس کے کئی لڑکوں کی نظریں وقفے وقفے سے زلیخہ کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ کوئی چپکے سے اسے دیکھتا، کوئی اس کے بالوں کو، کوئی اس کے چہرے کو۔

اور یہ سب یوسف کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتدریج مزید سخت ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن اس نے خود دوبارہ ایک بار بھی زلیخہ کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا۔

دوسری طرف زلیخہ کی ساری خوشی آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگی۔ وہ بار بار سر اٹھا کر یوسف کو دیکھتی، مگر ہر بار مایوس ہوتی۔ آخر جس شخص کے لیے وہ اتنی محنت سے تیار ہوئی تھی... اس نے تو اسے دیکھنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں عجیب سی اداسی اترنے لگی۔ آخر کار لیکچر ختم ہوا۔ طلبہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگے، کلاس میں ہلکا سا شور پھیل گیا۔ یوسف نے اپنی مخصوص جیکٹ ایک بازو پر ڈالی اور دوسری ہاتھ میں فائل اٹھائی، پھر اچانک بولا۔

"مس زلیخہ۔"

پورا کلاس روم خاموش ہو گیا۔ زلیخہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

یوسف نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"مجھے میرے کیبن میں آ کر ملیں۔" لہجہ سخت تھا، چہرہ بھی معمول سے زیادہ سنجیدہ اور یہ کہہ کر وہ فوراً کلاس روم سے باہر چلا گیا۔

زلیخہ چند لمحوں تک اپنی جگہ بیٹھی رہی، پھر اس کے چہرے پر خوشی پھیلنے لگی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

شاید... شاید یوسف نے آخر کار اسے نوٹ کر لیا تھا۔ شاید وہ اس کی تعریف کرنا چاہتا تھا۔

شاید... اس کے دل میں ایک کے بعد ایک امیدیں جنم لینے لگیں۔

"او کے جولی، تم کینٹین چلی جاؤ۔" وہ جلدی سے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"میں ذرا یوسف سر سے مل کر آتی ہوں۔ شاید اسائنمنٹ کے بارے میں کچھ بات کرنی ہو۔"

جولی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"کون سی اسائنمنٹ؟"

مگر زلیخہ اس کی بات سنے بغیر ہی دروازے کی طرف بڑھ چکی تھی۔ اس کے قدموں میں عجیب سی بے صبری تھی اور دل میں ایک ہی خیال... آخر کار یوسف نے اسے اپنے کیبن میں بلایا تھا۔

زلیخہ نے یوسف کے کیبن کا دروازہ آہستہ سے دھکیلا اور اندر داخل ہوئی۔ سامنے یوسف ہمیشہ کی طرح سنجیدہ انداز میں اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں موبائل کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جو اس وقت اس کے ہاتھوں میں موجود تھا۔

"سر... کوئی کام تھا؟" زلیخہ نے ایک ادا سے اپنے بال کان کے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"جی، بیٹھیں۔" یوسف نے اسی انداز میں جواب دیا، جبکہ اس کی نظریں اب بھی اسکرین پر مرکوز تھیں۔ زلیخہ اپنی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی میز کے سامنے رکھی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی چھائی رہی، پھر یوسف بولا۔

"آپ واقعی آج پیاری لگ رہی ہیں..."

زلیخہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس کے گالوں پر ہلکی سی سرخی ابھری اور وہ اپنی شرماہٹ چھپانے کے لیے نظریں جھکا گئی۔

"یہ آپ کی سب سے بڑی خوش فہمی تھی۔" اگلے ہی لمحے یوسف نے موبائل ایک طرف رکھا اور سیدھا اس کی طرف دیکھا۔

زلیخہ کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اچانک اس کے قدموں تلے زمین کھینچ لی ہو۔ اس نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔

یوسف کی نیلی آنکھیں اس وقت غیر معمولی طور پر سخت دکھائی دے رہی تھیں۔

"میں... سمجھی نہیں۔" وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی، مگر وہ مسکراہٹ اب خوف میں بدل رہی تھی۔

یوسف نے اسے چند لمحے خاموشی سے دیکھا، پھر اس کی نگاہیں زلیخہ کے کھلے بالوں پر جا ٹھہریں۔

"آپ کا حجاب کہاں ہے؟" یوسف نے ایک ایک لفظ چبا کر دہرایا۔

زلیخہ کی آنکھیں خوف، حیرت اور الجھن سے پھیل گئیں۔

"س... سر میں..." زلیخہ کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"میں کیا؟" اس کی آواز مزید سخت ہو گئی۔

"کیا آپ کو اندازہ بھی ہے کہ آج پوری کلاس میں کیا ہو رہا تھا؟"

زلیخہ خاموش بیٹھی رہی۔ یوسف اپنی کرسی سے اٹھا اور میز کے کنارے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا آپ نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھا کہ لڑکے آپ کو کس طرح دیکھ رہے تھے؟"

"سر..."

"نہیں، پہلے میری بات سنیں۔" اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ ہمیشہ ایک باوقار، سنجیدہ اور باحیا طالبہ رہی ہیں۔ پھر آج اچانک یہ سب کیوں؟"

زلیخہ کی پلکیں لرزنے لگیں۔

"کیا یہ سب محض اتفاق تھا؟"

"میں نہیں جانتی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔" یوسف کی نیلی آنکھوں میں غصے کی چمک اب واضح تھی۔

"آپ جان بوجھ کر سب کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔"

زلیخہ کے دل میں جیسے کسی نے خنجر اتار دیا۔

"اور اگر کر رہی تھی تو؟" وہ پہلی بار ذرا اونچی آواز میں بولی۔

یوسف چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

"تو یہ آپ نہیں تھیں، زلیخہ۔"

"آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

یوسف کے چہرے پر سختی بدستور موجود تھی مگر اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے عجیب سا اضطراب ابھرا۔

"فرق پڑتا ہے کیونکہ آپ میری طالبہ ہیں۔"

"بس؟" زلیخہ ہنسی، مگر وہ ہنسی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

یوسف خاموش رہا۔

"صرف اس لیے؟"

"جی۔"

زلیخہ نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔

"آپ جانتے ہیں میں نے آج یہ سب کیوں کیا؟"

یوسف نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیونکہ میں نے سوچا تھا شاید..." اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

"شاید کیا؟"

اب زلیخہ کے ضبط کا بندھن ٹوٹ چکا تھا۔

"شاید آپ ایک بار مجھے بھی ویسے دیکھیں گے جیسے آپ یسریٰ کو دیکھتے ہیں!"

"کیا؟" یوسف کے چہرے کے تاثرات یکدم منجمد ہو گئے۔

"جی ہاں!" زلیخہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"میں نے آپ کو اس کے ساتھ ہنستے دیکھا ہے، مسکراتے دیکھا ہے، اس کی باتیں سنتے دیکھا ہے۔"

"زلیخہ—"

"اور مجھے؟" اس نے اپنے آنسو پونچھنے کی ناکام کوشش کی۔

"مجھے آپ نے ہمیشہ ڈانٹا، ٹوکا، روکا۔"

یوسف بے اختیار ایک قدم آگے بڑھا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"نہیں!" زلیخہ نے فوراً کہا۔

"میں سب سمجھتی ہوں۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"میں نے سوچا اگر میں بھی ویسی بن جاؤں... اگر میں بھی ویسی دکھوں... تو شاید آپ ایک بار مجھے دیکھ لیں گے۔"

"زلیخہ..." یوسف کے چہرے پر پہلی بار ندامت کی ہلکی سی جھلک ابھری۔

"لیکن آپ نے تو مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔"

کمرے میں چند لمحوں کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی، صرف زلیخہ کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

یوسف نے گہرا سانس لیا۔

"یسریٰ اور میرے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔"

زلیخہ نے تلخی سے ہنس دیا۔

"اب اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیگ چکے تھے۔

"تمہیں معلوم ہے یوسف...؟"

یوسف خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم بہت برے ہو۔" اس کی آواز بمشکل سنائی دی۔

"میں نے کبھی کسی سے نفرت نہیں کی..."

وہ ایک لمحے کو رکی۔

پھر آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولی،

"لیکن اس وقت... میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔"

".I hate you"

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"زلیخہ!" یوسف کی آواز اس کے پیچھے ابھری۔

مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور وہ روتی ہوئی کیبن سے باہر نکل گئی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز کمرے میں گونجتی رہ گئی۔

یوسف وہیں ساکت کھڑا رہا۔ اس کی نظریں اسی دروازے پر جمی تھیں جہاں سے زلیخہ ابھی ابھی گئی تھی۔

کافی دیر تک، اتنی دیر کہ جیسے وقت رک گیا ہو۔ پھر اچانک اس کی نظر میز کے سامنے والی کرسی پر پڑی۔ وہیں ایک بھورا سا پرس رکھا تھا... زلیخہ کا پرس۔ یوسف نے چند لمحے اسے دیکھا، پھر آہستہ سے آگے بڑھا، پرس اٹھایا اور اپنی میز پر رکھ دیا۔ اس کی نظریں ایک بار پھر دروازے کی طرف اٹھ گئیں اور پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ شاید آج اس نے اپنی بات سمجھانے کے بجائے کسی کا دل توڑ دیا تھا۔



صبح کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ استنبول کے صنعتی علاقے میں واقع "نورا بایو ٹیک لیبارٹری" کی شیشے سے بنی بلند و بالا عمارت سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ داخلی دروازے پر سخت سیکیورٹی موجود تھی جبکہ اندر داخل ہونے والے ہر شخص کا اندراج کیا جا رہا تھا۔

کالی گاڑی لیبارٹری کے سامنے آ کر رکی۔ اگلے ہی لمحے کیف منصور اور مراد میر گاڑی سے اترے۔ دونوں کے چہروں پر وہی سنجیدگی طاری تھی جو کسی نئے سراغ کے ملنے کے بعد آ جاتی ہے۔ کل رات تک وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مقتولین کے جسم میں داخل کیا گیا نایاب کیمیکل ترکی کی صرف چند مخصوص لیبارٹریوں میں تیار ہوتا تھا۔

اور ان سات لیبارٹریوں میں سے ایک نورا بایو ٹیک بھی تھی۔

ان کے ہاتھ میں موجود رپورٹ کے مطابق تقریباً چھ ماہ قبل اس لیبارٹری کے اسٹاک سے اس کیمیکل کی انتہائی معمولی مقدار غائب ہوئی تھی، اتنی معمولی کہ عام حالات میں کوئی اسے نظر انداز کر دیتا۔ مگر کیف نہیں۔ اسی ایک نکتے نے انہیں آج یہاں پہنچا دیا تھا۔

"مجھے اب بھی لگتا ہے یہ کوئی اتفاق نہیں۔" کیف چلتے ہوئے بولا۔ مراد میر نے سر ہلایا۔

"اتنی خطرناک چیز کی ایک ملی گرام مقدار بھی غائب ہو جائے تو اسے اتفاق نہیں کہتے۔"

دونوں اندر داخل ہوئے۔ ریسپشن پر موجود خاتون نے فوراً کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔

"جی سر؟"

مراد میر نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔

"پولیس انویسٹیگیشن۔ ہمیں آپ کے اسٹاک ریکارڈز اور لیبارٹری آڈٹ رپورٹس دیکھنی ہیں۔"

خاتون کا رنگ ہلکا سا اڑ گیا۔

"جی سر، میں فوراً انتظام کرتی ہوں۔"

چند منٹ بعد انہیں عمارت کے اندرونی حصے میں لے جایا گیا۔ شیشے کی دیواروں کے پیچھے سفید کوٹ پہنے سائنس دان مختلف تجربات میں مصروف تھے۔ جدید مشینوں کی مدھم آواز پورے ماحول میں گونج رہی تھی۔ کیف کی نظریں ہر چیز کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل نوٹ کرتا تھا۔ انہیں ایک کانفرنس روم میں بٹھایا گیا جہاں چند ہی لمحوں بعد لیبارٹری کا سکیورٹی چیف اور اسٹاک سپر وائزر بھی آ گئے۔ مراد نے سیدھا سوال کیا۔

"چھ ماہ پہلے اسٹاک میں کمی کیوں آئی تھی؟"

اسٹاک سپروائزر نے فوراً فائل کھولی۔

"سر، ہم نے اس کی مکمل تحقیقات کی تھیں۔"

"نتیجہ؟"

"کچھ نہیں ملا۔"

مراد دیمیر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"کچھ نہیں ملا؟"

"جی سر۔"

کیف خاموشی سے فائل کے صفحات پلٹ رہا تھا۔اچانک اس کی نظریں ایک مخصوص اندراج پر رک گئیں۔اس نے صفحہ اپنی جانب کھینچا۔

"یہ کیا ہے؟"اس نے ایک تاریخ پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔

سپروائزر نے ریکارڈ دیکھا۔

"اوہ...اس دن رات کے وقت سسٹم تقریباً اٹھارہ منٹ کے لیے آف لائن ہو گیا تھا۔"

"کیوں؟"مراد دیمیر فوراً متوجہ ہوئے۔

"سر، سرور اپڈیٹ ہو رہا تھا۔"کیف کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"اور اسی رات اسٹاک کی کمی نوٹ کی گئی؟"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

سپروائزر نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"جی..."

مراد اور کیف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ محض اتفاق نہیں لگ رہا تھا۔اسی دوران کانفرنس روم کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون اندر داخل ہوئیں۔

سفید لیب کوٹ، منظم انداز، پراعتماد چال اور چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی۔

"معذرت، مجھے آنے میں تاخیر ہو گئی۔" انہوں نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"آپ؟" مراد دمیر کھڑے ہوئے۔

"یسریٰ کایا۔" وہ پرسکون لہجے میں بولی۔

"میں نورا بایوٹیک کی آپریشنز منیجر ہوں۔"

یسریٰ نے کرسی سنبھالی۔

"مجھے بتایا گیا ہے آپ اس گمشدہ کیمیکل کے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔"

"جی..." مراد دمیر نے جواب دیا۔

"اور ہمیں امید ہے آپ ہماری مدد کریں گی۔"

یسریٰ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جتنا میرے علم میں ہے، ضرور۔"

کیف نے فوراً سوال کیا۔

"اس مخصوص کیمیکل تک رسائی کتنے لوگوں کی تھی؟"

یسریٰ چند لمحے سوچتی رہی۔

"مکمل رسائی صرف سات افراد کے پاس تھی۔"

"نام؟"

"میرے پاس موجود ہیں۔" اس نے فوراً فائل کھولی۔

کیف نے فہرست ہاتھ میں لی۔ اس کی نظریں ایک ایک نام پر پھسلتی چلی گئیں۔



عنادل اپنے ڈیسک پر بیٹھی بے چینی سے انگلیاں میز پر بجا رہی تھی۔ سامنے یارا کھڑی تھی، جس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح شرارتی مسکراہٹ موجود تھی۔

"میں آخری بار پوچھ رہی ہوں، تم جارہی ہو، یا میں جاؤں؟" یارا بولی۔

"اور اگر پکڑی گئی تو؟" عنادل نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔

"تو کہہ دینا سارا پلان میرا تھا۔" یارا نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

"جو حقیقت بھی ہے۔" عنادل بڑبڑائی۔

یارا ہنس پڑی۔

"دیکھو، ایسا موقع بار بار نہیں آتا۔ دارالمرجان میں جا کر یلماز یلدرز کا انٹرویو لینے کا موقع ملا ہے۔ اگر تم نے یہ ضائع کیا تو بعد میں خود پچھتاؤ گی۔"

"مجھے نہیں لگتا میں پچھتاؤں گی۔" عنادل فوراً بولی۔ اس کے ذہن میں فوراً وہ سیڑھیوں والا واقعہ تازہ ہو گیا۔ اپنی زندگی کی شاید سب سے شرمندہ کن ملاقات۔ وہ آج بھی یاد آتی تو دل عجیب سا ہونے لگتا تھا۔

"تم بس بہانے بنا رہی ہو۔" یارا نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا؟" یارا نے مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔

"تو پھر تمہارا چہرہ اس وقت سرخ کیوں ہو جاتا ہے جب میں یلماز کا نام لیتی ہوں؟"

"یارا!" عنادل فوراً جھنجھلا گئی۔ اسی لمحے یارا نے اس کے ہاتھ میں ایک درخواست تھما دی۔

"لو، اب جاؤ اور مراد سر سے دو دن کی چھٹی مانگو۔"

"میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"تو مت بولو۔" یارا نے فوراً جواب دیا۔

"بس یہ کہہ دو گھر میں ضروری کام ہے۔"

"یہ بھی تو جھوٹ ہے۔"

"اچھا پھر کہہ دو ذاتی مصروفیت ہے۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔"

"تم واقعی بہت مشکل لڑکی ہو۔" یارا نے ماتھا پکڑ لیا۔

چند لمحوں بعد نہ چاہتے ہوئے بھی عنادل اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے قدم مراد دمیر کے کیبن کی طرف بڑھ گئے۔ دروازے پر دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی۔ مراد دمیر اپنے کام میں مصروف تھے، جبکہ سامنے کیف بھی بیٹھا ہوا تھا۔ شاید دونوں کیس سے متعلق کسی اہم نکتے پر گفتگو کر رہے تھے۔

عنادل کو دیکھ کر مراد دیمیر نے عینک اتاری۔

"جی عنادل؟"

"سر... مجھے دو دن کی چھٹی چاہیے تھی۔"

مراد دیمیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"دو دن؟"

"جی سر۔"

"سب خیریت ہے؟"

عنادل کا دل زور سے دھڑکا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس سے وہ بچنا چاہتی تھی۔

"جی... اصل میں گھر میں ایک ضروری کام ہے۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

مراد نے چند لمحے اسے دیکھا، پھر سر ہلا دیا۔

"اوکے۔"

عنادل نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی نظر کیف پر پڑی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہی گہری، سنجیدہ نظریں۔ ایک لمحے کے لیے عنادل کو لگا جیسے اس نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا ہو، اور حقیقت بھی یہی تھی۔ کیف جانتا تھا... اسے بخوبی اندازہ تھا کہ عنادل کوئی نہ کوئی بات چھپا رہی ہے۔

"اوکے سر، شکریہ۔" عنادل جلدی سے بولی اور کیبن سے نکل گئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ مراد دمیر دوبارہ فائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"عجیب بات ہے، عنادل نے ابھی پچھلے ہفتے ہی چھٹی لی تھی۔" وہ سرسری انداز میں بولے۔

کیف کرسی سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی نگاہ چند لمحے دروازے پر جمی رہی۔

"ہمم۔" بس اتنا ہی بولا۔

مراد دیمیر نے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" کیف نے بے نیازی سے جواب دیا۔ مگر وہ جانتا تھا، عنادل نے جھوٹ بولا ہے اور شاید پہلی بار اس نے اس جھوٹ کو نظرانداز کیا تھا۔ مراد دیمیر دوبارہ کام میں مصروف ہو گئے۔ جبکہ کیف کی نگاہ غیر ارادی طور پر شیشے کی دیوار کے پار عنادل کے ڈیسک پر جا ٹھہری۔ باہر یارا خوشی سے عنادل کو گلے لگا رہی تھی اور عنادل اسے ناراضی سے گھور رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر کیف کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"تو آخرکار تم نے جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا..." وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا، مگر نہ جانے کیوں اس بار اسے اس بات پر غصہ نہیں آیا تھا۔



کلاس روم میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ یوسف ڈیجیٹل اسکرین کے سامنے کھڑا لیکچر دے رہا تھا جبکہ تمام طلبہ پوری توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔

"اگر کسی ریسرچ میں نتائج بار بار تبدیل ہو رہے ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تھیوری غلط ہے، بلکہ بعض اوقات مسئلہ طریقۂ کار میں ہوتا ہے..." وہ سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

مگر آج اس کی توجہ مکمل طور پر لیکچر پر نہیں تھی۔ کل کے واقعے کے بعد زلیخہ آج یونیورسٹی میں نظر نہیں آئی تھی۔ اگرچہ اس نے خود کو بارہا سمجھایا تھا کہ اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ صبح سے اس کی نگاہیں لاشعوری طور پر کئی بار کلاس کے دروازے کی طرف اٹھ چکی تھیں۔ پچھلی قطار میں موجود وہ مخصوص نشست آج خالی تھی اور نہ جانے کیوں وہ خالی نشست بار بار اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔

"سر، کیا یہ فارمولا امتحان میں آ سکتا ہے؟" ایک طالب علم کے سوال پر وہ حال میں لوٹا۔

"جی ہاں، اور خاص طور پر اس کا عملی استعمال۔" وہ مختصر جواب دے کر دوبارہ لیکچر جاری رکھنے لگا۔

اسی دوران اس کی جیب میں رکھا موبائل ہلکا سا وائبریٹ ہوا۔

عام طور پر وہ لیکچر کے دوران موبائل نہیں دیکھتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اس بار اس نے اسے نکال لیا۔ اسکرین پر نمودار ہونے والا نام دیکھ کر اس کے ماتھے پر ہلکی سی شکن ابھری۔

یسریٰ۔ اس نے پیغام کھولا۔

"یوسف، آج ہی مجھے ہماری مخصوص جگہ پر رات آٹھ بجے ملو۔ نہایت ضروری بات ہے۔"

یوسف کی نیلی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے سنجیدگی مزید گہری ہو گئی۔ وہ چند ثانیے پیغام کو دیکھتا رہا۔ یسریٰ ایسی شخصیت نہیں تھی جو بلاوجہ "نہایت ضروری" جیسے الفاظ استعمال کرے۔ اس کا مطلب تھا کہ واقعی کوئی اہم بات تھی۔

شاید لیبارٹری سے متعلق، یا شاید... اس نے سوچ کو ادھورا چھوڑ دیا۔ اگلے ہی لمحے موبائل لاک کر کے دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ مگر اب اس کے ذہن میں کئی سوال گردش کرنے لگے تھے۔

"سر؟" سامنے بیٹھے ایک طالب علم کی آواز پر وہ چونکا۔

"جی؟"

"آپ کچھ سوچ رہے تھے؟" یوسف نے خود کو سنبھالا۔

"نہیں۔" پھر وہ معمول کے مطابق لیکچر دینے لگا۔

مگر کلاس ختم ہونے تک اس کے ذہن میں یسریٰ کا پیغام بار بار گونجتا رہا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ یونیورسٹی کی عمارتیں سنہری روشنی میں نہا رہی تھیں۔ یوسف اپنی فائلیں سمیٹ رہا تھا۔ اس کی نگاہ ایک لمحے کو پھر اسی خالی نشست پر جا ٹھہری جہاں کل زلیخہ بیٹھی تھی۔ کل وہ روتی ہوئی اس کے کیبن سے نکلی تھی، اور آج پورا دن یونیورسٹی نہیں آئی۔ یوسف نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا، پھر فوراً نظریں ہٹا لیں۔ یہ سوچنا اس کا کام نہیں تھا۔ وہ اپنی جیکٹ بازو پر ڈال کر کیبن سے باہر نکل آیا۔ رات کے آٹھ بجنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

اور اسے اس "مخصوص جگہ" پر جانا تھا جہاں یسریٰ اس کا انتظار کر رہی تھی۔



اگلی صبح یونیورسٹی کے مرکزی دروازے کے سامنے غیر معمولی ہلچل تھی۔ طلبہ حسبِ معمول اپنی اپنی کلاسوں کی جانب جا رہے تھے کہ اچانک ایک لمبی، سیاہ رنگ کی انتہائی مہنگی لیموزین یونیورسٹی کے داخلی راستے پر آکر رکی۔ اس کے آگے اور پیچھے جدید سیاہ گاڑیاں چل رہی تھیں جن میں یلماز یلدرز کے مسلح محافظ موجود تھے۔ یونیورسٹی کے اکثر طلبہ حیرت سے اس قافلے کو دیکھنے لگے۔

"یہ کس کے لیے آیا ہے؟"

"شاید کوئی وزیر آیا ہے۔"

"نہیں، سنا ہے یلماز یلدرز نے کسی کو بلایا ہے۔"

سرگوشیاں ہر طرف پھیلنے لگیں۔ اسی دوران یارا اور عنادل

یونیورسٹی کی عمارت سے باہر نکلیں۔ یارا کے چہرے پر جوش صاف نمایاں تھا۔ آج اس نے ہلکے آسمانی رنگ کا خوبصورت لمبا لباس پہن رکھا تھا جس پر نفیس چاندی کی کڑھائی تھی۔ اس کا سفید دوپٹہ نہایت سلیقے سے کندھوں پر جما ہوا تھا جبکہ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک تھی جس میں اس نے انٹرویو کے تمام سوالات لکھ رکھے تھے۔ وہ ہر چند منٹ بعد نوٹ بک کھولتی اور سوال دوبارہ پڑھنے لگتی۔

"پہلا سوال... آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟"

"نہیں نہیں، یہ بہت عام سوال ہے..." وہ خود ہی بڑبڑاتے ہوئے دوسرا سوال پڑھنے لگی۔

اس کے برعکس عنادل مکمل خاموش تھی۔ آج اس نے گہرے زمردی سبز رنگ کا سادہ مگر بے حد نفیس لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے لباس میں کوئی غیر ضروری چمک دمک نہیں تھی، مگر اس کی سادگی ہی اسے نمایاں بنا رہی تھی۔ سر پر ہلکے رنگ کا دوپٹہ تھا جو نہایت سلیقے سے اوڑھا گیا تھا۔

اس کی سبز مائل عنابی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح سنجیدگی تھی۔ وہ بار بار لیموزین کو دیکھ رہی تھی مگر اس کی بے چینی کی وجہ یارا سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی منظر بار بار تازہ ہو رہا تھا۔

سیڑھیاں...

مڑا ہوا پاؤں...

اور پھر...

وہ شخص۔

یلماز یلدرز۔

اسے آج بھی یاد تھا جب اس نے شرمندگی کے عالم میں اپنے ہاتھوں میں ہیلز اٹھا رکھی تھیں اور پھر کیسے اس کی ملاقات ترکی کی سب سے مشہور شخصیت سے ہو گئی تھی۔

"یااللہ..." وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

"بس آج کوئی نئی شرمندگی نہ ہو۔"

"تم نے کچھ کہا؟"

یارا فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"نہیں۔" عنادل نے مختصر جواب دیا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" یارا پُرجوش انداز میں بولی۔

"آج میں کم از کم پندرہ سوال پوچھوں گی۔"

"تم بیس بھی پوچھ لینا۔" عنادل نے بے دلی سے جواب دیا۔

"مجھے صرف انٹرویو مکمل کرنا ہے اور واپس آجانا ہے۔"

یارا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم واقعی یلماز یلدرز سے ملنے پر خوش نہیں ہو؟"

"بالکل نہیں۔"

"جھوٹی۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔"

"اچھا؟" یارا ہنس پڑی۔

"پھر تم صبح سے اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

عنادل نے فوراً نظریں چرا لیں۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسی دوران لیموزین کے قریب کھڑا ایک محافظ ان دونوں کی جانب بڑھا۔

"مس عنادل نور؟"

"جی۔"

"اور مس یارا؟"

"جی، میں یارا ہوں۔" یارا فوراً بولی۔

"سر آپ واقعی ہمیں دارالمرجان لے جا رہے ہیں؟"

محافظ نے ہلکی سی مسکراہٹ دبالی۔

"جی۔"

یارا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ چند لمحوں بعد دونوں لیموزین کے اندر موجود تھیں۔ اندر کا منظر کسی شاہی سواری سے کم نہیں تھا۔ نرم چرمی نشستیں، شیشے کی نفیس سجاوٹ، سنہری باریک نقش و نگار اور مکمل سکون۔

یارا بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتی اور پھر اپنے سوالات دہرانے لگتی۔

"اگر وہ مسکرا کر جواب دے تو؟"

"اگر وہ میرے سوال کی تعریف کر دے تو؟"

"اگر وہ..."

"یارا..." عنادل نے آخر کار اسے ٹوکا۔

"سانس لے لو۔"

یارا ہنس پڑی۔

"تم نہیں سمجھو گی۔ میں برسوں سے ان کا انٹرویو لینے کا خواب دیکھ رہی تھی۔"

عنادل نے کھڑکی کے باہر نظریں جما لیں۔ گاڑی تیزی سے شہر کی شاہراہوں پر آگے بڑھ رہی تھی۔ مگر اس کے ذہن میں صرف ایک سوال گردش کر رہا تھا۔

کیا یلماز یلدرز کو ان کی پچھلی ملاقات یاد ہو گی؟

اور اگر یاد ہوئی... تو کیا وہ اسے دیکھتے ہی پہچان لے گا؟

یہ سوچتے ہی اس کے دل کی دھڑکن ایک بار پھر بے ترتیب ہو گئی، جبکہ لیموزین دارالمرجان کی جانب تیزی سے سفر کر رہی تھی۔

لیموزین شہر کی مصروف شاہراہوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ بلند عمارتیں کم ہوتی گئیں اور ان کی جگہ سرسبز مناظر نے لے لی۔ چوڑی سڑکوں کے دونوں جانب قطار در قطار درخت کھڑے تھے، جن کے گھنے سائے زمین پر خوبصورت نقش بنا رہے تھے۔ یارا تقریباً پوری طرح کھڑکی کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بچوں جیسا جوش تھا۔

"عنادل... ادھر دیکھو!" اس نے اچانک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

عنادل نے بے دلی سے باہر دیکھا۔ دور تک پھیلی سبز وادیوں کے درمیان ایک شفاف جھیل سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس کے کناروں پر سفید ہنس تیر رہے تھے۔

"واہ..." عنادل کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

یارا فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔

"میں نہ کہتی تھی تم حیران رہ جاؤ گی۔"

لیموزین مزید آگے بڑھی، اور پھر اچانک ان کے سامنے ایک عظیم الشان سنگی دروازہ نمودار ہوا۔ اس دروازے پر سنہری حروف میں لکھا تھا۔

"دارالمرجان"

دروازے کے دونوں اطراف اونچے ستون کھڑے تھے جن پر نفیس نقش و نگار تراشے گئے تھے۔ مسلح محافظ نہایت چوکسی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ جیسے ہی قافلہ قریب پہنچا، بڑے آہنی دروازے خاموشی سے کھل گئے، اور لیموزین دارالمرجان کی حدود میں داخل ہو گئی۔

عنادل اور یارا دونوں بے اختیار سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں داخل ہو گئی ہوں۔ اندر کی دنیا باہر سے بالکل مختلف تھی۔

کشادہ سڑکیں، دونوں جانب نایاب پھولوں کے باغات، دور دور تک پھیلی سبز گھاس، سنگِ مرمر کے فوارے اور ہر طرف بے مثال ترتیب۔ جگہ جگہ سفید اور سنہری مجسمے نصب تھے۔ دور کہیں گھوڑوں کے دوڑنے کی مدھم آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"یااللہ..." یارا نے سرگوشی کی۔

"یہ جگہ تو حقیقت سے زیادہ خواب لگ رہی ہے۔"

اس کی نظریں مسلسل اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔

"عنادل! وہ دیکھو!" اس نے پھر کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

اس بار ایک وسیع اصطبل دکھائی دیا۔ خوبصورت عربی نسل کے گھوڑے کھلے میدان میں دوڑ رہے تھے۔ کچھ ملازمین ان کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔

"اور وہ دیکھو..." یارا اب تقریباً ہر چیز پر انگلی رکھ کر عنادل کو دکھا رہی تھی۔

"وہ باغ..."

"وہ جھیل..."

"وہ فوارہ..."

مگر عنادل کی توجہ کہیں اور تھی۔ اس کی نگاہیں بار بار دور افق کی جانب جا رہی تھیں۔ جہاں اب دارالمرجان کا مرکزی محل واضح ہونا شروع ہو گیا تھا، اور پھر...

اگلے ہی لمحے وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھا۔ عنادل چند لمحوں کے لیے سانس لینا بھول گئی۔ یارا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یااللہ..." اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

دارالمرجان کسی عام محل کی طرح نہیں تھا۔ وہ سنگِ مرمر، شیشے اور نفیس فنِ تعمیر کا ایسا شاہکار تھا جسے دیکھ کر انسان کی نظریں وہیں رک جاتیں۔ بلند گنبد سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وسیع و عریض بالکونیاں، آسمان کو چھوتے ستون، اور سامنے پھیلا ہوا عظیم الشان صحن اسے کسی سلطنت کے شاہی محل جیسا بنا رہا تھا۔ مرکزی عمارت کے سامنے کئی فوارے چل رہے تھے جن کے پانی میں سورج کی کرنیں قوسِ قزح کے رنگ بکھیر رہی تھیں۔

"یہ... یہ واقعی کسی انسان کا گھر ہے؟" یارا نے حیرت سے پوچھا۔
"یا کوئی تاریخی محل؟"
عنادل نے جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں اسی عمارت پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے اچانک یاد آیا... یہی وہ جگہ تھی جہاں وہ شخص رہتا تھا۔ وہ شخص جس کا نام پورے ترکی میں عزت اور اثر و رسوخ کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور نہ جانے کیوں اس خیال کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہونے لگی۔ لیموزین اب آہستہ آہستہ مرکزی عمارت کی جانب بڑھ رہی تھی۔ یارا کی خوشی بڑھتی جا رہی تھی۔ جبکہ عنادل کے دل میں ایک انجانی سی بے چینی جنم لے رہی تھی۔ کیونکہ چند ہی لمحوں بعد... اس کی دوبارہ ملاقات یلماز یلدرز سے ہونے والی تھی۔
لیموزین کے رکتے ہی دو محافظ فوراً آگے بڑھے اور نہایت احترام سے دروازہ کھول دیا۔ اندر سے پہلے یارا اتری، پھر اس کے پیچھے عنادل۔ جونہی دونوں نے قدم باہر رکھا، چند لمحوں کے لیے جیسے ان کی سانسیں تھم گئیں۔
دارالمرجان حقیقت سے زیادہ کسی خواب کی تعبیر معلوم ہوتا تھا۔ سفید سنگِ مرمر سے بنی عظیم الشان عمارت سورج کی روشنی میں یوں چمک رہی تھی جیسے کسی داستانی سلطنت کا محل ہو۔ بلند ستون، نفیس محرابیں، دور تک پھیلے سرسبز باغات، سنگی راستوں کے کنارے لگے رنگ برنگے پھول اور درمیان میں بہتے شفاف فوارے... ہر چیز اپنی مثال آپ تھی۔ فضا میں ہلکی سی خوشبو گھلی ہوئی تھی اور ہر طرف ایک عجیب سا وقار اور سکون محسوس ہوتا تھا۔
"یااللہ..." یارا نے بے اختیار سرگوشی کی۔ اس کی نظریں ایک جگہ ٹھہرنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔
"یہ جگہ حقیقت میں اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے جتنی تصویروں میں لگتی تھی۔"
عنادل نے خاموشی سے سر ہلایا۔ اگرچہ وہ اپنی حیرت چھپانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی ہیزل گرین آنکھوں میں جھلملاتی چمک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ اسی دوران ایک نوجوان ملازمہ ان کی طرف بڑھی۔ اس کے ہاتھوں میں چاندی کی نہایت نفیس اور بڑی سی پلیٹ تھی جس میں تازہ سرخ گلابوں کے گجرے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ قریب آئی، دونوں لڑکیوں کے حواس سے تازہ گلابوں کی مہک ٹکرائی۔ وہ خوشبو ایسی تھی کہ چند لمحوں کے لیے انسان سب کچھ بھول جاتا۔
"یہ خاص طور پر آپ دونوں کے لیے تیار کروائے گئے ہیں۔"
ملازمہ نے مسکراتے ہوئے پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔
یارا کی آنکھیں خوشی سے پھیل گئیں۔

"واہ... کتنے خوبصورت ہیں!" وہ بے اختیار بولی۔

مگر عنادل کے چہرے پر ابھرنے والی مسکراہٹ کہیں زیادہ گہری تھی۔ بچپن سے ہی اسے تازہ پھولوں، خصوصاً سرخ گلابوں کے گجروں سے عجیب سی محبت تھی۔ اس نے نرمی سے ایک گجرا اٹھایا۔ گلاب کی مہک اس کے دل تک اتر گئی۔

چند لمحوں کے لیے وہ واقعی مسکرا اٹھی۔ ایسی بے ساختہ مسکراہٹ جو بہت کم لوگوں نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی۔ یارا نے فوراً اسے دیکھا اور شرارتی انداز میں کہنے لگی۔

"دیکھا؟ میں جانتی تھی تمہیں یہ پسند آئیں گے۔"

عنادل نے جواب میں بس ہلکی سی مسکراہٹ دی۔ پھر دونوں نے اپنے ہاتھوں میں سرخ گلابوں کے وہ خوبصورت گجرے پہن لیے۔ اسی وقت ان کے سامنے کھڑا پینتیس سالہ سنجیدہ شخص ایک قدم آگے بڑھا۔

"میرا نام صفدر ہے۔" اس نے نہایت ادب سے کہا۔

"میں یلماز سر کا ذاتی معاون ہوں۔"

دونوں لڑکیوں نے احتراماً سر ہلایا۔

"دار المرجان میں آپ دونوں کو خوش آمدید۔" صفدر کی آواز میں پیشہ ورانہ شائستگی تھی۔

"سر نے آپ دونوں کی میزبانی کے لیے خصوصی ہدایات دی ہیں۔"

یارا کی آنکھیں فوراً چمک اٹھیں۔

"کیا ہم ابھی یلماز یلدرز سے ملیں گے؟"

صفدر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"جلد ہی۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن اس سے پہلے آپ دونوں سفر کی تھکن اتاریں گی، پھر دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہوگا۔"

وہ ایک لمحہ رکا پھر بولا۔

"اس کے بعد سر خود آپ دونوں سے آکر ملیں گے۔"

یارا نے بے اختیار ایک دوسرے ہاتھ سے اپنا گجرا تھام لیا۔

"سچ؟"

صفدر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی۔ پھر دارالمرجان کا مکمل دورہ کروایا جائے گا تاکہ آپ یہاں کے مختلف حصے دیکھ سکیں۔"

اب یارا کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی، جبکہ عنادل خاموش کھڑی تھی۔ اس کے دل میں البتہ ایک عجیب سی بے چینی جاگ رہی تھی۔ اسے ابھی تک وہ پہلی ملاقات یاد تھی...

سیڑھیوں پر مڑا ہوا پاؤں... اور وہ گہری سرمئی آنکھوں والا شخص... اس نے فوراً اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

"اور آخر میں..." صفدر نے اپنی بات مکمل کی۔

"آپ دونوں کو سر کا تفصیلی انٹرویو لینے کا موقع دیا جائے گا۔ جتنا وقت درکار ہوگا، آپ کو دیا جائے گا۔"

یارا نے خوشی سے تقریباً اچھلتے ہوئے عنادل کا بازو پکڑ لیا۔

"میں نے کہا تھا نا! یہ میری زندگی کا سب سے بہترین دن ہونے والا ہے!"

عنادل نے اس کی طرف دیکھا، پھر دارالمرجان کی عظیم الشان عمارت کی جانب نظر اٹھائی۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا احساس جاگا۔ ایسا احساس جیسے قسمت اسے ایک بار پھر کسی ایسے موڑ کی طرف لے جا رہی ہو جہاں سے واپسی پہلے جیسی نہیں ہوگی۔

اور شاید... وہ احساس غلط بھی نہیں تھا۔

پھر ان دونوں لڑکیوں کو ایک وسیع و عریض ہال میں لے جایا گیا، اور ہال میں قدم رکھتے ہی دونوں بے اختیار چند لمحوں کے لیے رک گئیں۔

ہال کی شان و شوکت کسی شاہی محل سے کم نہ تھی۔ اونچی چھتوں سے لٹکتے عظیم الشان کرسٹل فانوس سنہری روشنی بکھیر رہے تھے۔ دیواروں پر نفیس نقش و نگار کندہ تھے جبکہ درمیان درمیان میں آویزاں قیمتی پینٹنگز ہال کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ فرش پر بچھا نرم ایرانی قالین قدموں کی آہٹ تک جذب کر لیتا تھا۔

ہال کے عین وسط میں ایک طویل اور نہایت شاندار ڈائننگ ٹیبل سجا ہوا تھا۔ سفید سنگِ مرمر سے بنی اس میز پر چاندی اور سونے کے کناروں والے برتن ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ تازہ سرخ گلابوں کے گلدستے میز کی زینت بنے ہوئے تھے اور فضا میں ہلکی سی گلاب اور عود کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

یارا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یااللہ...!"اس نے بے اختیار سرگوشی کی۔

"یہ لوگ کھانا کھاتے ہیں یا دعوتِ سلطنت کرتے ہیں؟"

عنادل نے خاموشی سے گردونواح کا جائزہ لیا مگر اس کے چہرے پر بھی حیرت واضح تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر کھانوں کی ایک طویل قطار سجی ہوئی تھی۔

مختلف اقسام کے کباب، نرم و ملائم ترک روٹیاں، خوشبودار بریانی، زعفرانی چاول، گرلڈ مچھلی، روسٹ لیمب، مختلف سلاد، پنیر کی کئی اقسام، زیتون، خشک میوہ جات، پھلوں سے بھرے بڑے بڑے تھال اور درجنوں اقسام کی مٹھائیاں میز پر سجی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی شاہی ضیافت کا اہتمام کیا گیا ہو۔

"یہ سب...ہمارے لیے ہے؟" یارا نے حیرت سے پوچھا۔

"جی، مس یارا۔"صفدر مؤدبانہ انداز میں بولا۔

"آپ دونوں مہمانِ خصوصی ہیں۔"

یارا نے فوراً عنادل کی طرف دیکھا۔

"میں اگر یہاں ایک ہفتہ بھی رہوں تو بھی اتنا کھانا ختم نہیں کر سکتی۔"

عنادل کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ کئی ملازمین انتہائی احترام سے ان کے قریب موجود تھے اور وقتاً فوقتاً مختلف ڈشز پیش کر رہے تھے۔ مگر اس تمام تنوع اور شان و شوکت کے باوجود دونوں لڑکیوں نے صرف چند منتخب ڈشز میں سے چند لقمے ہی لیے۔ یارا نے ایک کباب چکھا اور فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ تو خطرناک حد تک مزیدار ہے۔"

عنادل نے اسے گھورا۔

"کھانا کھاؤ، ڈرامہ مت کرو۔"

"میں ڈرامہ نہیں کر رہی، میں اس کباب سے محبت کا اظہار کر رہی ہوں۔"

اس کی بات پر قریب کھڑے ایک دو ملازمین بھی مسکرا دیے جبکہ عنادل نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔ کھانا ختم ہونے تک دونوں کافی حد تک مطمئن ہو چکی تھیں، اگرچہ میز پر موجود بیشتر کھانے اب بھی ویسے ہی سجے ہوئے تھے۔

صفدر نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور پھر مؤدبانہ انداز میں بولا۔

"اگر آپ دونوں تشریف لائیں تو میں آپ کو اس کمرے تک لے چلوں جہاں سر چند ہی منٹوں میں آپ سے ملاقات کریں گے۔"

یارا کا دل ایک دم تیز دھڑکنے لگا۔ آخر کار وہ لمحہ قریب آ چکا تھا۔ وہ لمحہ جس کے لیے وہ صبح سے بے تاب تھی۔

جبکہ عنادل کے دل میں ایک عجیب سا اضطراب جاگا۔

اسے بے اختیار وہ سیڑھیوں والا دن یاد آیا...

اور وہ گہری سرمئی آنکھیں...

جن سے دوبارہ سامنا کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر قسمت شاید اس کی رائے پوچھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

وہ کمرہ جس میں اُن دونوں کو بٹھایا گیا تھا، اپنی شان و شوکت میں کسی شاہی مہمان خانے سے کم نہ تھا۔ وسیع و عریض کمرے کی بلند چھت سے ایک عظیم الشان کرسٹل کا فانوس لٹک رہا تھا، جس کی سنہری روشنی پورے کمرے میں نرم چمک بکھیر رہی تھی۔ دیواروں پر نفیس ترک نقش و نگار کندہ تھے جبکہ چند قیمتی مصوری کے نمونے اُن کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ فرش پر ہاتھ سے بُنا ہوا گہرے سرخ اور سنہری رنگوں کا ایرانی قالین بچھا تھا۔ ایک جانب دیوار سے جڑی ہوئی لمبی شیشے کی کھڑکیاں تھیں جن کے پار دار المرجان کے سرسبز باغات دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا کے ہلکے جھونکوں کے ساتھ سرخ گلابوں کی مہک کمرے میں سرایت کر رہی تھی۔

یارا اور عنادل ایک نفیس مخملی صوفے پر بیٹھی تھیں۔ عنادل نے خاموشی سے کمرے کا جائزہ لیا۔

"یہ لوگ واقعی شاہوں کی طرح رہتے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

یارا نے فوراً سر ہلایا۔

"میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی جگہ اتنی خوبصورت ہو سکتی ہے۔" اُس کی آنکھیں اب بھی حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

کمرے کے وسط میں شیشے کی ایک خوبصورت میز رکھی تھی جس پر تازہ سرخ گلابوں کا گلدستہ سجا ہوا تھا۔ قریب ہی چاندی کی ٹرے میں مختلف مشروبات اور مٹھائیاں رکھی تھیں۔

کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ ایک ملازمہ خاموشی سے اندر داخل ہوئی اور اُن کے سامنے ترک کافی اور تازہ جوس رکھ کر احترام سے چلی گئی۔

"مجھے لگ رہا ہے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔" یارا نے کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے سرگوشی کی۔ عنادل بے اختیار مسکرا دی۔

"اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم ابھی بے ہوش ہونے والی ہو۔"

"اگر یلماز یلدرز سامنے آ گئے تو شاید واقعی ہو جاؤں۔" یارا کی بات پر عنادل نے آنکھیں گھما لیں۔

"براہِ کرم آج کوئی ایسی حرکت مت کرنا۔"

"میں؟ میں تو بہت پروفیشنل ہوں۔"

"بالکل۔" عنادل نے معنی خیز انداز میں کہا۔

یارا نے منہ بنا لیا، اسی دوران کمرے کے باہر سے قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی۔ عنادل کا دل انجانے میں ایک لمحے کو ٹھہر سا گیا۔ اُسے بے اختیار وہ سیڑھیوں والا واقعہ یاد آ گیا۔

وہ لمحہ...

وہ درد...

اور پھر وہ آنکھیں...

اُس نے فوراً اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔ دوسری جانب یارا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"شاید وہ آ رہے ہیں..." اُس کی آواز میں جوش صاف محسوس ہو رہا تھا۔

دروازے کے باہر موجود محافظوں کی مدھم آوازیں سنائی دیں، پھر دروازے کا ہینڈل آہستگی سے گھوما۔ یارا نے بے اختیار اپنی سانس روک لی۔ عنادل کے ہاتھ بھی لاشعوری طور پر آپس میں جڑ گئے۔

اور اگلے ہی لمحے...

دارالمرجان کے بادشاہ، یلماز یلدرز کی آمد کا وقت آ پہنچا تھا۔

کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا، اور اگلے ہی لمحے یلماز یلدرز اندر داخل ہوا۔ کمرے میں موجود فضا جیسے یکدم بدل گئی۔

اس نے سیاہ رنگ کی فٹڈ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جو اس کے مضبوط اور ورزش سے تراشے ہوئے جسم کو نمایاں کر رہی تھی۔ ہلکے خاکی رنگ کی نفیس پینٹ، سیاہ بیلٹ، اور آنکھوں پر لگے جدید طرز کے چشمے اس کی شخصیت کو مزید باوقار بنا رہے تھے۔ اس کے بازوؤں کے عضلات ٹی شرٹ کے اندر سے بھی واضح دکھائی دے رہے تھے جبکہ بائیں ہاتھ کی چند نفیس انگوٹھیاں اس کے انداز میں ایک منفرد رعب پیدا کر رہی تھیں۔

اس کے قدم نہ تیز تھے نہ سست، مگر ہر قدم میں ایک عجیب سا اعتماد اور وقار موجود تھا۔ چہرے پر حسبِ معمول ہلکی سی سنجیدگی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں اپنی موجودگی محسوس کروانے کے لیے بولنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

"دارُالمرجان میں خوش آمدید۔" اس کی گہری اور پُروقار آواز کمرے میں گونجی۔

یارا فوراً کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو کسی مداح کی اپنے پسندیدہ شخص کو سامنے دیکھ کر ہوتی ہے۔

"تھ... تھینک یو سر۔" وہ بمشکل اتنا کہہ پائی۔

دوسری طرف عنادل بھی کھڑی ہوئی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ مگر اس کے دل کی دھڑکنیں معمول سے کہیں زیادہ تیز تھیں۔ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ نظریں نہ ملائے، اور اس سے بھی زیادہ کوشش یہ کر رہی تھی کہ یلماز کو وہ سیڑھیوں والا واقعہ یاد نہ ہو۔ مگر قسمت شاید اس کے حق میں نہیں تھی۔

یلماز کی نظریں چند لمحے اس پر ٹھہریں۔ پھر وہ بالکل سادہ انداز میں بولا۔

"آپ کا پاؤں کیسا ہے اب؟" عنادل کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یارا کی نظریں فوراً اس پر جم گئی ہوں۔ وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"اب کافی بہتر ہے سر۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مزید کہا۔

"اور اُس دن مدد کرنے کے لیے آپ کا شکریہ۔"

یلماز نے مختصر سا سر ہلایا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ اب بہتر ہیں۔"

ادھر یارا کی آنکھیں حیرت سے پھیل چکی تھیں۔ اس نے پہلے عنادل کو دیکھا، پھر یلماز کو... پھر دوبارہ عنادل کو۔

"یہ... یہ وہی شخص تھا؟" اس کے ذہن میں جیسے دھماکہ ہوا۔

وہی شخص جس نے عنادل کی مدد کی تھی؟ وہی شخص جس کے بارے میں عنادل نے صرف اتنا کہا تھا کہ "ایک بھلے انسان" نے مدد کی تھی؟ اور وہ بھلا انسان یلماز یلدرز نکلا؟

یارا نے فوراً عنادل کی طرف ایک معنی خیز نظر ڈالی۔ وہی نظر جس کا صاف مطلب تھا۔

"تم بعد میں مجھے ساری تفصیل بتاؤ گی..."

عنادل نے فوراً نظریں چرا لیں۔ جیسے وہ اس خاموش پوچھ گچھ کو سمجھ گئی ہو۔

یلماز ان دونوں کے تاثرات دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا، مگر کچھ نہ بولا۔ پھر اس نے اپنا رخ صفدر کی طرف کیا جو چند قدم پیچھے ادب سے کھڑا تھا۔

"سب تیار ہے؟"

"جی سر۔" صفدر فوراً بولا۔

یلماز نے دوبارہ دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

"مجھے امید ہے سفر آپ کے لیے تھکا دینے والا نہیں رہا ہوگا۔"

"جی نہیں سر۔" یارا نے فوراً جواب دیا۔

"اچھا۔"۔اس نے مختصر انداز میں کہا۔

"تو پھر آیئے۔" وہ دروازے کی جانب بڑھا۔

"آج آپ دارُالمرجان کا ہر وہ حصہ دیکھیں گی جو عام طور پر لوگوں کے لیے بند رہتا ہے۔"

یارا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ جبکہ عنادل کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی جاگی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دارُالمرجان کی سیر جتنی طویل ہوگی... اتنا ہی زیادہ وقت اسے یلماز یلدرز کے ساتھ گزارنا پڑے گا۔ اور یہی وہ چیز تھی جس سے وہ بچنا چاہتی تھی۔

"تشریف لایئے۔" یلماز نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

اور اگلے ہی لمحے وہ دونوں لڑکیاں اس پُراسرار اور عظیم الشان محل کے ایک نئے سفر کی طرف اس کے پیچھے چل پڑیں۔

دارُالمرجان کی سیر کا آغاز ایک نہایت دلکش اور شاہانہ بگھی سے ہوا۔ بگھی سفید رنگ کی نفیس لکڑی سے تیار کی گئی تھی جس پر سنہری نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔اس کے شیشے شفاف تھے اور اندر نرم مخملی نشستیں موجود تھیں۔

بگھی کے آگے دو نہایت خوبصورت عربی گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ دونوں دودھ کی طرح سفید تھے، لمبی گردنیں، چمکتی کھال اور شاہانہ انداز۔ ان کے سنہرے ساز دھوپ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ سامنے ایک محافظ کوچوان کی نشست پر بیٹھا لگام تھامے ہوئے تھا جبکہ اس کے برابر میں صفدر بیٹھا تھا۔

یلماز، یارا اور عنادل بگھی کے اندر آمنے سامنے نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اگلے ہی لمحے گھوڑوں نے ہلکی سی ہنہناہٹ کے ساتھ قدم بڑھائے اور بگھی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ کھڑکیوں کے باہر دارُالمرجان کی دلفریب دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ دور دور تک سرسبز

باغات، سنگِ مرمر سے بنے راستے، بلند آبشاریں، رنگ برنگے پھولوں کی قطاریں اور قدیم طرز کے مجسمے دکھائی دے رہے تھے۔ ہلکی ہوا پھولوں کی خوشبو اپنے ساتھ اٹھائے پھر رہی تھی۔

"یہ دارُالمرجان کا مشرقی باغ ہے۔" صفدر نے مڑ کر بتایا۔

"یہاں دنیا کے مختلف ممالک سے لائے گئے نایاب پودے موجود ہیں۔"

یارا فوراً کھڑکی کے قریب ہوئی۔

"اوہ واہ..." وہ بے اختیار بولی۔

"یہ تو کسی فلم جیسا لگ رہا ہے۔"

عنادل بھی خاموشی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت واضح تھی۔ کبھی وہ رنگ برنگے پھولوں کو دیکھتی، کبھی سنگِ مرمر کے فواروں کو۔

"وہ سامنے جو جھیل نظر آ رہی ہے..." صفدر نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"اسے خاص طور پر تعمیر کروایا گیا تھا۔ اس میں موجود مچھلیوں کی کئی اقسام دنیا میں نایاب سمجھی جاتی ہیں۔"

دونوں لڑکیاں دلچسپی سے سنتی رہیں۔ مگر اس دوران یلماز تقریباً خاموش تھا۔ اس کی نظریں کبھی باہر نہیں گئیں۔ وہ صرف عنادل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کیوں۔ مگر اس کی توجہ بار بار اسی کی طرف چلی جاتی تھی۔ عنادل اس وقت کھڑکی سے باہر ایک چھوٹے سے پھولوں کے باغیچے کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک وہاں دو سفید خرگوش دوڑتے ہوئے نکلے۔ عنادل کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ ایک ہلکی، معصوم سی مسکراہٹ... اور اسے دیکھ کر یلماز کے ہونٹوں پر بھی انجانے میں مسکراہٹ آ گئی۔ وہ خود بھی محسوس نہ کر سکا کہ وہ کب مسکرایا تھا۔ اس کی نظریں بدستور عنادل پر جمی رہیں، جبکہ عنادل کو اس بات کا احساس تک نہ تھا۔ چند منٹ بعد بگھی ایک وسیع میدان کے سامنے آ کر رک گئی۔

"ہم پہنچ گئے ہیں، سر۔" صفدر نے احترام سے کہا۔

سب لوگ بگھی سے باہر اتر آئے۔ جیسے ہی یارا اور عنادل نے سامنے کا منظر دیکھا، دونوں چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گئیں۔ ان کے سامنے ایک عظیم الشان اصطبل اور گھوڑوں کا میدان موجود تھا۔

وسیع سبز میدان دور تک پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف سفید باڑیں لگی ہوئی تھیں، اور میدان کے درمیان دو شاندار گھوڑے دوڑ رہے تھے۔

ایک مکمل سیاہ۔

دوسرا مکمل سفید۔

دونوں اتنے خوبصورت تھے کہ نظریں ہٹانا مشکل تھا۔ سیاہ گھوڑے کی کھال رات کی تاریکی کی طرح چمک رہی تھی جبکہ سفید گھوڑا برف کے ٹکڑے کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

وہ دونوں پوری رفتار سے میدان میں دوڑ رہے تھے۔ ان کے سموں کی آواز پورے ماحول میں گونج رہی تھی۔

"یااللہ..." یارا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ کتنے خوبصورت ہیں۔"

عنادل کی آنکھوں میں بھی حیرت تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھی۔

ہوا اس کے بالوں کو ہلکا سا اڑا رہی تھی جبکہ اس کی نظریں ان گھوڑوں پر جمی تھیں۔

"یہ دارالمرجان کے سب سے قیمتی عربی گھوڑوں میں شمار ہوتے ہیں۔" صفدر نے فخر سے بتایا۔

"سفید گھوڑے کا نام 'نور' ہے اور سیاہ گھوڑے کا نام 'شاہباز'۔"

یارا نے حیرت سے دونوں گھوڑوں کو دیکھا۔

"یہ تو کسی شاہی خاندان کے گھوڑے لگتے ہیں۔"

اس بات پر صفدر مسکرا دیا۔ جبکہ چند قدم دور کھڑا یلماز اب بھی خاموش تھا۔ اس کی نظریں گھوڑوں پر نہیں... بلکہ عنادل کے چہرے پر پھیلی ہوئی اس حیرت اور خوشی پر تھیں، جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔

"کیا ہم ان گھوڑوں کو قریب سے دیکھ سکتے ہیں؟" عنادل نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب اس نے خود کوئی خواہش ظاہر کی تھی۔

یلماز کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری اور اس کے لبوں پر مدھم مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ضرور۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

اگلے ہی لمحے اس نے صرف ایک اشارہ کیا، بس ایک معمولی سا اشارہ۔

اور میدان کے دوسرے کنارے دوڑتا ہوا سیاہ گھوڑا ان کی جانب آنے لگا۔ اس کے طاقتور سم زمین پر پڑتے تو مٹی ہلکی سی فضا میں اڑ جاتی۔ اس کے پیچھے سفید گھوڑی نور بھی اسی رفتار سے دوڑتی چلی آرہی تھی۔ چند لمحوں بعد دونوں ان کے سامنے پہنچ گئے۔

شاہباز سیدھا یلماز کے قریب آکر رک گیا اور بڑے ادب سے اپنی گردن جھکا دی۔ منظر ایسا تھا جیسے وہ اپنے مالک کو سلام پیش کر رہا ہو۔ یارا اور عنادل حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

"یہ تو واقعی آپ کی بات سمجھتے ہیں!" یارا بے اختیار بولی۔

صفدر کے چہرے پر فخر بھری مسکراہٹ ابھری۔

"شاہباز یلماز سر کی روح ہے۔"

اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"اور یلماز سر شہباز سے بے حد محبت کرتے ہیں۔"

یلماز خاموش رہا مگر اس کی نظریں شاہباز پر ٹھہری ہوئی تھیں۔

"کیا ہم اسے چھو سکتے ہیں؟" یارا نے اشتیاق سے پوچھا۔

یلماز ہلکا سا مسکرایا۔

"آپ انہیں چھو سکتے ہیں یا نہیں..." وہ رکا۔

"یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے۔"

یارا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ آہستگی سے شاہباز کے قریب گئی۔ اس نے احتیاط سے ہاتھ بڑھایا اور شاہباز کی پشت سہلائی۔ شاہباز مکمل سکون کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ نہ اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی اور نہ ہی کوئی بے چینی ظاہر کی۔

"لگتا ہے اس نے مجھے اجازت دے دی۔" یارا خوشی سے بولی۔

صفدر ہنس پڑا۔

"جی، ورنہ یہ فوراً دور ہٹ جاتا۔"

ادھر عنادل کی نظریں نور پر جمی ہوئی تھیں۔ سفید گھوڑی خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عنادل چند لمحے جھجکی۔

پھر اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھایا۔اس کی انگلیاں نور کی نرم اور چمکتی ہوئی پشت سے چھوئیں۔ چند لمحے کے لیے نور ساکت رہی۔ پھر اس نے اپنی گردن ہلکی سی عنادل کی جانب جھکادی اور نرم سی ہنہناہٹ کی، گویاوہ اپنی خوشی کا اظہار کر رہی ہو۔

"اوہ..."عنادل کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

اس کے چہرے پر ایسی خالص خوشی ابھری جو شاید مدتوں بعد دیکھی گئی تھی۔ وہ دل سے مسکرائی، ایک ایسی مسکراہٹ جس میں بناوٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔اور وہی مسکراہٹ یلماز کی نظروں کو جیسے اپنے سحر میں جکڑ گئی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔اسے محسوس ہوا جیسے دارُالمرجان کے تمام حسین مناظر ایک طرف اور یہ مسکراہٹ ایک طرف۔ کچھ لمحوں بعد عنادل نے نور کی گردن پر ہلکا سا ہاتھ پھیرا۔ نور نے آنکھیں بند کر کے سر اس کے قریب کر لیا۔ جیسے اسے یہ لمس پسند آیا ہو۔

"لگتا ہے نور کو آپ پسند آگئی ہیں۔"صفدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عنادل کے چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ جبکہ یلماز کی نظریں بدستور اس پر جمی تھیں۔ شام کے سائے اب آہستہ آہستہ پھیلنے لگے تھے۔ سنہری دھوپ مدھم پڑ رہی تھی اور آسمان پر نارنجی رنگ اترنے لگا تھا۔

"ہمیں چلنا چاہیے۔"صفدر نے وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

"انٹرویو بھی باقی ہے۔"

دونوں لڑکیوں نے اثبات میں سر ہلایا، پھر وہ واپس بگھی کی طرف بڑھ گئیں۔ یارا اب بھی گھوڑوں کے بارے میں باتیں کر رہی تھی جبکہ عنادل بار بار مڑ کر نور کو دیکھ لیتی۔ چند لمحوں بعد دونوں بگھی میں بیٹھ چکی تھیں۔ صفدر بھی اپنی نشست سنبھال چکا تھا۔ مگر یلماز ابھی وہیں کھڑا تھا۔اس کی نظریں نور پر تھیں۔ یا شاید...اس جگہ پر جہاں چند لمحے پہلے عنادل نہیں چھوا تھا۔ بے اختیار اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور نور کی پشت کے اسی حصے کو چھو لیا۔اس حرکت پر وہ خود بھی چند لمحے خاموش رہ گیا۔ جیسے اسے اپنی اس بے اختیار حرکت پر حیرت ہوئی ہو۔ نور نے ہلکی سی گردن موڑ کر اپنے مالک کو دیکھا، اور یلماز نے فوراً نظریں ہٹا لیں۔

پھر وہ خاموشی سے بگھی کی جانب بڑھا۔ چند لمحوں بعد وہ بھی اپنی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ گھوڑوں نے دوبارہ قدم بڑھائے۔ اور بگھی دارُالمرجان کے اگلے حصے کی جانب روانہ ہوگئی۔ مگر اس سفر میں اب صرف باغات اور عمارتیں ہی دلکش نہیں تھیں... کسی کے دل میں ایک نیا سوال بھی جنم لے چکا تھا، جس کا جواب شاید خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔

اب وہ سب ایک عالی شان دفتر نما کمرے میں موجود تھے۔

کمرہ اپنی شان و شوکت میں دارُالمرجان کی دوسری عمارتوں سے کسی طور کم نہ تھا۔ دیواروں پر نفیس لکڑی کا کام تھا، ایک جانب چھت تک بلند کتابوں کی الماریاں موجود تھیں جبکہ دوسری جانب شیشے کی وسیع کھڑکیوں سے باہر پھیلے سرسبز باغات دکھائی دے رہے تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑا سا شاہانہ میز رکھا تھا۔

یلماز اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا تھا جبکہ یارا اور عنادل اس کے سامنے موجود نشستوں پر بیٹھی تھیں۔ اب باقاعدہ انٹرویو شروع ہو چکا تھا۔ یارا اپنے نوٹس دیکھتے ہوئے یکے بعد دیگرے سوالات کر رہی تھی۔

"سر، آپ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز کیا ہے؟"

یلماز نے چند لمحے سوچا۔

"استقامت۔" اس نے مختصر مگر پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"لوگ کامیابی چاہتے ہیں، مگر اکثر لوگ اس قیمت کے لیے تیار نہیں ہوتے جو کامیابی وصول کرتی ہے۔"

یارا نے فوراً جواب اپنی فائل میں درج کیا۔ ادھر عنادل خاموشی سے اپنی ڈائری میں ہر اہم نکتہ نوٹ کر رہی تھی۔ اس کی باریک انگلیاں تیزی سے قلم چلا رہی تھیں۔ چہرے پر سنجیدگی تھی اور نظریں مکمل طور پر اپنی ڈائری پر مرکوز تھیں۔

"سر، آپ نوجوانوں کو کیا مشورہ دینا چاہیں گے؟" یارا نے دوسرا سوال کیا۔

"خود پر سرمایہ کاری کریں۔" یلماز نے جواب دیا۔

"دولت چھن سکتی ہے، کاروبار ختم ہو سکتا ہے، مگر علم اور کردار انسان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

یارا متاثر ہو کر سر ہلانے لگی۔

اس دوران یلماز کی نظریں بار بار بے اختیار عنادل پر جا ٹھہرتی تھیں۔ وہ کبھی اس کے قلم کی حرکت دیکھتا۔ کبھی اس کی جھکی ہوئی پلکوں کو، اور کبھی اس کی سنجیدہ توجہ کو۔

عجیب بات یہ تھی کہ اب عنادل اس سے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ کوئی اسے اس قدر غور سے دیکھ رہا ہے۔ وہ صرف اپنا کام کر رہی تھی، اور شاید یہی بات یلماز کو مزید متوجہ کر رہی تھی۔

کافی دیر بعد یارا نے آخری سوال پوچھا۔

"سر، اگر آپ اپنی زندگی کی صرف ایک کامیابی محفوظ رکھ سکیں تو وہ کیا ہو گی؟"

کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی چھاگئی۔یلماز نے کھڑکی کے باہر پھیلے باغات کی جانب دیکھا۔پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"وہ لوگ... جنہوں نے مجھ پر یقین کیا۔"اس کے لہجے میں عجیب سی گہرائی تھی۔

یارااور عنادل دونوں چند لمحے خاموش رہ گئیں۔پھر یارا نے مسکراتے ہوئے اپنی فائل بند کر دی۔

"تھینک یو سر۔"

"یہ انٹرویو ہماری توقعات سے کہیں بہتر رہا۔"

عنادل نے بھی اپنی ڈائری بند کی اور احترام سے سر جھکا دیا۔

"بہت شکریہ سر۔"اس کے نرم لہجے نے یلماز کے دل میں انجانی سی لہر دوڑا دی۔

"آپ دونوں کا بھی شکریہ۔"یلماز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

انٹرویو ختم ہو چکا تھا۔چند لمحوں بعد صفدر اندر آیااور انہیں واپس لے جانے کی اطلاع دی۔دونوں لڑکیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

یارا کے چہرے پر کامیابی اور خوشی نمایاں تھی۔جبکہ عنادل حسبِ معمول پُر سکون دکھائی دے رہی تھی۔

"اللہ حافظ سر۔"یارا مسکراتے ہوئے بولی۔

"اللہ حافظ۔"عنادل نے بھی آہستگی سے کہا۔

یلماز نے صرف سر ہلایا۔مگر اس کی نظریں عنادل سے ہٹ نہ سکیں۔پھر دونوں لڑکیاں صفدر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

دروازہ بند ہوا،اور کمرہ یکایک خاموش ہو گیا۔یلماز اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔اس کی نظریں اب بھی اسی دروازے پر جمی تھیں جہاں سے وہ چند لمحے پہلے باہر گئی تھی۔عجیب سی خالی پن کی کیفیت اس کے دل میں اترنے لگی۔جیسے کمرے سے کوئی اہم چیز رخصت ہو گئی ہو۔

باہر لیموزین تیار کھڑی تھی۔یارااور عنادل اس میں بیٹھ چکی تھیں۔چند لمحوں بعد گاڑی آہستگی سے داڑالمرجان کے مرکزی راستے پر چلنے لگی۔کھڑکی کے شیشے کے پار عنادل آخری بار داڑالمرجان کے باغات کو دیکھ رہی تھی۔

جبکہ یلماز اپنے دفتر کی کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔دور جاتی ہوئی لیموزین اس کی نظروں کے سامنے تھی۔وہ خود بھی نہیں سمجھ پارہا تھا کہ آخر کیوں اسے یہ برا لگ رہا تھا۔

شاید اس لیے... کہ وہ غزالی آنکھوں والی لڑکی اب اس کی نظروں سے اوجھل ہونے جا رہی تھی... اور پہلی بار دارُالمرجان اسے پہلے جتنا آباد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔



ارزروم کے ایک خاموش اور سنسان علاقے میں ایک چھوٹی سی کاٹیج واقع تھی۔ باہر سے دیکھنے میں وہ ایک عام سی رہائش گاہ معلوم ہوتی تھی، مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔

کاٹیج کے نیچے ایک خفیہ تہہ خانہ موجود تھا۔ تنگ سی سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں جہاں پتھر کی دیواروں والا ایک کشادہ کمرہ بنا ہوا تھا۔ چھت سے لٹکتے چند مدھم بلب کمرے میں زرد روشنی پھیلا رہے تھے۔ دیواروں کے ساتھ فولادی الماریاں رکھی تھیں جن میں مختلف فائلیں، کاغذات اور کچھ سائنسی نمونے محفوظ تھے۔ پورے ماحول میں ایک پراسرار خاموشی رچی ہوئی تھی۔

یُسرا بے چینی سے کمرے کے وسط میں کھڑی بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی گھڑی کی سوئیاں آٹھ بجے پر پہنچیں، اوپر سیڑھیوں سے آہستہ آہستہ قدموں کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے بعد ایک شخص سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا۔

سیاہ ہُوڈی، سیاہ جیکٹ، گہرے رنگ کی جینز اور سر پر کھینچی ہوئی ٹوپی... اس کا آدھا چہرہ سائے میں چھپا ہوا تھا۔

وہ خاموشی سے چلتا ہوا یُسرا کے قریب آ کر رکا۔ جب اس نے ذرا سا سر اٹھایا تو نیلی آنکھیں روشنی میں چمک اٹھیں۔

"یوسف..." یُسرا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تمہارے اندازے کے مطابق آج وہ دونوں افسر ہماری لیبارٹری آئے تھے۔"

یوسف کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"مجھے معلوم تھا کہ وہ ضرور آئیں گے۔" اس کی آواز میں عجیب سا اعتماد تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ پہلے ہی جانتا ہو کہ ایسا ہونے والا ہے۔ یا شاید... اس نے جان بوجھ کر وہ سراغ ان کے لیے چھوڑا تھا۔

"انہوں نے کافی سوالات کیے، کافی ریکارڈ چیک کیا، مگر انہیں کچھ خاص نہیں ملا۔ میں نے انہیں شک نہیں ہونے دیا کہ اسی لیبارٹری سے اس کیمیکل کی معمولی مقدار نکالنے میں میری مدد شامل تھی۔" یسریٰ نے اعتماد سے کہا۔

"گڈ..." یوسف نے مختصر جواب دیا۔

پھر وہ کمرے کے ایک کونے میں موجود مخصوص دراز کی طرف بڑھا۔ اس نے دراز کھولی۔ اندر ایک چھوٹی سی شیشی موجود تھی۔ اس شیشی میں وہی خطرناک کیمیکل محفوظ تھا۔

یوسف نے بوتل اٹھائی اور اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔

"اور ان دونوں افسران کا کیا کرنا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

یوسف نے نظریں اٹھائیں۔

"تمہیں میں نے ایک کام دیا تھا۔"

"ہو گیا ہے۔" یسریٰ فوراً بولی۔

"میں نے کیف منصور اور مراد میر دونوں کے بارے میں مکمل تحقیق کر لی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"اور کیف کے بارے میں ہمارے مخبر نے ایک نہایت دلچسپ معلومات دی ہے۔"

"اچھا؟" یوسف کی دلچسپی جاگی۔

"جی... وہ معلومات مستقبل میں ہمارے بہت کام آ سکتی ہے۔"

یوسف کے ہونٹوں پر مطمئن مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تو تم جانتی ہو آگے کیا کرنا ہے۔"

پھر وہ میز کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے چند مخصوص کاغذات موجود تھے۔

"بالکل۔" یسریٰ نے سر ہلایا، مگر پھر اس کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔

"مگر یوسف... اگر کیف ہمارے راستے میں رکاوٹ بن گیا تو؟"

یوسف کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ہلکا سا ہنسا۔

"کیف ابھی بچہ ہے۔" وہ چند لمحے خاموش ہوا، پھر بولا۔

"آخر مجھ سے بہتر اسے کون جان سکتا ہے؟" اس کے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔

میز پر چند فائلیں اور دستاویزات پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک فائل کھولی اور خاموشی سے اس کے صفحات پلٹنے لگا۔

یوسف نے سامنے رکھی فائل پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی۔ جگہ جگہ سرخ نشان لگے ہوئے تھے۔ کئی تصاویر، کئی نوٹس، کئی پرانے ریکارڈ...

"اب تمہارا اگلا شکار کون ہے، یوسف؟" یسریٰ نے پوچھا۔

یوسف چند لمحے خاموش رہا، پھر اس کے ہونٹوں پر سرد مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"میرا آخری شکار..."

وہ رکا۔

اس کی نیلی آنکھوں میں عجیب سی شدت اتر آئی۔

"الپ کایا!"

"الپ کایا..." اس نے نام دہرایا۔ اس کی آنکھوں میں سرد نفرت اتر آئی۔

"تمہاری سانسیں صرف کچھ وقت کی محتاج ہیں۔" یوسف نے اپنے جبڑے بھینچے۔

"کچھ حساب ابھی باقی ہیں۔" کمرے میں چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

پھر یُسرا نے ہمت کر کے وہ سوال پوچھ لیا جو کافی عرصے سے اس کے دل میں تھا۔

"یوسف..." وہ رکی۔

"جب یہ سب ختم ہو جائے گا... کیا تم زلیخہ کو سب کچھ بتا دو گے؟"

یوسف کے ہاتھ رک گئے۔ کمرے میں عجیب سی خاموشی پھیل گئی۔ چند لمحوں تک وہ جواب نہ دے سکا، پھر اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔

"نہیں۔"

یُسرا کے دل میں جیسے کسی نے سوئی چبھو دی۔ مگر اس نے اپنے تاثرات چھپا لیے۔

"پھر؟" اس نے بمشکل پوچھا۔

یوسف کی نظریں چند لمحوں کے لیے خلا میں گم ہو گئیں، اور پھر پہلی بار اس کے چہرے پر سختی کے بجائے نرمی نمودار ہوئی۔

"میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔"

یُسرا نے نظریں جھکا لیں۔ وہ جواب سن چکی تھی جس کا اسے پہلے ہی اندازہ تھا۔

"تم اس سے محبت کرتے ہو..." اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ صرف ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر مٹ گئی۔ اس کے بعد دونوں کافی دیر تک آئندہ کی حکمتِ عملی پر گفتگو کرتے رہے۔ فائلیں بند ہوئیں، نوٹس ترتیب دیے گئے۔ گھڑی نے رات کے نو بجنے کا اعلان کیا۔ بالآخر یوسف اپنی کرسی سے اٹھا۔

"اب مجھے چلنا چاہیے۔" اس نے کہا۔

یُسرا نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ چند لمحوں بعد وہی سیاہ لباس پہنے شخص سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔ دروازہ بند ہوا، اور تہہ خانے میں ایک بار پھر خاموشی اتر آئی۔ یُسرا کافی دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔

کیونکہ وہ جانتی تھی... یوسف کی دنیا میں اس کے لیے کبھی کوئی جگہ نہیں تھی۔



یوسف آہستہ آہستہ اس جگہ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ رات اپنی پوری خاموشی کے ساتھ ارد گرد پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر بکھرے بادلوں نے چاند کی روشنی کو مدھم کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے جنگل نما وہ علاقہ مزید پراسرار محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں خزاں کی خنکی گھلی ہوئی تھی۔ درختوں سے گرے ہوئے سوکھے پتے زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ جب بھی یوسف کا قدم ان پتوں پر پڑتا تو ایک عجیب سی چرچراہٹ پیدا ہوتی۔ وہ آواز اس قدر واضح تھی کہ یوں محسوس ہوتا جیسے اس ویرانے میں صرف وہی ایک زندہ انسان موجود ہو۔ اس کے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ چہرہ حسبِ معمول پرسکون اور سنجیدہ تھا۔ مگر اس کی گہری نیلی آنکھوں میں کچھ ایسا ضرور تھا جو اس کے اندر برپا طوفان کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتا رہا۔

اس کے قدم نہ بہت تیز تھے اور نہ سست۔ جیسے وہ کسی منزل کی طرف نہیں، بلکہ اپنے ماضی کی طرف بڑھ رہا ہو۔

چند لمحوں بعد اس کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

"میرا نام اخفا یوسف ہے، دنیا کے لیے اخفا اور زلیخہ کے لیے یوسف۔" وہ زیرِ لب بولا۔

اس کی آواز میں عجیب سی نرمی تھی۔ وہی نرمی جو شاید دنیا میں صرف ایک شخص کے لیے مخصوص تھی۔

"زلیخہ..." وہ نام جسے سوچتے ہی اس کی آنکھوں کی سختی کسی حد تک ماند پڑ جاتی تھی، وہ نام جسے حاصل کرنے کے لیے اس نے برسوں انتظار کیا تھا۔

وہ چند قدم مزید چلا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک اور نام ابھرا، اور ساتھ ہی اس کی انکھوں میں خون نما سرخی اتر آئی۔

"الپ کا یا..."

اس انسان کو اس کے کرتوتوں کا انجام دینے کے لیے اس نے برسوں انتظار کیا تھا۔ اب وہ وقت قریب تھا جس کے لیے اس نے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اب بہت کم فاصلہ رہ گیا ہے..." وہ خود سے بولا۔

"اور میں اپنے آخری شکار کو کسی بھی قیمت پر نہیں کھو سکتا۔"

ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا، درختوں کی شاخیں ہلیں، سوکھے پتوں کی سرسراہٹ فضا میں گونجی۔ مگر یوسف کے قدم نہیں رکے۔ وہ مسلسل آگے بڑھتا رہا۔

پھر اچانک... اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے دھندلے مناظر ابھرنے لگے۔ جیسے وقت نے اچانک پلٹا کھایا ہو۔

اسے یاد آیا...

ایک کم عمر لڑکا...

جس کی آنکھوں میں خواب تھے، جس کے دل میں یقین تھا کہ انصاف نام کی بھی کوئی چیز دنیا میں موجود ہوتی ہے۔

پھر اسے یاد آیا...

ایک خون آلود منظر۔

ایک ایسی رات جس نے اس کی زندگی کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا تھا۔ وہ رات جب اس کے اندر موجود معصومیت مر گئی تھی، اور اس کی جگہ ایک ایسا انسان پیدا ہوا تھا جو برسوں بعد اخفا یوسف کے نام سے جانا جانے والا تھا۔ یوسف کے قدم لمحہ بھر کو سست پڑ گئے۔ اس کی نیلی آنکھوں میں درد کی ایک ہلکی سی جھلک ابھری۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ جھلک غائب ہو گئی۔ جیسے وہ کبھی موجود ہی نہ تھی۔ اس نے سر اٹھا کر تاریک آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر ایک گہرا سانس لیا۔

"اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں..." اس نے سرد لہجے میں کہا، اور وہ ایک بار پھر اندھیرے میں گم ہوتی پگڈنڈی پر چل پڑا۔ اپنے ماضی کی یادوں کے ساتھ...

اپنے مستقبل کے منصوبوں کے ساتھ...

اور اس انجام کی طرف جس کا انتظار وہ برسوں سے کر رہا تھا۔



آخفا یوسف نے استنبول کو کبھی خوابوں کا شہر نہیں سمجھا۔

اس کے لیے یہ شہر ایک بے رحم استاد تھا، جو مسکراتی گلیوں کے پیچھے زخم چھپا کر رکھتا ہے۔ وہ بچپن میں وہاں آیا تھا، اُس عمر میں جب انسان ابھی شہر نہیں، صرف چہرے پہچانتا ہے۔ مگر استنبول نے اُسے چہرے نہیں دیے، صرف سایے دیے۔ باپ کی غیر موجودگی، ماں کی خاموش موت، اور رشتوں کی وہ سرد مہری جو آدمی کو زندہ رہتے ہوئے بھی دفن کر دیتی ہے۔ یہ سب اس شہر نے اُسے یکے بعد دیگرے سکھایا۔ آخفا کے نزدیک استنبول وہ جگہ تھی جہاں کمزوری جرم تھی، اور احساس جرم سے بھی بڑا بوجھ... اُس نے یہاں دیکھا کہ انصاف صرف اُن کے لیے ہوتا ہے جن کے پاس آواز ہوتی ہے، باقی لوگ خاموشی میں گھٹ گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ جب پہلی بار اُس کے ساتھ ناانصافی ہوئی تو وہ رویا نہیں، کیونکہ شہر نے اُسے یہ سبق پہلے ہی دے دیا تھا کہ آنسو یہاں ثبوت نہیں ہوتے۔ وقت کے ساتھ اُس نے سیکھا کہ اگر دنیا تمہیں بار بار دیوار سے لگائے، تو ایک دن تم خود دیوار بن جاتے ہو۔ آخفا نے قتل اس لیے نہیں کیا کہ وہ خون کا پیاسا تھا، بلکہ اس لیے کہ اُس کے نزدیک ظلم کا جواب الفاظ میں نہیں، فیصلوں میں دیا جاتا ہے۔ اُس کی نظر میں وہ مجرم نہیں تھا، وہ نتیجہ تھا۔ نتیجہ اُن وعدوں کا جو استنبول نے کیے اور کبھی پورے نہ کیے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو ولن نہیں سمجھتا تھا، بلکہ ایک آئینہ... جس میں شہر کو اُس کی اپنی سفاک شکل نظر آتی تھی۔

استنبول کی وہ رات غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔ بارش ابھی تھمی ہی تھی اور سڑکوں پر بکھری روشنی، بھیگی ہوئی اینٹوں سے ٹکرا کر عجیب سی چمک پیدا کر رہی تھی۔ اخفا

یوسف اُس وقت صرف سولہ برس کا تھا، کندھوں پر اسکول کا بوسیدہ بیگ، اور دل میں وہ امید جو ابھی پوری طرح مری نہیں تھی۔ وہ پولیس اسٹیشن کے باہر کھڑا تھا۔ اندر، ایک افسر اُس فائل کو بند کر رہا تھا جس میں آخفا یوسف کی ماں کی موت درج تھی۔

"حادثہ..." ایک سادہ سا لفظ، جس نے پوری زندگی کو ایک جملے میں دفن کر دیا۔

"میرے والد کو بلائیے..." اخفا کی آواز میں کپکپاہٹ تھی،

مگر لہجہ صاف۔

افسر نے سر اٹھا کر دیکھا، پھر بے دلی سے بولا۔

"تمہارا باپ کون سا پہلی بار غائب ہوا ہے؟ گھر جاؤ۔"

گھر؟... آخفا دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ جس جگہ ماں کی آواز نہ ہو، وہ گھر نہیں ہوتا، صرف چار دیواریں ہوتی ہیں۔

"کسی نے اسے دھکا دیا تھا... میں نے دیکھا تھا۔" اُس نے آخری بار کہا۔

افسر نے فائل کو میز پر رکھا، کرسی سے ٹیک لگائی اور سرد لہجے میں کہا۔

"استنبول میں روز بہت کچھ گرتا ہے۔ لوگ بھی، سچ بھی۔"

یہ وہ لمحہ تھا۔

نہ چیخ...

نہ آنسو...

نہ احتجاج۔

بس ایک گہری خاموشی، جو آخفا کے اندر اتر گئی۔ اُس نے پہلی بار سمجھا کہ یہ شہر انصاف نہیں دیکھتا، یہ صرف طاقت پہچانتا ہے۔

وہ رات آخفا خالی ہاتھ گھر لوٹا، مگر اُس کے اندر کچھ مر چکا تھا، اور اسی کے ساتھ کچھ اور جنم لے چکا تھا۔

آخفا کی ماں کا نام کہیں کسی رجسٹر میں درج نہیں تھا، مگر استنبول کی ایک پرانی عمارت کی سیڑھیاں اُسے آج بھی پہچانتی تھیں۔ وہ عورت شور مچانے والی نہیں تھی۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھی جو دکھ سہہ کر بھی آواز نیچی رکھتے ہیں، جو جانتے ہیں کہ کچھ سچ بولے نہیں جاتے، کیونکہ بولے جائیں تو بولنے والا ہی مٹ جاتا ہے۔ آخفا کے باپ کا کاروبار صاف نہیں تھا۔ یہ بات شہر جانتا تھا، مگر شہر ہمیشہ اُنہی کا ساتھ دیتا ہے جن کے ہاتھ طاقت سے بھرے ہوں۔

وہ رات بھی عام سی تھی۔ آخفا اسکول کے کام میں مصروف تھا اور اس کی ماں کچن میں چائے ابالتی ہوئی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ دو آدمی تھے۔ مضبوط جسامت، سخت آنکھیں، اور لہجے میں وہ سردی جو انسان کو بولنے سے پہلے ہی چپ کرا دے۔ وہ اُس کے باپ کے لیے آئے تھے۔ مگر باپ گھر پر نہیں تھا۔ آخفا کی ماں نے بس اتنا کہا۔

"وہ ابھی نہیں ہیں۔" یہ جملہ، اُس رات کا سب سے مہنگا جملہ ثابت ہوا۔

کچھ کہا سنا ہوا، کچھ دھمکیاں، اور پھر ایک دھکا...

کوئی چیخ نہیں، کوئی شور نہیں۔ صرف سیڑھیوں پر لڑھکتی ہوئی ایک لاش، اور نیچے پھیلتا ہوا خون۔

جب پولیس آئی تو فائل میں صرف ایک لفظ لکھا گیا۔

"حادثہ..." کیونکہ گواہ موجود نہیں تھے اور اگر تھے بھی

تو انہوں نے دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

اَخفا جانتا تھا کہ اُس کی ماں نے خود کو نہیں گرایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اُس کے باپ کے لیے آئے تھے، اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُس کے باپ نے اُس دن فون بند رکھا تھا۔

کیا اُس کے باپ نے خود قتل کیا؟

نہیں...

کیا وہ بے قصور تھا؟ یہ سوال زیادہ خطرناک تھا۔ کیونکہ اُس نے سچ جاننے کے باوجود خاموشی کو ترجیح دی تھی۔ اور اَخفا کے نزدیک خاموشی بھی ایک انتخاب ہوتی ہے، اور ہر انتخاب کی قیمت ہوتی ہے۔

اسی دن اَخفا نے اپنے باپ کو باپ سمجھنا چھوڑ دیا، اور اسی دن استنبول اُس کے لیے صرف ایک شہر نہیں رہا، بلکہ ایک قاتل بن گیا۔ جو ہاتھ سے نہیں مارتا بلکہ نظام کے ذریعے مارتا ہے۔

وہ ماں جس نے کبھی آواز اونچی نہیں کی، اُسی خاموشی میں دفن کر دی گئی۔ اور اُس کے بیٹے نے اسی خاموشی کو اپنا ہتھیار بنا لیا۔

اَخفا کی ماں کی موت کے بعد اُس کا باپ استنبول میں زیادہ دیر نہیں ٹکا۔ شہر اگرچہ طاقتور لوگوں کو تحفظ دیتا ہے، مگر صرف اُسی وقت تک جب تک وہ لوگ فائدہ مند رہیں۔ جس رات وہ عورت سیڑھیوں سے گری تھی، اُسی رات سے اَخفا کے باپ کے فون خاموش رہنے لگے۔ وہ جانتا تھا کہ جن لوگوں کو اُس نے خوش رکھنے کی کوشش کی تھی، وہ اب اُسے بوجھ سمجھنے لگے تھے۔

کچھ ہفتوں بعد، اُس نے استنبول چھوڑ دیا۔ نہ بیٹے کو بتایا، نہ کسی کو الوداع کہا۔ بس ایک صبح گھر خالی تھا، الماریاں کھلی، کاغذات غائب، اور ایک میز پر رکھا ہوا پاسپورٹ جس پر نیا ویزا لگا تھا۔ وہ اٹلی چلا گیا۔ وہاں اُس نے نام بدلا، کاروبار بدلا، اور ماضی کو دفن کرنے کی کوشش کی۔

مگر کچھ ماضی دفن نہیں ہوتے، وہ انسان کے اندر سانس لیتے رہتے ہیں۔ اُس نے اَخفا کو ساتھ لے جانے کی کوشش نہیں کی، شاید اس لیے کہ بیٹا اُس کے لیے سوال بن چکا تھا اور وہ سوالوں سے ہمیشہ بھاگتا آیا تھا۔

سالوں بعد... اُس کی خبر ایک مختصر سی اطلاع کی صورت میں آئی۔

وہ ایک فیکٹری میں مردہ پایا گیا تھا۔ پولیس نے لکھا۔

"دل کا دورہ۔"

کوئی تحقیقات نہیں، کوئی شور نہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے آخفا کی ماں کے ساتھ ہوا تھا۔ تب آخفا نے پہلی بار تلخی کے ساتھ سوچا۔ دنیا نے انصاف نہیں بدلا، صرف کردار بدل دیے ہیں۔ باپ کا انجام آخفا کے لیے سکون نہیں لایا، کیونکہ اصل مسئلہ باپ نہیں تھا... مسئلہ وہ نظام تھا جس نے پہلے ماں کو اور پھر باپ کو خاموشی سے نگل لیا تھا۔

اور یہی وجہ تھی کہ آخفا نے بدلہ کسی ایک شخص سے نہیں لیا، وہ پورے نظام سے لڑنے نکلا۔



(باب:6)

اس واقعے کو کئی دن گزر چکے تھے۔ مگر اس دن کے بعد سے زلیخہ دوبارہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ یوسف کے کیبن میں ہونے والی تلخ گفتگو بار بار اس کے ذہن میں گونجتی رہتی تھی۔ وہ جتنا اس واقعے کو بھلانے کی کوشش کرتی، اتنا ہی وہ یاد اس کے دل کو تکلیف دیتی۔ اس نے یہ سارا واقعہ اربش کو بھی سنا دیا تھا۔ جس پر اربش نے حسبِ معمول یوسف کو خوب برا بھلا کہا تھا، اور اپنی پیاری دوست کو تسلی دی تھی کہ اگر کوئی شخص اس کی قدر نہیں جانتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ زلیخہ میں کوئی کمی ہے۔ مگر دل کے زخم دلیلوں سے کہاں بھرتے ہیں۔

وقت رات کا تھا... ان دنوں ارزروم میں شدید سردی کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔ باہر مسلسل برف باری ہو رہی تھی۔ گھروں کی چھتیں، درختوں کی شاخیں، سڑکیں اور گاڑیاں سب سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھیں۔

سرد ہوا کے جھونکے کھڑکیوں سے ٹکرا کر سیٹیاں بجاتے گزر رہے تھے۔ گھر کے تقریباً تمام افراد اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ کہیں مدھم روشنیاں جل رہی تھیں اور کہیں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ زلیخہ اپنے بستر پر بیٹھی تھی۔ پاس ہی طہور گہری نیند سو چکی تھی۔ زلیخہ بھی سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے کمبل درست کیا اور لیٹنے ہی والی تھی کہ اچانک... ٹھک! کوئی سخت چیز اس کے کمرے کی کھڑکی سے آ ٹکرائی۔ وہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔ دل ایک دم بے ترتیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ کمرے کی خاموشی میں وہ آواز غیر معمولی محسوس ہوئی تھی۔ وہ فوراً بستر سے اتری اور کھڑکی کی جانب بڑھی۔ کھڑکی کھول

کر باہر جھانکا۔ باہر کا منظر دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ عجیب حد تک خاموش تھا۔ سٹریٹ لائٹس کی زرد روشنی برف کے سفید ذروں پر پڑ کر ایک خوابناک منظر بنا رہی تھی۔ باریک برف مسلسل آسمان سے گر رہی تھی۔ ہر طرف سفیدی ہی سفیدی تھی۔ زلیخہ نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کوئی نظر نہیں آیا۔

"شاید میرا وہم تھا..." وہ زیرِلب بڑبڑائی۔

پھر مڑنے ہی والی تھی کہ اچانک اس کی نظر گھر کے سامنے موجود چھوٹے سے گیراج پر پڑی۔

برف سے ڈھکی زمین پر بڑے بڑے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ حیرت سے آگے جھکی اور پڑھنے لگی۔

"Sorry"... زلیخہ کی بھنویں حیرت سے سکڑ گئیں۔

"یہ کیا ہے؟" وہ بدستور سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے دوبارہ ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی موجود نہ تھا۔

تبھی... بستر کے پاس رکھا اس کا موبائل فون بج اٹھا۔ وہ چونک گئی، فوراً پلٹی اور جلدی سے فون کی طرف بڑھی۔

سکرین پر ایک انجان نمبر جگمگا رہا تھا۔ چند لمحے وہ سکرین کو حیرانی سے دیکھتی رہی۔ پھر آخر کار کال وصول کر لی، مگر خاموش رہی۔ دوسری طرف بھی چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ایک مانوس آواز سنائی دی۔

"فوراً باہر آؤ زلیخہ، ورنہ میں اس سردی میں جم جاؤں گا۔"

زلیخہ کا دل ایک لمحے کو رک سا گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یوسف..." اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ وہ فوراً کھڑکی کی طرف دوڑی۔ اس بار غور سے نیچے دیکھا۔

اور پھر... اسے وہ نظر آیا۔ سیاہ اوور کوٹ پہنے، برف میں کھڑا۔ اس کے بالوں اور کندھوں پر برف جم چکی تھی۔ ہاتھ جیبوں میں تھے، اور وہ سر اٹھائے اسی کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کی نیلی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ زلیخہ کے دل میں بیک وقت غصہ، حیرت، خوشی اور الجھن نے سر اٹھایا۔

"یہ پاگل ہو گیا ہے کیا؟" وہ بے اختیار بڑبڑائی۔

فون اب بھی اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔

"زلیخہ..." نیچے کھڑے یوسف کی آواز دوبارہ آئی۔

"اگر تم پانچ منٹ اور لگاؤ گی تو واقعی مجھے برف سے نکالنے کے لیے فائر بریگیڈ بلانی پڑے گی۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی۔

مگر زلیخہ کا دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یوسف اس وقت یہاں موجود تھا۔ وہی یوسف... جس سے وہ کئی دنوں سے بات نہیں کر رہی تھی۔

وہی یوسف... جس نے اس کا دل دکھایا تھا، اور وہی یوسف...

جو اس وقت برف باری میں اس کے گھر کے باہر کھڑا تھا۔

زلیخہ نے ایک گہرا سانس لیا، پھر فون بند کیا۔ اور دبے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ شاید گھر کے سب لوگ سو چکے تھے۔ وہ آہستگی سے سیڑھیاں اترنے لگی، اور اس کا دل ہر قدم کے ساتھ پہلے سے زیادہ زور سے دھڑکنے لگا۔

کیونکہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا... دروازہ کھولنے کے بعد اس کی اور یوسف کی ملاقات کونسا رخ اختیار کرنے والی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے یوسف کھڑا تھا۔ برف کے چند ذرے ابھی بھی اس کے کوٹ اور بالوں پر جمے ہوئے تھے۔

زلیخہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، پھر ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ یوسف خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ دروازہ بند کرتے ہی گھر کی گرم فضا نے باہر کی یخ بستہ سردی کا احساس کچھ کم کر دیا۔ زلیخہ بنا کچھ کہے اسے ڈرائنگ روم کی طرف لے آئی۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں آمنے سامنے موجود صوفوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ لمحے خاموشی رہی۔

"سب سو گئے ہیں؟" یوسف نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

زلیخہ نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس وقت آنے کا مطلب پوچھ سکتی ہوں؟" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں ناراضی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

یوسف نے ہلکا سا گلا صاف کیا۔

"سوری... میں جلدی آنے والا تھا، پھر ایک ضروری کام میں پھنس گیا۔"

زلیخہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میرے گھر تک آنے کی وجہ...؟" اس نے سیدھا سوال کیا۔

یوسف چند لمحے خاموش رہا، پھر اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں موجود شاپر اس کی طرف بڑھا دیا۔ زلیخہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ پھر شاپر لے لیا۔ اندر جھانکا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یہ اس کا پرس تھا، وہی پرس جو اس دن غصے میں یوسف کے کیبن میں بھول آئی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت ابھری۔

"شکریہ..." وہ آہستہ سے بولی۔

یوسف نے سر ہلا دیا۔ چند لمحے پھر خاموشی رہی۔

"ناراض ہو؟" اس نے آخرکار پوچھ لیا۔

زلیخہ نے فوراً ایک نوکیلی، غصے بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

ایسی نگاہ کہ عام انسان فوراً معافی مانگ لیتا۔ مگر یوسف کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"اچھا... تو مطلب ابھی بھی امید باقی ہے۔"

زلیخہ کی بھنویں سکڑ گئیں۔

"کیا مطلب؟"

"اگر تم مجھ سے بات ہی نہ کرنا چاہتی تو دروازہ کھولتے ہی باہر نکال دیتی۔" وہ سنجیدگی سے بولا، پھر ہلکا سا مسکرایا۔

"غصہ صرف انہی لوگوں سے کیا جاتا ہے جن کی باتوں سے فرق پڑتا ہو۔"

زلیخہ کا دل ایک لمحے کو عجیب انداز میں دھڑکا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"تم خود کو بہت اہم سمجھتے ہو نا؟" وہ تیوری چڑھاتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔" یوسف نے فوراً جواب دیا۔

"بس تمہیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

زلیخہ خاموش ہو گئی۔ کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ پھر یوسف اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا، اب میں چلتا ہوں۔"

"بس؟" زلیخہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"بس۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"ویسے ایک ضروری بات کہنا بھول گیا تھا۔"

"کون سی؟"

"کل یونیورسٹی آنا مت بھولنا۔" زلیخہ نے فوراً نظریں چرائیں۔

"میرا دل نہیں چاہتا۔" زلیخہ بولی۔

"مسئلہ یہ ہے کہ مجھے تمہارے دل کی نہیں، حاضری کی فکر ہے۔" یوسف نے خشک لہجے میں کہا۔

زلیخہ نے غصے سے اسے دیکھا۔ جس پر یوسف کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ آگئی۔

"اور اگر کل بھی غیر حاضر رہی تو؟" زلیخہ نے چیلنجنگ انداز میں پوچھا۔

یوسف دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے رکا، پھر مڑ کر اسے دیکھا۔

"پھر مجھے مجبوراً ایک استاد کی حیثیت سے اپنی طالبہ کو سزا دینی پڑے گی۔" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شرارت تھی۔

"اور یقین کرو، میں اس معاملے میں بالکل رعایت نہیں دیتا۔"

زلیخہ نے بے اختیار لب بھینچ لیے۔

"دھمکی دے رہے ہو تم؟"

"نہیں۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"پیشگی اطلاع دے رہا ہوں۔"

زلیخہ چاہ کر بھی اپنی مسکراہٹ پوری طرح نہ چھپا سکی۔

یوسف نے شاید وہ دبی ہوئی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں بھی اطمینان سا ابھرا۔

"اور ہاں..." وہ ایک بار پھر رکا۔

"کسی دن مناسب وقت پر آؤں گا۔"

"کیوں؟"۔ زلیخہ نے حیرت سے پوچھا۔

"آنٹی سے ملنے..." پھر وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"اور باقی گھر والوں سے بھی۔"

زلیخہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی، یوسف دروازے سے باہر جا چکا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ باہر برف اب بھی برس رہی تھی۔ یوسف سڑک پر چلتا ہوا آہستہ آہستہ دور جا رہا تھا، اور نہ جانے کیوں... اسے خود سے دور جاتے دیکھ زلیخہ کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ اس گراج پر پڑی جہاں کچھ دیر پہلے وہ حروف لکھے گئے تھے جواب مکمل برف کی تہہ تلے دب گئے تھے، اور بے اختیار اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ اپنے دفتر میں اپنی مخصوص چرمی کرسی پر بیٹھا تھا، سر کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا جبکہ آنکھیں بند تھیں۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے موجود شیشے کی دیوار کے پار رات کی تاریکی اور دار المرجان کے روشن باغات دکھائی دے رہے تھے۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ سوائے دیوار پر لگی قدیم گھڑی کی مدھم ٹک ٹک کے۔ یلماز یلدرز بظاہر پرسکون بیٹھا تھا، مگر اس کے اندر ایک عجیب ہلچل برپا تھی۔ ایسی ہلچل جس سے وہ برسوں سے ناواقف رہا تھا۔ تبھی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"اندر آجاؤ۔" اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ دروازہ کھلا اور صفدر اندر داخل ہوا۔

"سر، کل کی میٹنگ میں الپ کایا بھی شرکت کریں گے۔"

یلماز نے آنکھیں بند ہی رکھیں۔

"ہمم..." بس اتنا ہی بولا۔

صفدر نے چند لمحے انتظار کیا۔ پھر یلماز کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"وہ دونوں لڑکیاں خیریت سے گھر پہنچ گئی تھیں؟"

"جی سر۔" صفدر نے فوراً جواب دیا۔

"میں نے خود تصدیق کروائی تھی۔"

"گڈ..." یلماز نے آہستگی سے کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ کمرے میں چند لمحے صرف خاموشی موجود رہی۔ صفدر نے غور سے اپنے مالک کو دیکھا۔ وہ اب بھی اسی انداز میں بیٹھا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر معمول سے ہٹ کر عجیب سی سنجیدگی تھی۔

"سر... آپ ٹھیک ہیں؟" صفدر نے آخر پوچھ ہی لیا۔

یلماز نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ ان گہری سرمئی آنکھوں میں ایک عجیب کیفیت تھی۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے چھت کو دیکھتا رہا۔ پھر دھیمی آواز میں بولا۔

"صفدر... آج کچھ بہت غلط ہو گیا ہے۔"

صفدر کے ماتھے پر شکنیں ابھریں۔

"کیا مطلب سر؟"

یلماز ہلکا سا مسکرایا، مگر وہ مسکراہٹ بے بسی لیے ہوئے تھی۔

"وہ چیز ہو گئی ہے جو نہیں ہونی چاہیے تھی۔"

"سر؟" اب صفدر واقعی متجسس ہو چکا تھا۔

یلماز نے اپنی نظریں سامنے موجود شیشے کی دیوار پر جما دیں۔ جہاں رات کی تاریکی خاموش کھڑی تھی۔

"میرا بنجر دل..."

وہ چند لمحے رکا۔

"ایک بار پھر آباد ہو گیا ہے۔"

صفدر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یلماز نے ایک گہرا سانس لیا، اور پھر پہلی بار وہ اعتراف کیا جس کا شاید اسے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے غزالی آنکھوں والی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔"

کمرے میں چند لمحوں کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر صفدر کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ وہ برسوں سے یلماز کے ساتھ تھا۔ اس نے اسے کامیابیوں کی بلندیاں چھوتے دیکھا تھا، دشمنوں کو شکست دیتے دیکھا تھا، ہزاروں لوگوں کو اس کے سامنے جھکتے دیکھا تھا۔ مگر کبھی کسی کو یلماز یلدرز کے دل تک پہنچتے نہیں دیکھا تھا۔

"سر..." وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"آخر کار کسی نے ناممکن کام کر ہی دیا۔"

یلماز نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"مجھے خود یقین نہیں آ رہا۔" وہ کرسی سے اٹھا اور شیشے کی دیوار کے قریب جا کھڑا ہوا۔ نیچے دارالمرجان کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس کی نظریں کہیں بہت دور کھو گئی تھیں۔ شاید وہ دوبارہ وہی مسکراتا ہوا چہرہ یاد کر رہا تھا۔

وہی غزالی آنکھیں...

وہی نرم لہجہ...

وہی سرخ گلابوں کے گجرے پہنے ہوئے ہاتھ...

اس کے لبوں پر بے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

صفدر خاموشی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ برسوں بعد اس نے اپنے مالک کی آنکھوں میں طاقت یا غصے کے بجائے ایک اور جذبہ دیکھا تھا۔

"محبت۔"

وہ جذبہ جس کے سامنے بڑے بڑے فاتح بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔

اور آج... برسوں بعد اس محل میں چاند اترا تھا، جس کی روشنی نے یلماز یلدرز کے سنگ دل وجود میں بھی ایک نئی بہار جگادی تھی۔



دارالمرجان سے واپسی کے بعد اگلا دن معمول سے کہیں زیادہ مصروف ثابت ہوا تھا۔ صبح ہی عنادل اور یارا یونیورسٹی پہنچ گئی تھیں۔ کل ہونے والے انٹرویو کی تمام آڈیو ریکارڈنگز، نوٹس اور تصاویر ان کے پاس موجود تھیں جنہیں اب ایک باقاعدہ آرٹیکل کی شکل دینا تھا۔ کراکا یا یونیورسٹی کی میڈیا ٹیم کو بھی اس انٹرویو کا شدت سے انتظار تھا کیونکہ یلماز یلدرز شاذونادر ہی کسی تعلیمی ادارے کو انٹرویو دیتا تھا۔

یونیورسٹی کی لائبریری کے ایک خاموش گوشے میں دونوں لڑکیاں اپنے لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھیں۔ یارا بے حد جوش میں تھی۔

"یہ ہیڈنگ کیسی رہے گی؟"

اس نے اسکرین عنادل کی طرف گھماتے ہوئے پوچھا۔

"دارالمرجان کے راز، یلماز یلدرز کے ساتھ ایک خصوصی ملاقات"

عنادل نے چند لمحے سوچا۔

"بری نہیں ہے... لیکن ذرا پروفیشنل لگنی چاہیے۔"

"اوہ میڈم پروفیشنل!" یارا نے منہ بنایا۔

جس پر عنادل ہنس دی۔

"اچھا تم ہی بتاؤ۔"

"یلماز یلدرز، قیادت، وژن اور دارالمرجان کی کہانی۔"

"اوہ واہ!" یارا نے فوراً تالیاں بجائیں۔

"یہ واقعی اچھی ہے۔"

پھر دونوں کئی گھنٹوں تک کام میں مصروف رہیں۔ عنادل اپنے نوٹس دیکھ کر یلماز کے جوابات ترتیب دیتی رہی جبکہ یارا انہیں کمپیوٹر پر ٹائپ کرتی رہی۔ درمیان میں کئی بار یارا نے یلماز کی تعریفوں کے پل باندھے۔

"یار قسم سے، بندہ ہے یا فلم کا ہیرو؟"

"کام کرو۔" عنادل نے فوراً اُسے گھورا۔

"میں کام ہی کر رہی ہوں۔" یارا ہنسی۔

"لیکن تم مانو یا نہ مانو، اس کی پرسنیلٹی واقعی خطرناک تھی۔"

عنادل نے جواب نہیں دیا۔ مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے وہ لمحہ یاد آ گیا جب یلماز نے اس کے پاؤں کے بارے میں پوچھا تھا۔ اسے اب بھی حیرت تھی کہ اتنا بڑا آدمی اتنی معمولی بات کیسے یاد رکھ سکتا تھا۔ شام تک دونوں نے پورا مضمون تیار کر لیا۔ یارا نے آخری بار اسے پڑھا۔ پھر مطمئن ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"ہو گیا!"

"الحمدللہ۔" عنادل نے بھی سکون کا سانس لیا۔

یارا نے فوراً فائل یونیورسٹی کی آفیشل ویب سائٹ پر اپ لوڈ کر دی۔ چند ہی منٹوں میں آرٹیکل شائع ہو گیا۔

"اور مس عنادل نور..." یارا فاتحانہ انداز میں بولی۔

"اب پوری یونیورسٹی کل یہ پڑھے گی۔"

عنادل مسکرا دی۔

"بس دعا کرو کوئی غلطی نہ رہ گئی ہو۔"

"اگر غلطی ہوئی بھی تو الزام تم پر ڈال دوں گی۔"

"یار!..."

دونوں ہنس پڑیں۔

شام ڈھلتے ڈھلتے عنادل گھر واپس آ گئی۔ آج کا دن غیر معمولی طور پر تھکا دینے والا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں پہنچی، اس نے بیگ ایک طرف رکھا اور سیدھی بستر پر گر گئی۔ کھڑکی کے باہر سرد ہوا درختوں کی شاخوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں، اور نہ جانے کب ہلکی سی نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو مغرب ہونے والی تھی۔

اس نے فوراً اٹھ کر گھر کے چند کام نمٹائے۔ کپڑے تہہ کیے،

کچن میں جا کر برتن دھوئے، پھر رات کے کھانے کی تیاری کی۔ یہ سب کرتے کرتے رات ہو چکی تھی۔ اب گھر میں نسبتاً سکون تھا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آئی۔ تبھی اسے یاد آیا کہ گھر کا کچھ ضروری سامان ختم ہو چکا ہے۔ اس نے الماری سے ایک گرم کوٹ نکالا، پھر ایک لمبا اون کا مفلر گلے میں لپیٹا، موبائل اور پرس اٹھایا اور آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔

"بس پانچ منٹ کا کام ہے..." وہ خود سے بولی۔

"سامان لے کر فوراً واپس آ جاؤں گی۔"

باہر موسم خاصا سرد تھا۔ مگر قریب ہی موجود مارٹ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ اسی لیے اس نے اکیلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپارٹمنٹ کو لاک کیا اور پھر باہر نکل آئی۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا فوراً اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ اس نے مفلر ذرا اور اچھی طرح لپیٹا اور خاموش رات میں مارٹ کی طرف چل پڑی۔



رات کے تقریباً ساڑھے نو بج رہے تھے۔ دفتر کی پوری عمارت تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ زیادہ تر ملازمین اپنے گھروں کو جا چکے تھے جبکہ چند لوگ ہی مختلف شعبوں میں آخری کام نمٹانے میں مصروف تھے۔ کیف اپنے کیبن میں موجود تھا۔ سامنے میز پر سات مختلف فائلیں کھلی پڑی تھیں۔

یہ انہی سات افراد کی تفصیلات تھیں جن کے پاس اس دن اس نایاب کیمیکل کی رسائی موجود تھی۔اس کی نظریں ایک ایک نام، ایک ایک تصویر اور ایک ایک ریکارڈ کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔اس کے ہاتھ میں قلم تھا جس سے وہ اہم نکات پر نشان لگا رہا تھا۔مراد دمیر کی باتیں بھی بار بار اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

"ہمیں صرف چوری شدہ کیمیکل نہیں ڈھونڈنا... ہمیں وہ شخص ڈھونڈنا ہے جو اسے استعمال کر رہا ہے۔"

کیف نے ایک گہرا سانس لیا۔اس نے اگلی فائل کھولی ہی تھی کہ اچانک میز پر رکھا موبائل وائبریٹ ہوا۔

ٹن...

اس نے لاشعوری طور پر موبائل کی طرف دیکھا۔اسکرین پر ایک نامعلوم نمبر سے نوٹیفکیشن آیا تھا۔اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن ابھری۔

نامعلوم نمبر...؟

اس نے فون اٹھایا اور نوٹیفکیشن کھول لیا۔اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔اسکرین پر ایک تصویر موجود تھی۔ایک لڑکی کسی مارٹ کی طرف جاتی دکھائی دے رہی تھی۔تصویر دور سے لی گئی تھی۔چہرہ واضح نہیں تھا۔کیف چند لمحے تصویر کو گھورتا رہا۔تبھی موبائل دوبارہ وائبریٹ ہوا۔

ایک اور تصویر...اس بار زاویہ مختلف تھا،اور اسی لمحے کیف کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"عنادل..." یہ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔اب وہ اسے پہچان چکا تھا،وہ عنادل ہی تھی۔ گرم کوٹ پہنے،ہاتھ میں شاپنگ بیگ لیے مارٹ کی طرف جاتی ہوئی۔کیف کے دل میں اچانک ایک انجانا خوف جاگا۔مگر اصل جھٹکا اسے تب لگا جب اس نے تصویر کے نیچے لکھا ہوا متن پڑھا۔

".Save her, before it's too late"

کیف چند لمحے ساکت رہ گیا۔اس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکنے لگا۔اس کی نظریں بار بار ان الفاظ پر جا کر رک رہی تھی۔

".Before it's too late"

کمرے کی خاموشی اچانک اسے خوفناک محسوس ہونے لگی۔

اس کا تجربہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ یہ کوئی مذاق نہیں۔

کوئی اسے خبردار کر رہا تھا،اور وہ بھی عنادل کے بارے میں۔

"لعنت..." وہ زیرِ لب بولا۔

اس نے فوراً نامعلوم نمبر پر کال ملائی۔ مگر نمبر بند تھا۔اس نے دوبارہ کوشش کی، پھر دوبارہ۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اس کی بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔اچانک وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔اتنی تیزی سے کہ کرسی پیچھے جاکر دیوار سے ٹکرا گئی۔اس نے میز پر پڑی گاڑی کی چابیاں اٹھائیں، موبائل جیب میں ڈالا،اور تقریباً دوڑتا ہوا کیبن سے باہر نکل گیا۔راہداری میں موجود چند ملازمین حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ مگر کیف کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

اس کے قدم تیزی سے پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اس کے ذہن میں بار بار عنادل کا چہرہ اور وہ پیغام گردش کر رہا تھا۔

"Save her..." کچھ ہی لمحوں بعد وہ پارکنگ میں موجود اپنی سیاہ رنگ کی سپورٹس کار تک پہنچ گیا۔اس نے فوراً دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مگر گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے دوبارہ تصاویر کھول لیں۔اب وہ ہر تصویر کو انتہائی غور سے دیکھ رہا تھا۔

شاید کوئی اشارہ...

کوئی مقام...

کوئی سراغ...

اچانک اس کی نظر ایک تصویر کے پس منظر پر گئی،وہیں ایک روشن سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔

"مینگو مارٹ"

کیف کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

یہ نام...اس نے کہیں دیکھا تھا۔

بہت حال ہی میں...

مگر کہاں؟اس نے آنکھیں بند کر لیں،ذہن میں مختلف مقامات ابھرنے لگے۔

سڑکیں...

عمارتیں...

اپارٹمنٹس...

پھر اچانک ایک منظر اس کے ذہن میں روشن ہوا۔

وہ رات... جب وہ عنادل کی خیریت دریافت کرنے اس کے اپارٹمنٹ گیا تھا، اور اپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر... وہی مارٹ موجود تھا۔

"Mango Mart"

کیف کی آنکھیں فوراً کھل گئیں۔

"مل گیا..." وہ زیرِ لب بولا۔

اب اسے مقام یاد آ چکا تھا۔ اس نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی۔ انجن کی طاقتور آواز پارکنگ میں گونج اٹھی۔ اگلے ہی لمحے سپورٹس کار بجلی کی سی رفتار سے پارکنگ سے نکل گئی۔

کیف کے چہرے پر شدید تشویش چھائی ہوئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ عنادل کس خطرے میں ہے... یا یہ پیغام بھیجنے والا کون ہے... مگر ایک بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر اس پیغام میں ذرا سی بھی سچائی ہوئی... تو ہر گزرتا ہوا لمحہ عنادل کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

کیف کی سیاہ رنگ کی اسپورٹس کار استنبول کی روشن سڑکوں پر بجلی کی مانند دوڑ رہی تھی۔ رات اپنے عروج پر تھی۔ سڑکوں کے کناروں پر قطار در قطار لگی روشنیاں ایک دھندلی لکیر کی صورت پیچھے رہتی جا رہی تھیں۔ کار کا طاقتور انجن مسلسل غرّش کر رہا تھا۔ اسٹیئرنگ پر کیف کی گرفت غیر معمولی حد تک مضبوط تھی۔ اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے جبکہ نظریں سڑک پر جمی تھیں۔ ذہن میں بار بار وہی تصویر ابھر رہی تھی۔

عنادل کی تصویر... اور اس کے نیچے لکھے ہوئے الفاظ۔

".Save her, before it's too late"

اس کے دل کی دھڑکن معمول سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اتنا پریشان کیوں تھا۔ مگر ایک انجانا خوف اس کے پورے وجود پر قابض ہو چکا تھا۔

پھر اس رات پورے استنبول نے کیف منصور کی ڈرائیونگ دیکھی تھی۔

سرخ اشارے...

مصروف چوراہے...

تیز موڑ...

سب اس کی رفتار کے سامنے پیچھے رہتے جا رہے تھے۔ وہ صرف ایک چیز جانتا تھا، اسے عنادل تک پہنچنا تھا۔ جتنی جلدی ممکن ہو۔

چند منٹ بعد اس کی گاڑی مینگو مارٹ کے باہر آکر رکی۔

بریک کی تیز آواز رات کی خاموشی میں گونجی۔ کیف تقریباً اچھل کر گاڑی سے باہر نکلا۔ اس نے فوراً مارٹ کے اندر داخل ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

ایک ایک راہداری...

ایک ایک کاؤنٹر...

ہر طرف۔

مگر عنادل کہیں نہیں تھی۔ اس کا دل مزید بے چین ہو گیا۔ اس نے پورے مارٹ کا چکر لگایا...ایک مرتبہ، پھر دوسری مرتبہ، مگر کچھ نہ ملا۔ اب اس کی حالت کسی بے چین انسان جیسی ہو چکی تھی۔ وہ فوراً باہر نکلا، اور تیزی سے عنادل کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔ سرد رات کی ہوا اس کے بالوں کو منتشر کر رہی تھی۔ اس نے جلدی میں صرف سیاہ شرٹ کے اوپر ایک گہرا سرمئی کوٹ پہن رکھا تھا۔ قمیص کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں، چہرے پر تھکن تھی،

مگر اس سے کہیں زیادہ بے چینی۔

وہ تیز قدموں سے اپارٹمنٹ کی عمارت میں داخل ہوا اور پھر... اس کے قدم یکدم رک گئے۔ سامنے راہداری میں ایک مانوس وجود دکھائی دیا۔

عنادل...

وہ دونوں ہاتھوں میں خریداری کے تھیلے اٹھائے آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔

بالکل محفوظ...

بالکل خیریت سے...

بالکل اس کی نظروں کے سامنے۔

ایک لمحے کے لیے کیف نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اس کے سینے پر رکھا کوئی بہت بڑا بوجھ اچانک ہٹ گیا ہو۔اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ پوری راہ اپنی سانس روکے بیٹھا تھا،اور پھر لاشعوری طور پر اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ مسکراہٹ جو شاید خود اس نے بھی محسوس نہ کی۔

عنادل نے بھی اسی لمحے سر اٹھایا،اور سامنے کھڑے کیف کو دیکھ کر چونک گئی۔

"کیف سر...؟"وہ حیرت سے بولی۔

"آپ اس وقت ؟"

کیف چند لمحے خاموش اسے دیکھتا رہا، جیسے یقین کر رہا ہو کہ وہ واقعی ٹھیک ہے، پھر آہستہ سے بولا۔

"آپ بالکل ٹھیک ہیں؟"

عنادل نے حیرانی سے سر ہلایا۔

"جی... بالکل۔"کیف نے گہرا سانس لیا۔

"گڈ..."اس کی آواز معمول سے کہیں زیادہ نرم تھی۔

عنادل اب بھی حیران کھڑی تھی۔

"سر،سب خیریت تو ہے؟"

کیف نے جواب نہیں دیا۔ صرف ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا، پھر ہلکا سا سر ہلایا۔

".İyi geceler"

(شب بخیر)

یہ کہہ کر وہ مڑا اور واپس چل دیا۔

عنادل چند لمحے وہیں کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ اس وقت یہاں کیوں آیا تھا؟

اور اتنا پریشان کیوں لگ رہا تھا؟

مگر کیف بغیر پیچھے دیکھے راہداری سے نکل گیا۔ جبکہ عنادل چند لمحے مزید حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا،اور اندر داخل ہو گئی۔اسے کیا معلوم تھا کہ چند منٹ پہلے...

کوئی شخص پورے استنبول کو سر پر اٹھائے صرف یہ یقین کرنے نکلا تھا کہ وہ محفوظ ہے۔

کوریڈور میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی اور عمارت کے بیشتر مکین نیند کی آغوش میں جا چکے تھے۔ چھت پر نصب زرد روشنیوں کی مدھم شعاعیں ماربل کے فرش پر پھیل رہی تھیں، جبکہ باہر کھڑکیوں کے پار استنبول کی سرد رات اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود تھی۔

کیف جو ابھی ابھی جانے کا تاثر دے کر مڑا تھا، دراصل چند قدم آگے جا کر رک گیا۔ اس کی نظریں مسلسل عنادل کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ عنادل واقعی اپنے اپارٹمنٹ کے اندر جا چکی ہے۔ تب وہ آہستہ آہستہ واپس لوٹا۔

دروازے کے ایک طرف دیوار تھی۔ کیف اسی دیوار کے ساتھ نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی حالت معمول سے بالکل مختلف تھی۔ سیاہ شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ کوٹ اس نے گاڑی میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ ماتھے پر بکھرے ہوئے بال بتا رہے تھے کہ وہ کس بے چینی میں یہاں تک پہنچا تھا۔ گردن کے قریب شرٹ کے اوپری دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور سانسیں اب بھی مکمل طور پر نارمل نہیں ہوئی تھیں۔ وہ دیوار کے ساتھ سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ ایک ٹانگ اس نے سیدھی پھیلائی ہوئی تھی جبکہ دوسری گھٹنے سے موڑ کر اوپر رکھی تھی۔ اس کا ایک بازو اسی گھٹنے پر ٹکا ہوا تھا اور ہاتھ ڈھیلا ہو کر نیچے لٹک رہا تھا۔ اس ہاتھ میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ باقی تھی۔ دوسرا بازو ٹھنڈے ماربل کے فرش پر پڑا تھا۔ کیف نے آنکھیں بند کر لیں، اور اگلے ہی لمحے اس کے ذہن میں وہ تصویر ابھری جس نے چند گھنٹے پہلے اس کے وجود کا سکون چھین لیا تھا۔

وہ نامعلوم نمبر...

وہ تصویریں...

اور وہ ایک جملہ۔

"اسے بچاؤ، اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے..."

اس کے جبڑے سختی سے بھینچ گئے۔ آج پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ خوف کیسا ہوتا ہے۔ ایسا خوف جو کسی دشمن سے نہیں... بلکہ کسی اپنے کے کھو جانے کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور سامنے عنادل کے بند دروازے کو دیکھا۔ اس دروازے کے پیچھے وہ لڑکی موجود تھی جسے وہ خود سے بھی زیادہ محفوظ دیکھنا چاہتا تھا۔ اور یہی بات اسے سب سے زیادہ بے چین کر رہی تھی۔

"یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے...؟" وہ دھیرے سے خود سے بولا۔

مگر اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ عنادل کے اپارٹمنٹ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن... اگر وہ اندر جا کر اس کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا تو باہر بیٹھ کر ضرور کر سکتا تھا۔ اس نے دوبارہ سر دیوار سے ٹکا دیا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ کوریڈور میں چلنے والی ٹھنڈی ہوا بار بار اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ مگر کیف کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کی نظریں وقتاً فوقتاً عنادل کے دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ جیسے وہ خود کو یقین دلا رہا ہو کہ وہ محفوظ ہے۔

رات گزرتی رہی، گھنٹے گزرتے رہے۔

ایک بجا...

دو بجے...

تین بجے...

پھر چار۔

پورا اپارٹمنٹ گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مگر کیف کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بھی بند نہیں ہوئیں۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔

"اگر واقعی کوئی خطرہ تھا تو؟"

"اگر میں دیر سے پہنچتا تو؟"

ہر بار یہی سوچ اس کے دل کی دھڑکن کو تیز کر دیتی۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ سردی کے باوجود اس کے ہاتھ گرم محسوس ہو رہے تھے، شاید بے چینی کی وجہ سے۔ بالآخر دور کہیں فجر سے پہلے کی ہلکی سی سفیدی آسمان پر نمودار ہونے لگی۔ صبح کے چھ بج چکے تھے۔ کیف نے ایک بار پھر عنادل کے اپارٹمنٹ کے دروازے کو دیکھا۔ سب کچھ پرسکون تھا، سب کچھ محفوظ تھا، اور اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ رات بخیریت گزر چکی ہے۔ وہ آہستہ سے کھڑا ہوا۔ طویل وقت تک ایک ہی جگہ بیٹھنے کی وجہ سے اس کے جسم میں ہلکی سی اکڑن آ گئی تھی۔ اس نے گردن موڑی، پھر آخری بار دروازے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی خاموش اطمینان تھا جو ایک محافظ کی آنکھوں میں اپنے فرض کی تکمیل کے بعد آتا ہے۔ پھر وہ چند لمحے مزید وہاں رکا، جیسے دل ابھی بھی مکمل طور پر مطمئن نہ ہوا ہو۔ اور آخر کار جب اسے یقین ہو گیا کہ عنادل واقعی خیریت سے ہے، تو وہ مڑا اور خاموش قدموں سے کوریڈور کے دوسرے سرے کی جانب چل دیا۔

پیچھے صرف خاموشی رہ گئی، اور ایک ایسا راز... جس سے شاید خود کیف بھی ابھی پوری طرح واقف نہیں تھا۔



یلماز یلدرز کے مرکزی ہیڈ آفس کی سب سے اوپری منزل پر واقع وسیع و عریض کانفرنس روم اپنی شاندار ساخت اور پُر وقار ماحول کے باعث کسی شاہی دربار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کانفرنس روم کے وسط میں ایک لمبی سیاہ لکڑی کی میز رکھی تھی۔ اس میز کے گرد ترکی کے چند بڑے کاروباری حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ جن میں الپ کایا بھی شامل تھا۔ اس وقت سب کی نظریں میز کے سرے پر بیٹھی شخصیت پر مرکوز تھیں۔

"یلماز یلدرز..."

سیاہ رنگ کا نفیس تھری پیس سوٹ، کلائی پر مہنگی گھڑی، آنکھوں پر ہلکے فریم کا چشمہ اور چہرے پر وہی مخصوص سنجیدگی۔ وہ اپنی مخصوص چرمی کرسی پر انتہائی پُراعتماد انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیاں میز پر رکھی فائل کے کنارے کو ہلکے ہلکے چھو رہی تھیں جبکہ گہری سرمئی آنکھیں

حاضرین کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"تو پھر، طرابزون پروجیکٹ کی تازہ ترین رپورٹ کیا کہتی ہے؟" یلماز کی گہری آواز کمرے میں گونجی۔

فوراً ایک بزنس مین نے اپنی فائل کھولی۔

"سر، ابتدائی مرحلہ کامیابی سے مکمل ہو چکا ہے۔ ساحلی ریزورٹ کے ساٹھ فیصد کام کی تکمیل ہو چکی ہے اور سرمایہ کار بھی مطمئن ہیں۔"

یلماز نے مختصر سا سر ہلایا۔

"اور منافع؟"

"متوقع شرح سے آٹھ فیصد زیادہ، سر۔"

اس بار اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"اچھا ہے۔"

اسی دوران الپ کایا اپنی کرسی پر ذرا آگے ہوا۔

"لیکن میرے خیال میں ہمیں اگلا مرحلہ شروع کرنے سے پہلے مزید سرمایہ کاری کرنی چاہیے۔ اگر ہم اسے صرف سیاحتی منصوبہ رکھنے کے بجائے ایک بڑا کمرشل حب بنا دیں تو آمدنی دگنی ہو سکتی ہے۔"

کمرے میں موجود چند افراد نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

یِلماز خاموشی سے الپ کایا کو دیکھتا رہا۔

"اور تم یہ سرمایہ کہاں سے لاؤ گے؟"

"کئی بین الاقوامی کمپنیاں دلچسپی رکھتی ہیں۔ اگر ہم انہیں شراکت داری دے دیں تو..."

"نہیں۔" یِلماز نے اس کی بات کاٹ دی۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ الپ کایا کے چہرے پر ناگواری ابھری۔

"کیوں؟"

یِلماز نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"کیونکہ یِلدرز گروپ کے منصوبوں میں فیصلے میں کرتا ہوں۔"

"لیکن یِلماز، یہ کاروبار ہے، سلطنت نہیں۔" الپ کایا کے لہجے میں واضح چبھن تھی۔

کمرے میں موجود باقی لوگ فوراً خاموش ہو گئے۔ سب جانتے تھے کہ الپ کایا اور یِلماز کے درمیان اکثر نظریاتی اختلاف رہتا تھا۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر یِلماز آہستگی سے اپنی کرسی سے اٹھا۔ اس کی لمبی قامت اور رعب دار شخصیت یکدم پورے کمرے پر حاوی ہو گئی۔ وہ چند قدم چلتا ہوا شیشے کی دیوار کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ باہر پھیلا ہوا استنبول اس کے قدموں تلے محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے مڑ کر حاضرین کو دیکھا۔ پھر اس کی نظریں سیدھی الپ کایا پر جا ٹھہریں۔

"تم نے ایک بات درست کہی۔" وہ بولا۔

"یہ کاروبار ہے..." اس نے توقف کیا، پھر اس کی آواز پہلے سے زیادہ گہری ہو گئی۔

"مگر یہاں بادشاہ صرف ایک ہی ہے..."

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

"اور وہ ہوں میں۔"

کمرے میں موجود تمام افراد خاموش رہ گئے۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس جملے کے بعد کچھ کہہ سکے۔الپ کایا کے چہرے کے تاثرات سخت ہو گئے۔ مگر وہ بھی جانتا تھا کہ حقیقت یہی تھی۔

یِلدرز گروپ...

دارالمرجان...

اور ترکی کے درجنوں بڑے منصوبے...ان سب کے پیچھے ایک ہی نام کھڑا تھا...یِلماز یِلدرز۔

یِلماز دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا، گویا ابھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"طرابزون پروجیکٹ اپنی موجودہ حکمتِ عملی کے مطابق آگے بڑھے گا۔" وہ فائل بند کرتے ہوئے بولا۔

"اور اگر کسی کو اس فیصلے پر اعتراض ہے..."

اس کی آنکھوں میں خطرناک سی چمک ابھری۔

"تو وہ اپنی سرمایہ کاری واپس لے سکتا ہے۔"

مگر حیرت انگیز طور پر کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

کیونکہ سب جانتے تھے...یِلماز یِلدرز کے ساتھ کھڑے رہنے میں فائدہ تھا، اور اس کے مقابل کھڑے ہونے میں صرف نقصان۔



عنادل معمول کے مطابق اپنے دفتر میں موجود تھی۔اس کے سامنے کمپیوٹر کی اسکرین روشن تھی جبکہ وہ پوری توجہ کے ساتھ رپورٹس مکمل کرنے میں مصروف تھی۔ دفتر میں حسبِ معمول کام کا شور تھا۔ کہیں کی بورڈ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، کہیں فائلوں کے پلٹنے کی۔ عنادل نے ایک رپورٹ مکمل کر کے سکھ کا سانس لیا اور غیر ارادی طور پر نظریں اٹھائیں۔اچانک اس کی نگاہ چند فاصلے پر موجود کیف کے کیبن پر جا ٹھہری۔ شیشے کی دیوار کے پیچھے بیٹھا کیف منصور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔اس کی

گہری نظریں سیدھی عنادل پر جمی ہوئی تھیں۔ عنادل چند لمحے ساکت رہ گئی۔ پھر جیسے ہی کیف نے محسوس کیا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے، اس نے فوراً نظریں ہٹالیں اور اس طرح فائل کھول کر دیکھنے لگا جیسے وہ شروع سے اپنے کام میں مصروف ہو۔

عنادل نے حیرت سے پلکیں جھپکیں۔

"یہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے نا...؟" اس نے دل میں سوچا۔

پھر اچانک اسے گزشتہ رات کا واقعہ یاد آ گیا۔ کیف کا اچانک اس کے اپارٹمنٹ میں آنا، اس کی خیریت پوچھنا، اور پھر صرف "İyi geceler" کہہ کر واپس چلے جانا۔

عنادل نے بے اختیار سر جھٹکا۔

"عجیب آدمی ہے..." وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ مگر نہ جانے کیوں آج اس کی توجہ بار بار بٹ رہی تھی۔ شام تک دفتر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ عنادل نے اپنا سامان سمیٹا اور یارا کو پیغام بھیجا۔

"شام کو کیفے میں مل سکتی ہو؟"

جواب فوراً آیا۔

"ضرور، میں آ رہی ہوں۔"

دفتر سے نکلتے وقت موسم خاصا سرد تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی روشنیوں نے ایک خوبصورت منظر بنا رکھا تھا۔ عنادل تیز قدموں سے کیفے کی طرف جا رہی تھی۔ مگر چند منٹ بعد اسے عجیب سا احساس ہونے لگا۔

جیسے کوئی اس کے پیچھے چل رہا ہو۔

وہ اچانک رکی، پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سڑک تقریباً معمول کے مطابق تھی۔ چند راہگیر اپنے اپنے راستے جا رہے تھے۔

کوئی خاص چیز نظر نہ آئی۔ عنادل نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔۔ مگر کچھ فاصلے بعد پھر وہی احساس۔ اس بار اس کا دل بے اختیار تیزی سے دھڑکا۔ اس نے دوبارہ پیچھے دیکھا۔

کچھ بھی نہیں۔

صرف سڑک...

روشنیوں کی قطار...

اور سرد ہوا۔

"شاید میرا وہم ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی۔ مگر نہ جانے کیوں دل پوری طرح مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ چند دیر بعد وہ کیفے پہنچ گئی۔ یارا پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب والی میز پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔

"آخر کار آ ہی گئی تم!" یارا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

عنادل ہلکا سا مسکرائی اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا۔

"تو بتاؤ، کیا بات ہے؟" یارا نے تجسس سے پوچھا۔

عنادل نے گہرا سانس لیا۔

"مجھے لگتا ہے کیف سر عجیب ہوتے جا رہے ہیں۔"

یارا فوراً سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"اچھا؟" اس کی آنکھوں میں شرارت چمکی۔

"اب کیا ہوا؟"

عنادل نے اسے گزشتہ رات کا سارا واقعہ سنا دیا۔

کیف کا اچانک آنا...

خیریت پوچھنا...

اور پھر صرف شب بخیر کہہ کر واپس چلے جانا۔ یارا پورا قصہ سنتی رہی، پھر چند لمحے خاموش رہی اور اگلے ہی لمحے زور سے ہنس پڑی۔

"بس؟"

عنادل نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"تم ہنس کیوں رہی ہو؟"

"کیونکہ یہ دنیا کا سب سے عجیب شب بخیر تھا۔"

یارا ہنستے ہوئے بولی۔

"کوئی آدمی رات کے وقت شہر کا آدھا راستہ طے کر کے صرف شب بخیر کہنے نہیں آتا۔"

"میں سنجیدہ ہوں۔" عنادل بولی۔

"اور میں بھی۔" یارا نے کافی کا گھونٹ لیا، پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"عنادل... تم نے کبھی سوچا ہے کہ شاید کیف تمہیں پسند کرتا ہو؟" عنادل تقریباً چونک گئی۔

"ناممکن۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"اور تمہیں اتنا یقین کیسے ہے؟"

عنادل چند لمحے خاموش رہی۔

پھر نظریں جھکا لیں۔

"میں ایک بار محبت کر چکی ہوں، یارا۔"

یارا کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ جانتی تھی کہ عنادل کس کی بات کر رہی ہے۔

ہارون... عنادل کی پہلی محبت۔

"میں نے اسے اپنا سب کچھ دیا تھا۔"

عنادل دھیمی آواز میں بولی۔

"اپنی دعائیں... اپنا وقت... اپنے خواب..." اس نے تلخی سے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اور آخر میں میرے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔"

یارا خاموشی سے اسے سنتی رہی۔

"اب میرے اندر دوبارہ کسی سے محبت کرنے کی ہمت نہیں بچی۔"

کیفے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ یارا نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"ہر شخص ہارون نہیں ہوتا، عنادل۔"

عنادل نے جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں کھڑکی کے پار پچھلی رات پر جمی ہوئی تھیں، اور نہ جانے کیوں... اسے ایک بار پھر وہی احساس ہوا۔ جیسے کوئی دور کہیں سے اسے دیکھ رہا ہو۔



رات کافی گزر چکی تھی۔استنبول کے اسپیشل انویسٹی گیشن ڈپارٹمنٹ کی عمارت میں اب چند ہی کمروں کی روشنیاں باقی تھیں۔انہی میں سے ایک روشنی کیف منصور کے کیبن سے بھی آرہی تھی۔کمرے میں عجیب سی خاموشی تھی۔سامنے دیوار پر لگی بڑی اسکرین پر مختلف تصاویر اور رپورٹس کھلی ہوئی تھیں جبکہ میز پر بے شمار فائلیں بکھری پڑی تھیں۔کیف اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ایک ہاتھ میں رپورٹ تھی جبکہ دوسرا ہاتھ پیشانی پر رکھا ہوا تھا۔اس کے سامنے براق کھڑا تھا۔

"سم مل گئی۔" براق نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

کیف نے فوراً سر اٹھایا۔

"کہاں ؟"

"شہر کے شمالی حصے میں موجود جھیل کے کنارے۔" براق نے ایک تصویر اس کی جانب بڑھائی۔

کیف نے تصویر لی۔

تصویر میں ایک معمولی سی سم کارڈ کی ٹرے اور ٹوٹی ہوئی سم دکھائی دے رہی تھی جو کیچڑ کے درمیان پڑی تھی۔

"اور؟" کیف نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اور کچھ نہیں۔" براق نے گہرا سانس لیا۔

"نہ فنگر پرنٹس...نہ کوئی سی سی ٹی وی فوٹیج...نہ کوئی شناخت۔"

کیف خاموشی سے تصویر دیکھتا رہا۔

"سم صرف ایک دن پہلے خریدی گئی تھی۔" براق بولا۔

"اور غالباً صرف ایک ہی مقصد کے لیے استعمال ہوئی تھی۔"

"عنادل کی تصاویر بھیجنے کے لیے۔" کیف نے سرد لہجے میں بات مکمل کی۔

"ہاں۔" براق نے سر ہلایا۔

کمرے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔کیف کی

آنکھیں اب خطرناک حد تک سنجیدہ ہو چکی تھیں۔اس نے آہستگی سے تصویر میز پر رکھ دی۔

"یعنی جس شخص نے یہ کیا..." وہ رکا۔

"اس نے سب کچھ پہلے سے پلان کیا تھا۔"

براق نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اس نے عارضی سم خریدی، تصاویر بھیجیں، ہمیں مطلوبہ جگہ تک پہنچایا، پھر سم تلف کر دی۔"

کیف کرسی سے اٹھا اور کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔

باہر شہر کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ مگر اس وقت اس کا ذہن صرف ایک بات پر اٹکا ہوا تھا...عنادل۔

"وہ ہمیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔" کیف آہستگی سے بولا۔

"یا کسی چیز سے خبردار کرنا چاہتا تھا۔"

"ممکن ہے۔" براق نے جواب دیا۔

"مگر ایک بات طے ہے۔" براق بولا۔

"کون سی؟" کیف مڑا۔

براق کی آنکھیں سنجیدہ ہو گئیں۔

"جو بھی ہے..."

"وہ تم پر نظر رکھ رہا ہے۔" پھر اس نے توقف کیا۔

"اور عنادل پر بھی۔"

یہ سن کر کیف کے جبڑے سخت ہو گئے۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔اچانک کیف کو گزشتہ رات یاد آئی۔

اپارٹمنٹ کے باہر بیٹھ کر پوری رات جاگنا...

عنادل کے دروازے کے پاس بیٹھے رہنا...

اور وہ انجانا خوف جو مسلسل اس کے دل پر بوجھ بن کر بیٹھا رہا تھا۔اس وقت اسے اپنی بے چینی بے وجہ محسوس ہوئی تھی۔ مگر اب...اب ثابت ہو چکا تھا کہ خطرہ واقعی موجود تھا۔

"براق..." کیف کی آواز غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھی۔

"ہمم...؟"

"آج سے عنادل کی نگرانی شروع کرو۔"

"مطلب؟" براق چونکا، غیر محسوس انداز میں۔

کیف نے واضح کیا۔

"وہ خود نہ جان سکے۔"

"مگر اگر واقعی کوئی اس پر نظر رکھ رہا ہے تو میں ایک لمحے کے لیے بھی اسے غیر محفوظ نہیں چھوڑ سکتا۔"

براق نے چند لمحے اسے دیکھا، پھر ہلکا سا مسکرایا۔

"تم ایک باس کی حیثیت سے فکر مند ہو..."

وہ جان بوجھ کر رکا۔

"یا کچھ اور بات ہے؟"

کیف نے اسے ایک سرد نظر سے دیکھا۔

"اپنا کام کرو، براق۔"

براق ہنس پڑا۔

"سمجھ گیا۔" وہ فائل اٹھاتے ہوئے بولا۔

"مگر ایک بات تو واضح ہے۔"

"کیا؟"

"جو بھی کھیل شروع ہوا ہے..."

براق کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"وہ عام نہیں ہے۔"

کیف نے کھڑکی کے پار پھیلے تاریک آسمان کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں اب وہی خطرناک سنجیدگی تھی جو کسی شکاری کی آنکھوں میں اپنے شکار کی بو محسوس ہونے کے بعد آتی ہے۔ کسی نے عنادل کی تصاویر بھیجی تھیں، کسی نے اسے خبردار کیا تھا، اور کوئی ایسا تھا... جو ان دونوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

مگر ایک بات وہ شخص نہیں جانتا تھا۔اگر اس نے واقعی عنادل کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی... تو اس بار اسے کیف منصور کا سامنا کرنا پڑے گا۔



رات کے تقریباً دس بج رہے تھے۔اپارٹمنٹ کی کھڑکی کے باہر استنبول کی روشنیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں جبکہ سرد ہوا شیشوں سے ٹکرا کر ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔عنادل اپنے بستر پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھی تھی۔اس کی گود میں لیپ ٹاپ رکھا تھا جس پر وہ یونیورسٹی کے کچھ نوٹس ترتیب دے رہی تھی۔کمرے میں مکمل سکون تھا۔اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ایک ایسا نکتہ جو اسے یلماز یلدرز کے انٹرویو کے متعلق اپنی ذاتی ڈائری میں لکھنا تھا۔

"اوہ ہاں..." وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"یہ تو مجھے نوٹ کرنا چاہیے۔"

اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور بستر کے ساتھ موجود چھوٹے سے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول دی، وہیں اس کی ڈائری ہمیشہ رکھی ہوتی تھی۔مگر... دراز خالی تھی۔

عنادل نے پلکیں جھپکیں، پھر دوبارہ غور سے دیکھا۔

"عجیب بات ہے..." وہ بڑبڑائی۔

اس نے دراز پوری کھول دی۔اندر چند قلم، ایک پرانی کتاب اور کچھ کاغذات موجود تھے، مگر ڈائری نہیں تھی۔اس کے ماتھے پر ہلکی سی شکن ابھری۔

"شاید میں نے کہیں اور رکھ دی ہو۔" وہ خود کو تسلی دیتی ہوئی اٹھی۔اس نے میز کے اوپر دیکھا، پھر کتابوں کی شیلف پر، پھر بیڈ کے نیچے جھانکا، مگر ڈائری کہیں نہیں تھی۔اب اس کے دل میں بے چینی سی پیدا ہونے لگی۔وہ تیزی سے الماری کی طرف بڑھی۔ایک ایک خانہ کھول کر دیکھنے لگی۔

کپڑوں کے درمیان...

فائلوں کے درمیان...

حتیٰ کہ ان خانوں میں بھی جہاں وہ کبھی ڈائری رکھتی ہی نہیں تھی۔ مگر ہر بار نتیجہ ایک ہی نکلتا...کچھ نہیں۔

ڈائری غائب تھی۔

"نہیں..."اس کی دھڑکن ذرا تیز ہوئی۔

"یہ یہاں ہی تھی۔"اسے اچھی طرح یاد تھا۔وہ ڈائری اس کے لیے عام ڈائری نہیں تھی۔اس میں اس کے کئی سالوں کے خیالات محفوظ تھے۔

اس کے خواب...

اس کی یادیں...

اس کی خوشیاں...

اس کے دکھ...

اس کے دل کے راز...

اس کی خاموش دعائیں...

اس کی ناکام محبت...

اور وہ سب باتیں جو اس نے کبھی کسی سے نہیں کہیں،اس ڈائری کے صفحات میں محفوظ تھیں۔عنادل اب واقعی پریشان ہو چکی تھی۔اس نے پورا کمرہ الٹ پلٹ کر رکھ دیا،تکیے اٹھائے،چادریں ہٹائیں، الماری خالی کر دی، میز کی تمام درازیں کھول ڈالیں، حتیٰ کہ باورچی خانے تک جا کر دیکھ لیا، مگر ڈائری کہیں موجود نہیں تھی۔

کمرے کی حالت اب جنگ کے میدان جیسی لگ رہی تھی۔ ہر طرف سامان بکھرا ہوا تھا۔عنادل سانس پھلاتی ہوئی بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی۔اس کے چہرے پر واضح پریشانی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟"اس نے سرگوشی کی۔

اس کا دل عجیب سی بے چینی سے بھر گیا۔پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ یہ محض ایک ڈائری نہیں تھی جو گم ہوئی تھی،وہ اس کی کئی سالوں کی ساتھی تھی۔

عنادل نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"یا اللہ...آخر گئی کہاں؟"اس کی آواز میں واضح پریشانی تھی۔

وہ ایک بار پھر اٹھی، شاید امید کا کوئی دھاگا ابھی باقی تھا۔ اس نے دوبارہ پورا کمرہ کھنگالنا شروع کر دیا۔

الماری...

میز...

کتابوں کی شیلف...

باورچی خانے کے کاؤنٹر...

حتیٰ کہ واش روم تک جا کر دیکھ لیا، مگر ہر بار نتیجہ وہی نکلتا۔ ڈائری کہیں موجود نہیں تھی۔ آخرکار وہ تھک کر بستر کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔

"وہ میری پسندیدہ ڈائری تھی..." وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

اسے یاد تھا وہ ڈائری اسے اس کے والد نے تحفے میں دی تھی، اور تب سے اس نے اپنی زندگی کا ہر اہم لمحہ اس میں محفوظ کیا تھا۔ اس رات اسے پہلی بار کسی قیمتی چیز کے کھو جانے کا حقیقی دکھ محسوس ہوا، مگر وہ اس حقیقت سے مکمل طور پر بے خبر تھی... کہ اس کی ڈائری گم نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس شخص کے پاس تھی... جو خود اس کی حفاظت کے لیے راتیں جاگنے لگا تھا۔



استنبول کا مغربی علاقہ بیلیک دوزو، اپنی کشادہ سڑکوں، جدید عمارتوں اور نسبتاً پُرسکون ماحول کے باعث شہر کے مصروف ترین حصوں سے مختلف محسوس ہوتا تھا۔ آج یلماز یلدرز اسی علاقے میں ایک اہم کاروباری معاہدے کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ صبح سے لے کر شام تک اس کی مصروفیات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

کبھی میٹنگز...

کبھی مختلف دستاویزات پر دستخط...

اور کبھی سرمایہ کاروں کے ساتھ طویل گفتگو۔ اب سورج آہستہ آہستہ افق کی جانب جھک رہا تھا۔ سنہری روشنی استنبول کی بلند عمارتوں کے شیشوں سے ٹکرا کر ایک دلکش منظر پیدا کر رہی تھی۔ یلماز کی مخصوص سیاہ رنگ کی لمبی گاڑی ہموار سڑک پر خاموشی سے رواں تھی۔ اندر حسبِ معمول یلماز پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چند فائلیں تھیں جن پر وہ سرسری

نظر ڈال رہا تھا۔ سامنے والی نشست پر صفدر بیٹھا تھا۔ مگر آج وہ غیر معمولی طور پر بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کبھی کھڑکی سے باہر دیکھتا...

پھر چند لمحوں بعد مڑ کر یلماز کی طرف دیکھتا، گویا کچھ کہنا چاہتا ہو۔ مگر ہر بار خاموشی سے دوبارہ سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا۔ یہ سلسلہ کئی بار دہرایا گیا۔ آخر کار یلماز نے فائل بند کر دی۔ اس کی گہری نظریں صفدر پر اٹھیں۔

"کیا بات ہے صفدر؟"

صفدر چونکا۔

"جی... کچھ نہیں سر۔"

یلماز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"تم جھوٹ اچھا نہیں بولتے۔"

صفدر شرمندگی سے مسکرایا۔

"وہ... دراصل مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"اور ابھی کافی سفر باقی ہے۔"

یلماز نے ایک لمحہ اسے دیکھا، پھر خاموشی سے سر ہلایا۔

وہ جانتا تھا کہ صفدر کبھی نماز میں سستی نہیں کرتا، اس نے فوراً سامنے بیٹھے ڈرائیور سے پوچھا۔

"راستے میں کوئی مسجد ہے؟" ڈرائیور نے ریئر ویو مرر میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جی سر... خوش قسمتی سے تقریباً پانچ منٹ کے فاصلے پر ایک بڑی مسجد آ رہی ہے۔"

"اچھا۔" یلماز نے مختصر جواب دیا۔ پھر صفدر کی طرف دیکھا۔

"ہم وہیں رکیں گے۔"

صفدر کی آنکھوں میں فوراً چمک آ گئی۔ یلماز نے اپنی مخصوص سنجیدگی کے ساتھ بات مکمل کی۔

"جب تک ہمارا قیام ہو گا، تم مسجد میں جا کر نماز ادا کر لینا۔"

صفدر کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شکریہ، سر۔"

یلماز نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف ہلکا سا سر ہلا دیا۔ چند منٹ بعد گاڑی ایک خوبصورت مسجد کے سامنے آ کر رک گئی۔

مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی۔ مؤذن کی آواز شام کی خاموش فضا میں ایک عجیب سکون بکھیر رہی تھی۔

صفدر تقریباً فوراً گاڑی سے باہر نکلا، مگر پھر رک گیا۔

"سر... آپ؟" صفدر نے امید بھری نظروں سے پوچھا تھا۔

یلماز چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے کھڑکی کے پار مسجد کے مینار کو دیکھا جہاں سے اذان کی پُرسکون صدا فضا میں بکھر رہی تھی۔

"تم جاؤ۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

صفدر ایک لمحے کو خاموش رہا، پھر اس نے سر جھکا کر کہا۔

"جی سر..." اور گاڑی سے اتر کر مسجد کی جانب بڑھ گیا۔

دوسری طرف یلماز وہیں اپنی مخصوص نشست پر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے محافظ فوراً چوکس ہو گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر کھڑے گارڈز ارد گرد پر نظر رکھے ہوئے تھے جبکہ ڈرائیور بھی اپنی نشست پر سیدھا بیٹھا تھا۔ گاڑی کے اندر عجیب سی خاموشی تھی۔

باہر مغرب کی اذان جاری تھی۔

یلماز نے آہستگی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور یوں محسوس ہوا جیسے وقت اچانک برسوں پیچھے لوٹ گیا ہو۔

"جب بھی تمہارے بابا کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی، تو وہ اللہ سے مانگتے تھے۔" دادا کی بوڑھی مگر محبت بھری آواز گونجی۔

چھوٹا سا یلماز ان کے ساتھ مسجد کے صحن میں بیٹھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے دادا کو دیکھ رہی تھیں۔

"ایک راز کی بات بتاؤں تمہیں؟" دادا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یلماز نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ دادا کی آنکھوں میں محبت اتر آئی۔

"تمہاری ماں کو بھی یمان نے اللہ سے مانگا تھا۔" وہ ہلکے سے ہنسے۔

"اور دیکھو... اللہ نے انہیں تمہاری ماں دے دی۔"

چھوٹا یلماز کچھ دیر یہ بات سمجھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر معصومیت سے بولا۔

"دادا... اگر میں اللہ سے کچھ مانگوں تو کیا مجھے بھی مل جائے گا؟" دادا کے چہرے پر گہری مسکراہٹ ابھری۔

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"اللہ اپنے بندوں کی ہر دعا سنتا ہے بیٹے، کبھی وہ وہی چیز دے دیتا ہے جو ہم مانگتے ہیں، اور کبھی اس سے بہتر چیز عطا کر دیتا ہے، اور کبھی کسی حکمت کے تحت اسے مؤخر کر دیتا ہے۔ مگر اللہ اپنے بندے کو کبھی نظرانداز نہیں کرتا۔"

اس دن کے بعد... چھوٹا یلماز ہر نماز کے بعد ہاتھ اٹھاتا تھا۔

اور ایک ہی دعا مانگتا تھا۔

"یا اللہ... میرے بابا اور امی جان کو واپس بھیج دیں۔"

روز... ہر نماز کے بعد... وہ یہی دعا کرتا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن دروازہ کھلے گا اور اس کے ماں باپ واپس آ جائیں گے۔

وہ کئی مہینے اپنی دعا کے پورا ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آئے۔

وہ ابھی بچہ تھا، وہ موت کا مطلب نہیں جانتا تھا، وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ بعض جدائیاں دنیا میں دوبارہ نہیں ملتیں۔ اسلام یہ سکھاتا ہے کہ اللہ ہر دعا سنتا ہے، مگر ہر دعا کا جواب ہماری خواہش کے مطابق نہیں ہوتا۔ کبھی اللہ وہ چیز عطا کر دیتا ہے جو مانگی جائے۔ کبھی کسی بڑے نقصان سے بچانے کے لیے اسے روک لیتا ہے، اور کبھی آخرت کے لیے محفوظ کر دیتا ہے۔ بندے کا کام دعا کرنا ہے، جبکہ قبولیت کی صورت کا فیصلہ اللہ کی حکمت کرتی ہے۔ مگر ایک کم عمر بچے کے لیے یہ حقیقت سمجھنا آسان نہیں تھا۔

وقت گزرتا گیا، اور پھر ایک دن... یلماز کی ننھی سی امید ٹوٹ گئی۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے بابا اور امی جان واپس نہیں آئیں گے... کبھی نہیں۔ اس دن اس کے دل میں ایک خاموش شکوہ پیدا ہوا۔ ایک ایسا شکوہ جسے وہ الفاظ نہیں دے سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ اس نے مسجد جانا کم کر دیا، پھر نماز چھوڑ دی، پھر دعائیں مانگنا بھی... اور ایک دن اس نے اپنے دل میں ایک ضد پال لی۔

"میں اب اللہ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گا۔" وہ ضد شاید غصہ نہیں تھی۔ بلکہ ایک ٹوٹے ہوئے بچے کی خاموش ناراضگی تھی... وقت گزرتا گیا، بچہ جوان ہوتا گیا۔ مگر وہ وعدہ اس کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتا گیا۔ اس نے دولت حاصل کی، شہرت حاصل کی، اقتدار حاصل کیا۔ مگر جب بھی دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی... وہ اسے اپنے اندر ہی دفن کر دیتا۔

کیونکہ اس نے برسوں پہلے خود سے وعدہ کیا تھا، کہ اب وہ کسی سے کچھ نہیں مانگے گا، حتیٰ کہ اللہ سے بھی نہیں۔

یلماز نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔ باہر اذان ختم ہو چکی تھی۔ مسجد کی روشنیاں جل اٹھی تھیں، اور لوگ جماعت کے لیے اندر جا رہے تھے۔ کچھ لمحے وہ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نگاہ انجانے میں آسمان کی جانب اٹھ گئی۔ اور نہ جانے کیوں... اس کے ذہن میں ایک ہی چہرہ ابھرا... غزالی آنکھوں والی ایک لڑکی۔

یلماز چند لمحے خاموش رہا، پھر بے اختیار ہلکا سا مسکرایا۔

شاید برسوں بعد... اس کے دل میں کوئی ایسی خواہش پیدا ہوئی تھی، جسے وہ خود سے بھی چھپا نہیں پا رہا تھا۔



وقت گزرتا گیا۔ کیس کی تحقیقات اپنی رفتار سے جاری تھیں۔

کیف، مراد دمیر اور براق دن رات اسی ایک معاملے میں مصروف تھے۔ انہوں نے ان ساتوں افراد کی مکمل چھان بین کی تھی جن کا تعلق اُن لیبارٹریوں سے تھا جہاں وہ نایاب کیمیکل تیار کیا جاتا تھا۔ ان کے مالی ریکارڈز...

رابطے...

خاندانی پس منظر...

حتیٰ کہ گزشتہ کئی سالوں کی سرگرمیاں بھی جانچی جا چکی تھیں۔ مگر نتیجہ تقریباً صفر نکلا تھا۔ گویا کسی نے انتہائی مہارت سے ہر سراغ مٹا دیا ہو۔ براق اکثر جھنجھلا کر کہتا تھا۔

"مجھے لگتا ہے ہم صرف اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔" مگر مراد دمیر ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے۔

"قاتل جتنا بھی ذہین کیوں نہ ہو، کہیں نہ کہیں غلطی ضرور کرتا ہے۔" اسی امید پر وہ لوگ اب بھی کیس پر پوری جان سے کام کر رہے تھے۔

دوسری طرف... وقت کے ساتھ کیف اور عنادل کے درمیان موجود اجنبیت بھی کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ اب وہ اچھے طریقے سے ایک دوسرے سے بات کر لیا کرتے تھے۔ اگرچہ ان کی گفتگو زیادہ تر کام تک محدود رہتی تھی، مگر اب وہ ایک دوسرے سے نسبتاً آسانی سے بات کر لیتے تھے۔ آج بھی دونوں ایک اہم رپورٹ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ دفتر میں شام کی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ زیادہ تر ملازمین جا چکے تھے۔

صرف چند لوگ اپنے اپنے کام نمٹا رہے تھے۔ کیف اور عنادل ایک ہی میز کے دو اطراف بیٹھے فائلوں پر کام کر رہے تھے۔اچانک کیف کو براق کی ایک حرکت یاد آگئی۔اس نے بے اختیار وہ واقعہ عنادل کو سنا دیا۔

"اور پھر براق نے پورے اعتماد سے مراد سر کو بتایا کہ قاتل دائیں ہاتھ سے کام کرتا ہے۔"کیف سنجیدگی سے بولا۔

"بعد میں پتا چلا سی سی ٹی وی فوٹیج الٹی چل رہی تھی۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد... عنادل بے اختیار ہنس پڑی۔

اس کی ہنسی اتنی اچانک تھی کہ خود کیف بھی چند لمحے خاموش رہ گیا۔عنادل ہنس رہی تھی۔

کھل کر...

دل سے...

بے فکری سے۔

اور کیف... بس اسے دیکھ رہا تھا۔اسے ہمیشہ سے عنادل کی آنکھیں پسند تھیں۔ مگر جب وہ ہنستی تھی تو وہ آنکھیں اور بھی خوبصورت لگنے لگتی تھیں۔ گویا ان میں زندگی بھر جاتی ہو۔

"اوہ خدایا..."عنادل ابھی تک ہنس رہی تھی۔

"یعنی براق سر واقعی ایسا کر سکتے ہیں۔"کیف کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"تمہیں اندازہ نہیں ہے وہ اور کیا کیا کر سکتے ہیں۔"

اس پر عنادل کو یکدم یارا کی ایک بات یاد آگئی۔

"سر، یہ تو کچھ بھی نہیں۔"وہ ابھی تک ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

"ایک بار یارا نے یونیورسٹی میں..."

اور پھر اس نے یارا کا ایک مزاحیہ قصہ سنانا شروع کر دیا۔

قصہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ خود دوبارہ ہنسنے لگی۔

اتنا کہ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔اب وہ اپنے دوپٹے کے کنارے سے آنکھوں کے کونے صاف کر رہی تھی۔ جبکہ کیف خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔اس کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ تھی۔وہ خود نہیں ہنس رہا تھا، مگر عنادل کی ہنسی اسے

اچھا محسوس کر ارہی تھی۔ چند لمحوں بعد عنادل کو احساس ہوا کہ شاید وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے۔اس کی ہنسی آہستہ آہستہ تھم گئی۔

"سوری سر..." وہ ہلکی سی شرمندگی سے بولی۔

"میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔"

"نہیں۔" کیف نے سر ہلایا۔

مگر عنادل پہلے ہی کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

وہ تیزی سے کچھ ٹائپ کرنے لگی۔ دفتر میں دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ پھر اچانک...

"عنادل..." کیف نے اسے پکارا۔

"جی سر،...؟" وہ اسی طرح سکرین پر نظریں جمائے بولی۔

کیف چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر آہستگی سے بولا۔

"مجھ سے باتیں کیا کرو..."

عنادل کی انگلیاں کی بورڈ پر رک گئیں۔

"کیوں؟" یہ سوال اس کے ہونٹوں تک آیا مگر وہ بول نہ سکی۔

کیف نے اپنی بات مکمل کی۔

"مجھے اچھا لگتا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے وقت جیسے رک گیا۔ عنادل نے حیرانی اور الجھن بھرے تاثرات کے ساتھ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

کیف کا چہرہ حسبِ معمول سنجیدہ تھا، گویا اس نے کوئی غیر معمولی بات نہ کہی ہو۔ مگر عنادل کے لیے یہ بات غیر معمولی تھی، بہت غیر معمولی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی... کیف نے فوراً نظریں کمپیوٹر پر مرکوز کر لیں۔

"یہ فائل مجھے فارورڈ کر دیں، عنادل۔" اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

عنادل نے چند لمحے اسے دیکھا، پھر خاموشی سے سر ہلایا۔

"جی سر۔" اور دوبارہ کام میں مصروف ہو گئی۔

کیف اپنی نشست پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جس توجہ سے کام کرتی تھی... جس طرح کبھی بال کان کے پیچھے کرتی...

اور پھر دوبارہ سکرین پر جھک جاتی... یہ سب چیزیں اب اس کی نظر سے اوجھل نہیں رہتی تھیں۔اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم مسکراہٹ ابھری۔

".Bir ömür seninle geçsin isterim"

(میری خواہش ہے کہ پوری زندگی تمہارے ساتھ گزرے۔)

یہ الفاظ صرف اس کے دل میں تھے۔کیونکہ بعض باتیں انسان کہہ نہیں سکتا، صرف محسوس کر سکتا ہے۔



(باب:7)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زلیخہ اور یوسف کے درمیان پہلے والی اجنبیت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔اگرچہ اس دن کے بعد ان دونوں کے درمیان کئی تلخ اور عجیب لمحات آئے تھے، مگر اب ان کی دوستی ایک بار پھر اپنی پرانی راہ پر لوٹ رہی تھی۔یوسف اب اکثر ان کے گھر آنے لگا تھا۔

کبھی ساجدہ بیگم کے کہنے پر چائے پینے آ جاتا، کبھی طہور کی کسی شرارت پر ہنسنے اور کبھی صرف زلیخہ کو چھیڑنے کے لیے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ گھر کے تمام افراد بھی اب اس کی آمد کے عادی ہو چکے تھے۔

اس شام بھی ایسا ہی ہوا۔باہر ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔گھر کے ڈرائنگ روم میں خوشگوار گرمی پھیلی ہوئی تھی۔ساجدہ بیگم صوفے پر بیٹھی اون کا سویٹر بُن رہی تھیں۔

طہور فرش پر بیٹھی اپنے کالج کے نوٹس ترتیب دے رہی تھی۔جبکہ زلیخہ سامنے والے صوفے پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

اچانک دروازے کی گھنٹی بجی، طہور فوراً اچھل کر کھڑی ہوئی۔

"میں کھولتی ہوں!" وہ دوڑتی ہوئی دروازے تک گئی۔

چند لمحوں بعد اس کی خوشی بھری آواز سنائی دی۔

"امی! آپ کا پسندیدہ مہمان آگیا!"

زلیخہ کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی اور اگلے ہی لمحے یوسف اندر داخل ہوا۔

سیاہ کوٹ، گہرے نیلے رنگ کا مفلر اور ہمیشہ کی طرح سنجیدہ مگر دلکش شخصیت۔

"السلام علیکم۔" اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام۔" سب نے جواب دیا۔

"آؤ بیٹا۔" ساجدہ بیگم مسکراتے ہوئے بولیں۔

"آج تو کافی دن بعد آئے ہو۔"

"اصل میں کچھ کام زیادہ تھا۔" یوسف نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"یا پھر زلیخہ سے ناراض تھے؟" طہور فوراً بولی۔

یوسف نے ایک نظر زلیخہ کو دیکھا، زلیخہ نے فوراً کتاب اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لی۔ جس پر طہور زور سے ہنس پڑی۔

"دیکھا؟ ابھی بھی شرما رہی ہے!"

"طہور!" زلیخہ نے جھینپتے ہوئے اسے گھورا۔

کمرے میں ہنسی پھیل گئی۔ کچھ دیر بعد طاہر بھی گھر آگیا۔ اور حسبِ معمول سیدھا ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ یوسف نے رسمی انداز میں سلام کا جواب دیا۔ مگر اس کے بعد اس نے جان بوجھ کر اپنی توجہ دوسری جانب موڑ لی۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ طاہر کے ساتھ اس کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔

مگر وہ ایک چیز اچھی طرح جانتا تھا۔ طاہر کی نظریں، طاہر کی خاموشی، اور زلیخہ کو دیکھنے کا اس کا انداز... وہ سب کچھ کہہ دیتا تھا اور یہی چیز یوسف کو ناگوار گزرتی تھی۔

کیونکہ وہ انہی جذبات سے خود بھی واقف تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ زلیخہ جب یوسف کو دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں وہ چمک نظر آتی تھی جو طاہر کے لیے کبھی موجود نہیں تھی، اور یہی بات یوسف کو خاموش اطمینان دے دیتی تھی۔

"یوسف بھائی!" طہور اچانک بولی۔

"اگر آپ اتنے ذہین ہیں تو میرا یہ سوال حل کریں۔"

"میں نے کب کہا کہ میں ذہین ہوں؟" یوسف نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اچھا؟" طہور نے آنکھیں سکیڑیں۔

"پھر یونیورسٹی والے آپ کو پروفیسر کیوں کہتے ہیں؟"

"غلط فہمی ہے ان کی۔" یوسف نے فوراً کہا۔

اس پر پورا کمرہ ہنس پڑا، حتیٰ کہ ساجدہ بیگم بھی مسکرا دیں۔

زلیخہ نے بے اختیار یوسف کی طرف دیکھا اور اس لمحے یوسف کی نگاہ بھی اس سے جا ملی۔ چند لمحوں کے لیے وقت جیسے رک گیا، پھر دونوں نے فوراً نظریں ہٹا لیں۔

بعد میں جب چائے آئی تو سب لوگ ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ ساجدہ بیگم گھر کے حالات بتا رہی تھیں، طہور مسلسل بول رہی تھی، اور یوسف ہمیشہ کی طرح خاموشی سے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر درمیان درمیان میں اس کی نظریں زلیخہ پر جا ٹھہرتیں۔ جو کبھی چائے کا کپ سنبھالتی، کبھی اپنے بال کان کے پیچھے کرتی، اور کبھی کسی بات پر دھیمی سی مسکرا دیتی، اور ہر بار یوسف کو محسوس ہوتا کہ شاید اس گھر کی سب سے خوبصورت چیز یہی مسکراہٹ ہے۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ مگر اس گھر میں بیٹھا ایک شخص... اپنی تمام تر سنجیدگی کے باوجود، صرف ایک ہی چہرہ دیکھنے آیا کرتا تھا... اور وہ چہرہ اس کے عین سامنے موجود تھا۔

دسمبر کے آخری دنوں میں ارزروم گویا برف کی سفید چادر اوڑھے سویا ہوا تھا۔ آسمان سے گرتے نرم نرم برف کے گالے فضا میں رقص کرتے ہوئے زمین پر اترتے، جبکہ سڑکوں کے کنارے لگے زرد روشنی والے لیمپ سرد شام کو ایک عجیب سی دلکشی بخش رہے تھے۔ ہوا میں ایسی خنکی تھی جو ہڈیوں تک اتر جاتی، مگر اس کے باوجود شہر کی رونق میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ آج زلیخہ کے پہلے سمسٹر کا آخری دن تھا، وہ بے حد خوش تھی۔

اس وقت وہ اور یوسف شہر کے ایک خوبصورت کیفے میں کھڑکی کے قریب موجود میز پر بیٹھے تھے۔ شیشے کے پار گرتی برف ایک حسین منظر پیش کر رہی تھی جبکہ اندر ہلکی موسیقی اور تازہ کافی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

زلیخہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔

"اور پھر جولی نے جب اپنا پیپر جمع کروایا تو اسے یاد آیا کہ اس نے آخری سوال حل ہی نہیں کیا تھا!" وہ خود ہی اپنی بات پر ہنس پڑی۔

سامنے بیٹھا یوسف خاموشی سے اپنی کافی کا گھونٹ لیتا رہا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ زلیخہ کی باتیں سن رہا تھا، بلکہ یوں کہنا زیادہ درست تھا کہ وہ زلیخہ کو سننے سے زیادہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولتی تھی تو اس کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔

"اور پتا ہے؟" زلیخہ پھر بولی۔

"میں نے پورے سمسٹر میں ایک بھی اسائنمنٹ لیٹ جمع نہیں کروائی۔"

"واقعی؟" یوسف نے جان بوجھ کر حیرت ظاہر کی۔

"جی ہاں!" وہ فخر سے بولی۔

"یہ تو معجزہ ہے۔"

"میں اتنی بھی غیر ذمہ دار نہیں ہوں۔" زلیخہ نے ناراضی سے اسے گھورا۔

"ہمم..." یوسف نے سر ہلایا۔

"اس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔"

"یوسف!"... وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

کچھ دیر بعد زلیخہ اپنی ہی باتوں میں مصروف تھی کہ اچانک اسے احساس ہوا۔ یوسف آج غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔

اور اصل میں ملاقات کی خواہش بھی اسی نے ظاہر کی تھی۔

زلیخہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے کافی کا کپ اٹھایا اور ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا، پھر مشکوک نظروں سے یوسف کو دیکھا۔

"ایک منٹ..."

"کیا ہوا؟" یوسف نے بھنویں اٹھائیں۔

"تم مجھے کوئی بات بتانا چاہتے تھے نا؟"

"ہمم۔"

"اور میں یہاں آ کر مسلسل اپنی ہی کہانیاں سنائے جا رہی ہوں۔"

یوسف کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے۔"

"اچھا اب بتاو۔" زلیخہ سنجیدہ ہو گئی۔

"کیا بات تھی؟"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ کھڑکی کے پار برف اب بھی گر رہی تھی۔ یوسف نے کافی کا کپ آہستہ سے میز پر رکھا۔ پھر اس کی نظریں زلیخہ کے چہرے پر جم گئیں۔

"میں یونیورسٹی چھوڑ رہا ہوں۔"

"کیا؟" زلیخہ کا ہاتھ کپ پر ہی رک گیا۔ اس کی پلکیں حیرت سے جھپکیں۔

"میں اپنی جاب چھوڑ رہا ہوں۔"

"کیوں؟" اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

"اچانک کیوں...؟"

یوسف نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

"کیونکہ مجھے کہیں جانا ہے۔"

"کہاں؟"

"ابھی نہیں بتا سکتا۔"

زلیخہ کی خوشی جیسے یکدم ماند پڑ گئی۔

"کتنے دن کے لیے؟"

یوسف خاموش رہا، اور یہی خاموشی زلیخہ کو بے چین کرنے لگی۔

"یوسف..." اس نے دھیمی آواز میں پکارا۔

تب یوسف دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں اس لمحے عجیب سی گہرائی تھی۔

"جانے سے پہلے میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، زلیخہ۔"

زلیخہ کا دل انجانے خوف سے دھڑک اٹھا۔ کیفے کی گرم فضا کے باوجود اس کے ہاتھ ٹھنڈے پڑنے لگے تھے۔ وہ خاموشی سے یوسف کو دیکھتی رہی۔

اور یوسف... وہ پہلی بار یوں محسوس کر رہا تھا جیسے برسوں سے اپنے سینے میں قید کوئی بات اب لفظ بننے والی ہو۔

"کون سی بات؟"

یوسف کی نظریں اس کی آنکھوں میں ٹھہر گئیں۔

"میں بہت عرصے سے کہنا چاہتا تھا۔"

زلیخہ کا سانس رکنے لگا۔

"اور شاید اگر آج نہ کہوں تو پھر کبھی موقع نہ ملے۔"

اس کی دھڑکن اب اسے اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔

یوسف نے گہرا سانس لیا، پھر دھیرے سے بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ جب میں واپس آؤں..." وہ لمحہ بھر رکا۔

"تو تم میری منتظر ہو۔"

زلیخہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اور میری خواہش ہے کہ جب میں واپس آؤں، تب تک ہماری شادی طے ہو چکی ہو۔"

زلیخہ کو لگا شاید اس نے غلط سنا ہے۔

اس کا دل بے قابو ہو کر دھڑکنے لگا۔

خوشی...

حیرت...

یقین نہ آنے والی کیفیت...

سب ایک ساتھ اس پر حملہ آور ہوئے تھے۔

وہ بس خاموش اسے دیکھتی رہ گئی۔ یوسف کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ پھر اس نے وہ سوال کہہ دیا جو مدتوں سے اس کے دل میں تھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

زلیخہ کی آنکھوں میں فوراً نمی اتر آئی۔ وہ خوشی کے شدید احساس سے لرز گئی۔ لب کانپنے لگے۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔

اس نے نظریں جھکا لیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پورا وجود روشنی سے بھر گیا ہو۔ یوسف خاموشی سے اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد زلیخہ نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی، اور ہونٹوں پر لرزتی ہوئی مسکراہٹ۔

"جی..." وہ بمشکل بول پائی، پھر شرم سے نظریں جھکا لیں۔

"مجھے منظور ہے۔"

یوسف کی آنکھوں میں ایسی خوشی ابھری جو شاید برسوں بعد آئی تھی۔

اس نے سر جھکا کر ایک گہرا سانس لیا، جیسے دل پر رکھا کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ کیفے کے باہر برف اب بھی گر رہی تھی۔ مگر ان دونوں کی دنیا میں اس وقت صرف ایک ہی موسم تھا... خوشی کا موسم۔

بعد میں یوسف اسے اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے آیا۔ پورے راستے زلیخہ کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ موجود رہی۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو خواب اس نے دل میں چھپا رکھا تھا، وہ حقیقت بن چکا تھا۔ گھر پہنچ کر وہ بمشکل یوسف کو خدا حافظ کہہ سکی۔ پھر تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی، دروازہ بند کیا اور فوراً اربش کا نمبر ملایا۔

اس کے چہرے پر ایسی خوشی تھی جیسے اسے پوری دنیا مل گئی ہو۔ آج اسے اپنی سب سے اچھی دوست کو ایک ایسی خبر سنانی تھی جو اس کی زندگی بدل چکی تھی۔



کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر دسمبر کی سرد رات اپنے پورے جوبن پر تھی، جبکہ اندر یوسف اور یسریٰ اگلے مشن کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔ میز پر استنبول کے نقشے، چند فائلیں اور کچھ خفیہ دستاویزات بکھری ہوئی تھیں۔ یسریٰ ان کاغذات کو ترتیب دے رہی تھی جبکہ یوسف کھڑکی کے قریب کھڑا دور پھیلے اندھیرے کو دیکھ رہا تھا۔

"کل رات ہم استنبول کے لیے نکل جائیں گے۔" یوسف نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

یسریٰ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہ ہمارا آخری مرحلہ ہے؟"

"ہاں۔" یوسف کی آواز معمول سے زیادہ سنجیدہ تھی۔

"اگر سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوا تو برسوں کی محنت مکمل ہو جائے گی۔"

کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ پھر یوسف نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک سفید لفافہ نکالا اور یسریٰ کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ رکھ لو۔" یسریٰ نے حیرت سے لفافہ تھاما۔

"یہ کیا ہے؟"

"ایک خط۔"

"خط؟"

"اگر کسی بھی وجہ سے میں واپس نہ آ سکا... تو یہ زلیخہ کو دے دینا۔"

یسریٰ کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔

"یوسف..."

"بس رکھ لو۔" اس کی آواز میں ایسی قطعیت تھی کہ یسریٰ مزید بحث نہ کر سکی۔ اس نے لفافے کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"تم واقعی سمجھتے ہو کہ بات یہاں تک پہنچ سکتی ہے؟"

یوسف ہلکا سا مسکرایا۔

"ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہم کس راستے پر چل رہے ہیں۔ اس راستے میں واپسی کی ضمانت کوئی نہیں دیتا۔"

یسریٰ نے نظریں جھکا لیں۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے ہم سب نے اپنی زندگیاں خود مشکل بنالی ہیں۔"

یوسف نے اس کی بات سنی، پھر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"نہیں یسریٰ..." وہ چند لمحے خاموش رہا۔

"ہم سب اپنے اپنے حالات کے اسیرانِ قفس ہیں۔"

یسریٰ نے بھنویں سکیڑ لیں۔

"میں سمجھی نہیں۔"

یوسف نے میز پر رکھی فائل بند کر دی۔

"قفس صرف لوہے کی سلاخوں کا نام نہیں ہوتا۔" وہ آہستہ آہستہ بولا۔

"کسی کا قفس غربت ہوتی ہے، کسی کا خوف۔ کسی کا ماضی، کسی کی ذمہ داریاں۔ کوئی انتقام کے قفس میں قید ہوتا ہے، کوئی محبت کے۔" یسریٰ خاموشی سے سن رہی تھی۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں، لیکن حقیقت میں ہر انسان کسی نہ کسی زنجیر سے بندھا ہوتا ہے۔" اس کی نیلی آنکھوں میں ایک عجیب سی گہرائی اتر آئی۔

"میں بھی قید ہوں۔"

"کس چیز میں؟" یسریٰ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

یوسف ہلکا سا مسکرایا۔

"اپنے ماضی میں... اپنے وعدوں میں... اور شاید اپنی محبت میں بھی۔"

یسریٰ کا دل ایک بار پھر درد سے بھر گیا۔ کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ باہر برفانی ہوا کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا رہی تھی۔

یسریٰ نے لفافے کو اپنی گرفت میں مضبوط کیا۔

"میں دعا کرتی ہوں کہ مجھے یہ خط کبھی اسے نہ دینا پڑے۔"

یوسف نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

مگر اس کی آنکھوں میں اب بھی وہی پراسرار سنجیدگی موجود تھی، جیسے وہ آنے والے وقت کے بارے میں کچھ ایسا جانتا ہو جس سے باقی سب بے خبر تھے۔



ارزروم کی یخ بستہ رات اپنے عروج پر تھی۔ آسمان سے نرم نرم برف کے گالے مسلسل گر رہے تھے، سڑکوں، درختوں اور گھروں کی چھتوں پر سفید چادر بچھ چکی تھی۔ رات کی خاموشی میں صرف سرد ہوا کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ یوسف ساجدہ بیگم کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔

سیاہ اوور کوٹ میں ملبوس، دونوں کندھوں پر برف کی باریک تہہ جم چکی تھی۔ ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا جبکہ دوسرا موبائل تھامے ہوئے تھا۔

اس کی نظریں مسلسل اوپر زلیخہ کے کمرے کی کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں جہاں مدھم زرد روشنی جل رہی تھی۔ اس نے موبائل نکالا اور نمبر ملا دیا۔ چند سیکنڈ بعد کال ریسیو ہوئی۔

"السلام علیکم۔" دوسری جانب زلیخہ کی نرم آواز ابھری۔

یوسف کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

"وعلیکم السلام۔"

"اس وقت؟" زلیخہ ہلکی سی حیران ہوئی۔ "تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

"اور تم؟"

"میں بھی جاگ رہی ہوں۔"

"پتا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" زلیخہ ہنس پڑی۔

"بس پتا ہے۔"

"تمہیں میرے بارے میں سب کیسے پتا ہوتا ہے؟" وہ حیرانی اور تجسس سے بولی۔

یوسف کچھ لمحے خاموش رہا، پھر آہستہ سے بولا۔

"کھڑکی کے پاس جاؤ۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں جانے سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

زلیخہ کے ماتھے پر شکن ابھری۔

"دیکھنا چاہتے ہو؟" پھر اچانک جیسے اسے کچھ محسوس ہوا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

"یوسف..."

"کھڑکی تک جاؤ۔" اس بار اس کی آواز میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

زلیخہ تقریباً دوڑتی ہوئی کھڑکی کی طرف گئی۔ اس نے پردہ ہٹایا اور شیشہ کھول کر باہر جھانکا، اور اگلے ہی لمحے اس کی سانس رک گئی۔ برف باری کے درمیان یوسف نیچے کھڑا تھا، موبائل کان سے لگائے، ایک ہاتھ جیب میں، سیاہ کوٹ پر جمی برف، اور آنکھوں میں وہی سکون جو صرف اسے دیکھ کر آتا تھا۔

"تم پاگل ہو!" زلیخہ بے اختیار بولی۔

"اتنی سردی میں باہر کیوں کھڑے ہو؟"

یوسف نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر مسکرایا۔ وہی مسکراہٹ جسے زلیخہ دنیا کی سب سے خوبصورت چیز سمجھتی تھی۔

"کیونکہ میں جانے سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

زلیخہ کے دل میں جیسے کسی نے چراغ روشن کر دیے ہوں۔

وہ کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ برف کے چند نرم گالے اندر آ کر اس کے بالوں پر گرے۔ یوسف کافی دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ جیسے اس کے چہرے کو اپنی یادوں میں محفوظ کر رہا ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

".Seni çok seviyorum"

(میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔)

زلیخہ کے رخسار سرخ ہو گئے۔ اس کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ آگئی۔

"مجھے معلوم ہے۔"

یوسف ہلکا سا مسکرایا۔ کچھ لمحے دونوں صرف ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر زلیخہ نے خاموشی توڑی۔

"تم کب واپس آؤ گے؟"

"بہت جلد۔"

"کتنی جلد؟"

"اتنی جلد کہ تم شکایت بھی نہیں کر سکو گی۔"

زلیخہ نے ہونٹ سکیڑے۔

"میں پھر بھی شکایت کروں گی۔"

"مجھے پتا ہے۔" یوسف نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، پھر اس کی آواز سنجیدہ ہو گئی۔

"میرا انتظار کرو گی؟"

زلیخہ کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔ اس نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے جواب دیا۔

"زلیخہ تمہارا مرتے دم تک انتظار کر سکتی ہے۔"

یوسف خاموش ہو گیا۔ اس کے دل میں جیسے کسی نے سکون بھر دیا ہو۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے سر ہلایا۔

"پھر مجھے کوئی فکر نہیں۔"

زلیخہ کی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ جانتی نہیں تھی کہ کیوں، مگر آج کی رات عجیب لگ رہی تھی۔ جیسے وقت ان دونوں کے درمیان ٹھہر سا گیا ہو۔ آخر کار یوسف نے موبائل کان سے ہٹایا۔ پھر مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ بلند کیا۔

"خدا حافظ، زلیخہ۔"

زلیخہ نے بھی ہاتھ ہلایا۔

"خدا حافظ۔"

یوسف مڑا اور آہستہ آہستہ برف سے ڈھکی سڑک پر چلنے لگا۔ زلیخہ کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

دور...

اور مزید دور...

یہاں تک کہ اس کا سایہ برف باری میں دھندلا گیا۔ مگر زلیخہ پھر بھی کھڑکی کے پاس کھڑی رہی۔ جیسے اسے یقین ہو کہ اگر وہ ایک لمحے کے لیے بھی نظریں ہٹائے گی تو یہ رات، یہ منظر، اور یہ شخص کسی خواب کی طرح بکھر جائے گا۔



ارزروم اور استنبول سے بہت دور، بحیرۂ اسود کے کنارے آباد طرابزون اپنی فطری خوبصورتی کے ساتھ ایک اور دن کو رخصت کر رہا تھا۔ شام آہستہ آہستہ پہاڑوں کے عقب میں اتر رہی تھی۔ دور افق پر بکھرے نارنجی اور سنہری رنگ سمندر کی لہروں پر جھلملا رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا دیودار کے بلند درختوں سے ٹکراتی ہوئی ایک مدھم سرگوشی پیدا کر رہی تھی۔ پہاڑی ڈھلوان پر بنی وہ چھوٹی سی کاٹیج حسبِ معمول خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچی لکڑی سے بنی بالکونی میں اماں فرشتے اپنی مخصوص جھولتی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تسبیح تھی جبکہ نگاہیں دور پھیلے پہاڑوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے شوہر قریب ہی لکڑی کی ایک پرانی کرسی پر بیٹھے جلتی ہوئی انگیٹھی کو درست کر رہے تھے۔ چند لمحوں تک صرف ہوا کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر اماں فرشتے کی نظریں دور افق پر کہیں جم گئیں، جیسے وہ وقت کی دھند میں چھپی کسی حقیقت کو دیکھ رہی ہوں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" ان کے شوہر نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا۔

اماں فرشتے کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔ انہوں نے اپنی تسبیح کے چند دانے آگے سرکائے۔

"زندگی کے بارے میں۔" وہ آہستہ سے بولیں۔

ان کے شوہر خاموشی سے انہیں دیکھنے لگے۔اماں فرشتے نے نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں جہاں پرندوں کا ایک غول اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہا تھا۔ان کی دھیمی مگر پُر اثر آواز فضا میں گونجی۔

"وقت کی گردِش کبھی رکتی نہیں، جو کچھ ہم دنیا میں چھوڑ آتے ہیں، وہی کسی نہ کسی موڑ پر پلٹ کر ہماری دہلیز تک آ پہنچتا ہے۔"

ان کے شوہر کی پیشانی پر ہلکی سی شکن ابھری۔

"تم پھر قسمت کی باتیں کر رہی ہو؟"

اماں فرشتے مسکرائیں۔

"قسمت کی نہیں... حقیقت کی۔" وہ بولیں۔

"انسان سمجھتا ہے کہ وہ ماضی سے بھاگ آیا ہے، کہ کچھ راستے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے ہیں، کچھ لوگ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہیں۔" وہ چند لمحے خاموش ہوئیں۔

"مگر وقت عجیب شے ہے۔"

ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ان کے سفید بالوں کی چند لٹیں چہرے کے گرد بکھر گئیں۔

"وہ ہمیں گھما پھرا کر پھر اسی مقام پر لے آتا ہے جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا۔"

ان کے شوہر اب پوری توجہ سے انہیں سن رہے تھے۔اماں فرشتے کی آنکھوں میں ایک پراسرار سی چمک ابھری۔

"بعض ملاقاتیں برسوں بعد مکمل ہوتی ہیں۔" انہوں نے دھیرے سے کہا۔

"اور بعض کہانیاں وقت کے ختم ہونے تک ادھوری نہیں رہتیں۔"

ان کے شوہر نے ایک لمحے کے لیے انہیں غور سے دیکھا۔

"تم یلماز کی بات کر رہی ہو؟"

اس بار اماں فرشتے خاموش ہو گئیں۔ان کے لبوں پر بس ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

دور سمندر کی لہریں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ پہاڑوں پر شام مزید گہری ہو رہی تھی، اور اماں فرشتے کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کا وہ پہیہ، جو برسوں پہلے گھومنا شروع ہوا تھا، اب دوبارہ اپنی منزل کے قریب پہنچ رہا ہو۔ شاید واقعی... بعض لوگ قسمت سے نہیں ملتے بلکہ وقت انہیں ایک دوسرے تک واپس لے کر آتا ہے۔



عنادل اپنے اپارٹمنٹ کی چھوٹی سی بالکونی میں بیٹھی تھی۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ استنبول کی روشنیاں دور تک ستاروں کی طرح بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھیں جبکہ آسمان پر بادلوں کی ہلکی تہہ موجود تھی۔ سرد ہوا کے جھونکے وقتاً فوقتاً اس کے چہرے سے ٹکراتے اور اس کے دوپٹے کا کنارا لہرا دیتے۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔

مگر چائے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ گم سم سی سامنے پھیلے شہر کو دیکھ رہی تھی۔ بعض اوقات انسان کی زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں جب وہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک ساتھ سوچنے لگتا ہے، اور شاید آج عنادل بھی انہی لمحوں میں سے ایک سے گزر رہی تھی۔ اس کی نگاہ بے اختیار اپنے پاؤں پر گئی۔

وہی پاؤں... جس کی چوٹ نے اسے کچھ دن بستر تک محدود رکھا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس حادثے کے بعد وہ کتنی بے بس محسوس کرتی تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ اسی حادثے نے اسے کچھ ایسے لوگوں سے بھی ملوایا جن کے بارے میں اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔

وہ ہلکا سا مسکرائی۔ پھر اس کی مسکراہٹ دھیرے دھیرے ماند پڑ گئی۔ اسے ہارون یاد آ گیا۔ ایک وقت تھا جب اسے لگتا تھا کہ ہارون کے بغیر اس کی دنیا ادھوری ہے، پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہی شخص اس کی زندگی سے نکل گیا، اور عنادل کو لگا تھا کہ شاید اب وہ کبھی پہلے جیسی نہیں ہو سکے گی۔

اس نے آہستہ سے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر کپ کو میز پر رکھ دیا۔

"عجیب بات ہے..." وہ خود کلامی کرتے ہوئے بولی۔

"انسان جن چیزوں کو اپنی سب سے بڑی خوشی سمجھتا ہے، کبھی کبھی وہی چیزیں اس کے لیے آزمائش بن جاتی ہیں۔"

اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

"اور جن چیزوں کے چھن جانے پر وہ ٹوٹ جاتا ہے..."

وہ چند لمحے خاموش ہوئی، پھر اس کے لبوں سے ایک دھیمی مگر پختہ آواز نکلی۔

"اللہ نعمت دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سا سکون اترنے لگا۔

"جب نعمت ملتی ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ بندہ شکر کرتا ہے یا نہیں..." وہ آہستہ سے بولی۔

"اور جب نعمت چھن جاتی ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ بندہ صبر کرتا ہے یا نہیں۔"

ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا آیا۔ عنادل نے اپنا دوپٹہ درست کیا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ شاید زندگی کے کچھ زخم بھرنے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ انسان کو مضبوط بنانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اور شاید... اللہ کبھی کسی چیز کا بدل فوراً نہیں دیتا۔ لیکن جب دیتا ہے تو انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اس کے رب نے اس کے لیے پہلے سے بہتر چیز محفوظ کر رکھی تھی۔ عنادل کے لبوں پر ایک پُر سکون مسکراہٹ آگئی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

ان تمام نعمتوں پر بھی...

اور ان تمام محرومیوں پر بھی...

جنہوں نے اسے آج کی عنادل بنایا تھا۔



استنبول کی بلند عمارتوں کے درمیان واقع کیف منصور کا اپارٹمنٹ مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر شیشے کی دیواروں سے شہر کی روشنیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ دور کہیں گاڑیوں کی مدھم آوازیں سنائی دیتی تھیں، مگر

اپارٹمنٹ کے اندر ایک عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ کیف اپنے ڈرائنگ روم کی وسیع شیشے والی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں تھا جبکہ دوسرا ہاتھ اس نے سینے پر باندھ رکھا تھا۔ اس کی نظریں شہر پر جمی ہوئی تھیں، مگر حقیقت میں وہ کچھ دیکھ نہیں رہا تھا۔ انسان بعض اوقات اتنے لوگوں کے درمیان بھی تنہا ہوتا ہے کہ اپنی تنہائی کی آواز سن سکتا ہے اور اس وقت کیف بھی شاید اسی تنہائی سے گزر رہا تھا۔ اسے اچانک چند روز پہلے کی بات یاد آئی۔

وہ اپنے والد کو فون کر رہا تھا۔

پہلی بار...

دوسری بار...

تیسری بار...

مگر جواب ہمیشہ ایک ہی تھا... کوئی جواب نہیں۔

اس نے دھیرے سے آنکھیں بند کر لیں۔ دل کے کسی کونے میں ایک پرانا زخم پھر سے جاگ اٹھا تھا۔ وہ زخم جسے وہ برسوں سے نظر انداز کرتا آرہا تھا۔

کیف کو یاد نہیں تھا کہ آخری بار اس کے والد نے اس سے محبت سے بات کب کی تھی؟ کب اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا؟

کب اسے بیٹا کہہ کر پکارا تھا؟ وہ دھیرے سے صوفے کی طرف آیا اور بیٹھ گیا۔ پھر سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

آنکھیں بند کرتے ہی یادیں ایک ایک کر کے ابھرنے لگیں۔

ایک چھوٹا سا لڑکا... جو اسکول سے بہترین نمبر لا کر گھر آیا تھا۔ صرف اس امید میں کہ شاید آج پاپا خوش ہوں گے۔ شاید آج وہ اس کی تعریف کریں گے۔ مگر اس دن بھی اسے صرف خاموشی ملی تھی۔

پھر ایک اور منظر... وہ یونیورسٹی سے گریجویٹ ہوا تھا۔ سب لوگ اسے مبارک باد دے رہے تھے۔ مگر وہ ایک ہی شخص کو ڈھونڈ رہا تھا... اپنے باپ کو... اور وہ شخص آیا ہی نہیں تھا۔

کیف نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی جبڑوں کی رگیں تن گئی تھیں۔

"آخر کیوں...؟" وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

یہ سوال اس نے شاید سینکڑوں بار خود سے پوچھا تھا۔ مگر جواب آج تک نہیں ملا تھا۔ کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔

کیف نے گہرا سانس لیا۔ وہ ہمیشہ مضبوط نظر آتا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر کہتے تھے کہ وہ کسی چیز سے نہیں ٹوٹتا۔

مگر لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ بعض زخم جسم پر نہیں ہوتے، دل پر ہوتے ہیں اور دل کے زخم اکثر سب سے گہرے ہوتے ہیں۔

کیف صوفے سے اٹھا۔ چند قدم چل کر کھڑکی کے قریب آ کھڑا ہوا۔ نیچے سڑک پر گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ہر کسی کے پاس شاید اپنا کوئی نہ کوئی تھا۔ کوئی گھر جا رہا تھا، کوئی اپنے خاندان کے پاس، کوئی اپنے والدین کے پاس، اور وہ... وہ برسوں سے اپنے ہی باپ کی محبت کے انتظار میں کھڑا تھا۔

اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آئی۔

"عجیب بات ہے..." وہ دھیمی آواز میں خود سے بولا۔

"انسان پوری دنیا سے لڑ سکتا ہے..." اس کی نظریں کہیں دور کھو گئیں۔

"مگر اپنے باپ کی خاموشی سے نہیں لڑ سکتا۔"

اس کے دل میں ایک عجیب سا درد ابھرا۔ وہ درد جو وقت کے ساتھ کم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ہر گزرتے سال کے ساتھ کہیں زیادہ گہرا ہوتا گیا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا اور پہلی بار اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔

کاش... والدین کبھی یہ جان پاتے کہ ان کی بے رخی اولاد کو کس قدر توڑ دیتی ہے۔ کاش وہ جان پاتے کہ کبھی کبھی ایک سخت لفظ سے زیادہ تکلیف خاموشی دیتی ہے۔ کاش وہ سمجھ پاتے کہ اولاد صرف روٹی، کپڑا اور تعلیم نہیں مانگتی۔ وہ محبت بھی مانگتی ہے، توجہ بھی مانگتی ہے، اپنائیت بھی مانگتی ہے۔ کیف کی آنکھوں میں نمی سی ابھری مگر اس نے فوراً نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنے جذبات کو خود میں دفن کر دینا جانتا تھا۔ مگر آج اس کے دل نے ایک حقیقت تسلیم کی تھی۔ کبھی کبھی ماں باپ اولاد کو نظرانداز کر کے اتنی تکلیف دے جاتے ہیں، جس کا انہیں خود بھی اندازہ نہیں ہوتا۔

اور بعض بچے... بڑے ہو جانے کے بعد بھی اپنے والدین کی محبت کے منتظر رہتے ہیں۔ جیسے برسوں سے بند ایک دروازے کے کھلنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ مگر وہ دروازہ... ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا۔



"قفس ٹوٹ بھی جائے تو ضروری نہیں کہ پرندہ اڑ سکے،
کبھی کبھی آزادی سے پہلے زخموں کا بھرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔"

ختم شُد